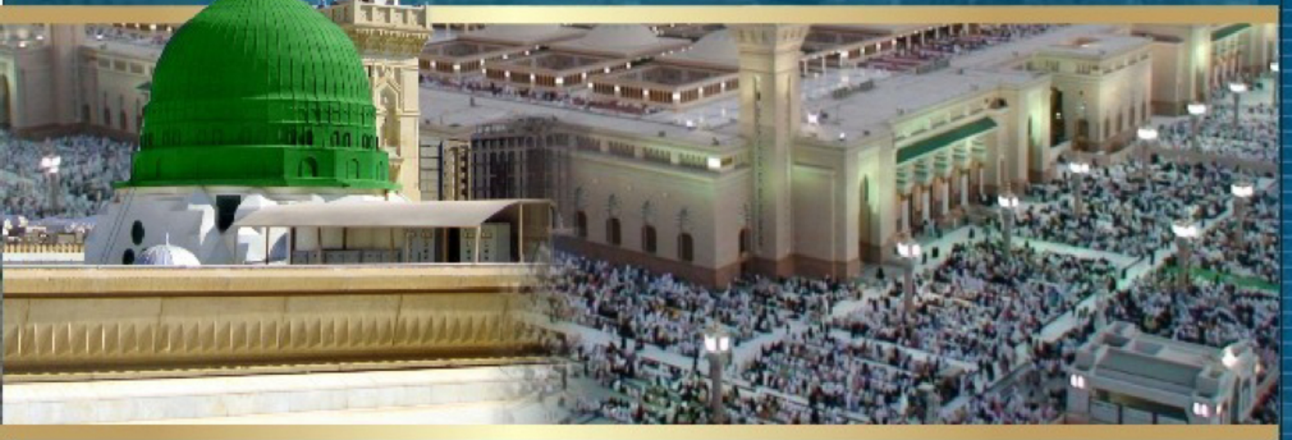
اشاعت نمبر:۱۵۱

خطبات جمعہ



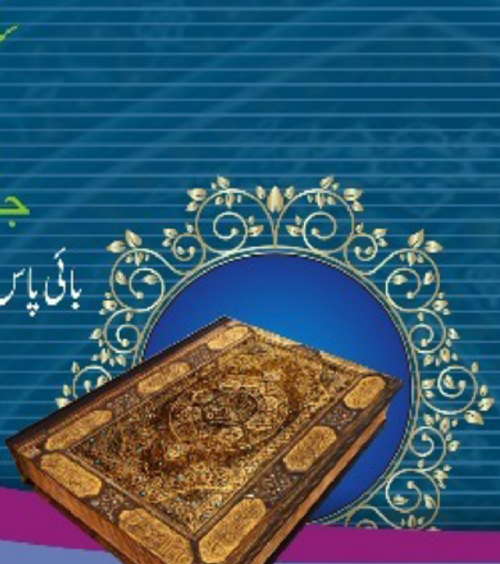
ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

سابق صدر شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ناشر

جامعہ علوم القرآن، جمبوسر

بائی پاس روڈ، مقام: جمبوسر، ضلع: بھروچ (گجرات، الہند)



اشاعت نمبر: ۱۵۱

خطبات جمعہ

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
سابق صدر شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ناشر
جامعہ علوم القرآن، جمبوسر
بائی پاس روڈ، مقام: جمبوسر، ضلع: بھروچ (گجرات، الہند)

تفصیلات

کتاب کا نام	:	خطباتِ جمعہ
صاحب وعظ	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
		(سابق صدر شعبہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا)
ضخامت	:	۳۷۶ صفحات
پہلا ایڈیشن	:	۲۰۰۶ء
دوسرا ایڈیشن	:	۲۰۰۹ء
تیسرا ایڈیشن	:	۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰۱۸ء
ناشر	:	جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، بھروچ (گجرات، الہند)

ملنے کے پتے:

Jamiah Uloomul Quran, by pass road
Jambusar (Dist. Bharuch) 392 150
Web: www.jamiahjambusar.in
E-mail: jamiahjambusar@gmail.com, juqjambusar@gmail.com
Tel. (02644) 220786 / 220286 Fax. 222677

Dr. M. Saud Alam Qasmi

Ex. Dean, Faculty of Theology
Aligarh Muslim University, Aligarh
alamsaud@yahoo.com

ناشر نامہ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم وبعد

حضرت نبی اکرم ﷺ کی من جملہ بعثتی ذمہ داریوں کے ایک اہم ذمہ داری احکام شریعت کی تبلیغ اور معاشرہ کی بگڑی ہوئی صورت حال کی اصلاح ودرستگی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یَاأَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاأُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ'' اورخود حضور پرنور ﷺ کا ارشاد عالی ہے: ''بُعِثْتُ مُعَلِّماً'' تو کہیں گویا ہیں: ''بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخْلَاقِ''

چنانچہ آپ ﷺ کی پوری زندگی تبلیغِ احکامِ شریعت اور اصلاح معاشرہ سے عبارت ہے۔ حضور ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد یہ اہم ذمہ داری وارثین انبیاء حضرات علماء کرام کے سر عائد ہوئی جس کی طرف خود ارشاد نبوی میں واضح حکم ہے: ''بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ آیَة''. چنانچہ صدر اول سے دور حاضر تک کے علماء کرام اس ذمہ داری کو مختلف طریقوں سے ادا کرتے چلے آئے ہیں، جن کی ایک مفید ترین صورت وعظ وتقریر ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ وعظ وتقریر جب مختصر اور اہم نکات پر مشتمل ہوتی ہے تو اس کے فوائد ونتائج دیرپا اور دوررَس ثابت ہوتے ہیں، ادھر دین اور احکام دین کے بے پناہ غفلت وبے اعتنائی کے اس گیے گذرے دور میں بھی جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لیے تقریباً ہر مسلمان ضرور حاضر ہوتا ہے اور اکثریت نماز سے آدھ گھنٹہ قبل مسجد میں حاضری کی کوشش کرتی ہے۔ اس لیے اس عہد میں ہندوستان بھر میں امت کا تقریباً یہ معمول بن گیا ہے کہ نماز جمعہ سے قبل کوئی نہ کوئی عالم دین معاشرہ کے بگاڑ کی اصلاح یا عقائد وایمانیات اور اخلاقیات کے کسی نہ کسی موضوع پر مختصر وجامع خطاب پیش کرتا ہے جس سے امت کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا ان ہی امور مہمہ کے پیش نظر مسلم پرسنل لا بورڈ کے موٴقر صدر حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہم اور اسکے مقتدر وباا ثر ذمہ داران نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق

صدر شعبۂ دینیات ایسے حضرت مولانا سعود عالم صاحب قاسمی مدظلہم سے درخواست کی کہ وہ قمری مہینوں کے اعتبار سے مختلف دینی واصلاحی مواد پر مشتمل مقالات وخطابات مرتب فرمائے تاکہ واعظین ومقررین اور ائمہ جمعہ اپنے خطابات وتقاریر میں استفادہ کر سکیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ حضرت مولانا مدظلہم نے اس اہم امر کی طرف اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس بابت کامل توجہ فرمائی اور کتاب وسنت سے اخذ کردہ عمدہ ترین مواد پر مشتمل مختلف موضوعات ومضامین سے متعلق ۵۹ مقالات مرتب فرمائے، جن کا مجموعہ اس سے قبل دو مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر امت کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے اور اس کے اچھے اثرات بھی ظاہر ہو چکے۔

راقم الحروف بحمد للہ "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کا رکن تاسیسی بھی ہے اور حضرت مولانا بھی بورڈ کے رکن تاسیسی ہے، نیز حضرت مولانا سعود عالم صاحب سے قدیم شناسائی بھی ہے، حضرت مولانا کی نوازش کہ میری ادنیٰ دعوتوں پر آپ متعدد بار ہمارے مدرسہ جامعہ علوم القرآن ،جمبوسر میں تشریف لا چکے ہیں، میری خواہش تھی کہ موصوف کا یہ مجموعہ "خطبات جمعہ" اپنے جامعہ کے شعبۂ نشر واشاعت سے طبع کروا کر ایک بار پھر امت اسلامیہ ہندیہ تک پہنچاؤں، چنانچہ میں نے مولانا موصوف سے اس کا ذکر کیا۔ جس پر انہوں نے نہ صرف چھاپنے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ بہت خوشی کا اظہار فرمایا، فجزاکم اللہ خیرا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعۂ خطبات جمعہ کو مفید ترین بنائے، اس کی برکت سے اصلاح معاشرہ کی ذمہ داری ادا ہو اور صاحب خطبات اس کے ناشرین وجملہ معاونین کے لیے ذخیرہ آخرت بنے۔ ایں دعاء ازمن واز جملہ جہاں آمین باد۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مفتی احمد دیولوی

بانی ومہتمم: جامعہ علوم القرآن، جمبوسر

دیباچہ طبع سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات جمعہ کا تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن پیش نظر ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے حکم کی تعمیل میں یہ خطبات مرتب کیے گئے تھے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا اور مساجد کے ائمہ اور خطباء میں تقسیم کیا گیا۔ علماء اور ائمہ نے کتاب کی پذیرائی کی اور اسے وقت کی ضرورت قرار دیا۔ ملک کے طول وعرض سے کتاب ارسال کرنے کا تقاضہ ہونے لگا۔ کتاب کی افادیت اور تقاضوں کی کثرت کو دیکھ کر زکوٰۃ فاؤنڈیشن، نئی دہلی کے فاضل صدر ڈاکٹر ظفر محمود نے اس کا دوسرا ایڈیشن گاڈس گریس فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع کیا اور بڑے پیمانے پر تقسیم کیا۔

ائمہ کرام نے بعض مشورے بھی ارسال کیے، ان کی روشنی میں کتاب پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ چند ضروری خطبات کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں عربی خطبہ جمعہ اولیٰ وثانیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا تیسرا ایڈیشن بہتر شکل میں سامنے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس حقیر کی خدمت کو قبول فرمائے اور ہماری مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

محمد سعود عالم قاسمی

فہرست

پیش لفظ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جہاں مسلمانوں کے عائلی قوانین میں حکومت اور اکثریت کی مداخلت کا دفاع کرتا رہا ہے، وہاں مسلمانوں سے شرعی قوانین کی پابندی کرنے کا بھی مطالبہ کرتا رہا ہے اور مسلمانوں کو اپنی اصلاح آپ کرنے کی دعوت دیتا رہا ہے۔ اتباع شریعت اور اصلاح معاشرہ دونوں بورڈ کے مقاصد میں شامل ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کے اجلاس ۲۰۰۵ء منعقدہ کان پور میں یہ تجویز رکھی گئی کہ جمعہ کے خطبات کو اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بنایا جائے اور قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی مختصر اور موثر خطبات تیار کرائے جائیں تاکہ ائمہ جمعہ ان کو پڑھ کر سناسکیں یا اپنی تقریروں میں استعمال کرسکیں۔ بورڈ کے ایک معزز رکن نے اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جامع مسجد میں راقم کے خطبات کی مثال پیش کی اور خطبات جمعہ مرتب کرنے کی تائید کی، بورڈ نے اس سے اتفاق کرلیا۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی نے ان خطبات کو شائع کرنے اور تقسیم کرنے کی پیش کش کی، چنانچہ ان خطبات کو لکھنے کے لیے مقتدر علماء کرام سے رجوع کیا گیا، مگر ان سب نے اپنی طے شدہ مصروفیات کے پیش نظر معذرت کرلی، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری و چانسلر جامعہ ہمدرد جناب سید حامد صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے راقم کو گرامی نامہ لکھا اور اس سے پہلے مولانا ابرار احمد اصلاحی مکہ مکرمہ، مولانا فضل رحیم مجددی جے پور نے بھی فرمائش کی تھی اور مولانا ولی رحمانی حفظہ اللہ سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے ۱۵ محرم الحرام ۲۰۰۵ء کے مکتوب میں اصلاح معاشرہ پر مشتمل کچھ کتابچے تیار کرنے کی خواہش کی۔

ان بزرگوں کے احترام میں اور اس کام کو توشۂ آخرت سمجھ کر راقم نے ذمہ داری

قبول کرلی اور فہرست عنوانات تیار کر کے سید حامد صاحب کو ارسال کر دیا، سید حامد صاحب نے اس میں اضافہ کیا اور گراں قدر مشورہ دیا، راقم نے اپنے اوقات اور مصروفیات کی تنظیم کی اور اللہ کی مدد سے پچپن مقالات مرتب کر دیے، اگر چہ بعض دیگر عنوانات بھی لائق توجہ تھے مگر اپنے محدود وقت اور تعداد جمعہ وعیدین کا لحاظ رکھتے ہوئے مذکورہ خطبات پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔ ان خطبات میں ایمان وعقائد، اعمال واذکار، اخلاق وعادات، سماجی ومعاشی اصلاح اور بعض مروجہ رسوم کی تطہیر کو پیش نظر رکھا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ قرآن وسنت، اسوۂ صحابہؓ اور تاریخ اسلامی کے معتبر واقعات سے استفادہ کیا جائے، زبان سادہ اور ابہام سے پاک ہو، ہر خطبہ اوسطاً چھ صفحات پر مشتمل ہو، جو دس منٹ کے اندر پڑھا جا سکے۔

جو علماء خطبہ جمعہ اردو میں دینا مکروہ سمجھتے ہیں وہ خطبہ جمعہ سے پہلے تقریر کی شکل میں اسے پڑھ سکتے ہیں یا اس مضمون کو سامنے رکھ کر تقریر کر سکتے ہیں اور جو علماء خطبہ جمعہ عوامی زبان میں دینا مکروہ نہیں بلکہ مناسب سمجھتے ہیں وہ خطبہ اولیٰ میں اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لیے مضامین کی ترتیب ہجری مہینوں کے لحاظ سے رکھی گئی ہے، وہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے ترتیب بدل بھی سکتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، استاذ گرامی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دار العلوم دیوبند اور جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان خطبات پر اپنی تقاریظ مرحمت فرمائی، پروفیسر نفیس احمد صاحب نے کتاب کی اشاعت کی فکر کی، ہمدرد سوسائٹی کے صدر جناب حکیم عبد المعید صاحب نے مالی وسائل فراہم کیے، راقم ان کا مشکور ہے۔ اللہ ان کی خدمات قبول فرمائے اور ان خطبات کو شرف قبولیت سے نوازے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم.

محمد سعود عالم

اقرا کالونی، اسٹریٹ ۲، علی گڑھ، یوپی

۱۲ر رجب المرجب ۱۴۲۷ھ

تقریظ

(حضرت مولانامحمد رابع حسنی ندوی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه الغر الميامين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد:

اسلام کے معنیٰ حوالے کر دینے کے ہیں، اس کو ماننے والے کا گویا یہ کہنا ہے، بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے طور وطریق کو اپنے پروردگار کے حکموں کے حوالے کر دیا ہے۔ پروردگار کا جیسا حکم ہوگا اور جو ہدایت ہوگی، وہ اپنی زندگی کے عادات و اطوار کو اس کے مطابق رکھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے کو اپنی زندگی کے طور وطریق کو اس کے حوالے کر دینے کی ہدایت محض مجبور اور بے ضرورت تابع دار بنانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خود انسان کے اختیار کردہ طریقے کی طرح لین دین کے دائرے میں رکھا ہے کہ بندہ اپنی زندگی کو اللہ رب العالمین کے بتائے ہوئے طریقے سے گزارے، اللہ تعالیٰ اس کے عواض میں کئی گنا بڑھا کر اس کا عوض یعنی بدلہ دے گا۔

انسانوں کا قاعدہ ہے کہ کسی نے کسی کو کام کرنے کے لیے مزدور رکھا تو جتنے وقت کا کام طے ہوا، اتنے وقت تک مزدور رکھنے والے کے بتائے ہوئے طریقے سے کام کرے گا، شام کو اس کا بدلہ یعنی اجرت جیسا کہ طے ہوئی ہے، دے دی جائے گی۔ لیکن مزدور اگر اپنی مرضی چلائے اور بتائے ہوئے طریقے سے اس نے کام نہیں کیا تو مزدور رکھنے والا اس کی مزدوری کاٹ لے گا اور اگر زیادہ خلاف ورزی کی ہے تو اس کو نکال دے گا، کچھ بھی مزدوری نہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ اسلام کو مانتا ہے وہ در حقیقت اس بات کو مانتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حکموں کے مطابق زندگی گزارے گا، اس کا رب رحیم ہے، کریم ہے، وہ اس کو ایسے طریقۂ کار کردگی کا حکم نہیں دیتا جو بندے سے نہ ہو سکے، بلکہ ایسے کام کا حکم دیتا ہے جو خود انسان اگر اپنے ضمیر اور عقل کے تحت غور

کرے تو وہ اس کو اپنی زندگی کے لیے مناسب اور مفید قرار دے گا، جب یہ زندگی ختم ہوگی اور موت کی نیند پوری کر کے نئی زندگی کی صبح ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اس کی پوری زندگی میں اس نے جو کام ٹھیک انجام دیے ہیں، ان کی بھر پور اجرت دے گا اور اس کو اپنی گذشتہ زندگی کو نیک اور اچھی طرح گزارنے پر اس کا مالک وخالق ایک نہ ختم ہونے والی اور نہایت بیش بہا راحت ولذت والی جنت کے باغوں میں گزارنے اور وہاں کی نعمتوں سے لطف اٹھانے کے لیے دے گا۔ ذرا غور کیجیے کیسا عظیم، خوش کن اور دل نواز سودا ہے!!! اسی کو فرمایا گیا ہے کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں کہ اس کے عوض میں ان کے لیے جنت ہوگی۔

ہم مسلمان ہیں اور اپنے کو مسلمان مانتے ہیں، یعنی اپنی زندگی کو اپنے پروردگار کی تابع دار بنانے کا دعوی رکھتے ہیں، تو کیا پھر ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم معلوم کریں کہ ہمارے پروردگار نے ہم کو زندگی کے طور وطریق کو کس طرح رکھنے اور اختیار کرنے کو فرمایا ہے، جس کے بدلے میں ہم کو اپنی دوسری زندگی میں راحت اور لطف حاصل ہوگا۔ یہاں کی گئی نیکیوں کے بدلے میں وہاں نعمتیں وجود میں آئیں گی اور بدی کے بدلے میں مصیبتیں سامنے آ کر کھڑی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ، ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ﴾ کہ جو (انسان یہاں) ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کرے گا، اس کو (وہاں آخرت کی زندگی میں) دیکھے گا اور جو (یہاں دنیا میں) ایک ذرہ کے برابر بھی بدی کرے گا اس کو (وہاں) دیکھے گا۔

یہی وہ اہم بات ہے جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلمانوں کے تمام ادارے مسلمانوں کو بتانے اور متوجہ کرنے کی فکر کرتے ہیں اور اس کام کو اصلاح معاشرہ کے نام سے انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! اپنی زندگیوں سے بری باتیں دور کرو اور بھلی باتیں اختیار کرو۔ بری باتیں مسلمانوں کے لیے وہ ہیں جن سے رب العالمین نے اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ذریعے اور اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ دونوں طرح کی باتیں

ہم اگر قرآن مجید اور حدیث شریف سے خود نہیں معلوم کر سکتے تو ان دونوں کے پڑھنے والے اور جاننے والے اور اپنے رب کے فرماں بردار بندوں سے معلوم کر سکتے ہیں اور رب العالمین کے یہ فرماں بردار اور اصحاب علم مسلمان بندے خود بتانے کی کوشش کرتے ہیں، ہم ان کی بات سنیں اور مانیں۔

ہمارے مدرسے ایسے افراد تیار کرتے ہیں جو ان باتوں کو جاننے کے لیے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے دینی بھائیوں کو بتاتے ہیں، یہ بتانا وعظ کی محفلوں میں اور مفتیوں کے فتووں کے ذریعے اور جمعہ وعیدین کے موقع پر ائمہ ومقررین کے ذریعے علم میں لائی جاتی ہیں اور جمعہ کا موقع تو ہر ہفتے آتا ہے اور اس طرح نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؟ کا گویا ہفتہ واری درس ہوتا ہے۔ جمعہ کی نماز سے قبل خطبہ رکھا گیا ہے تاکہ اس سے یہ نصیحتیں حاصل ہوں اور حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خطبے دیتے تھے اور نیکی اختیار کرنے اور اس کے فائدوں کی طرف اور برائی سے بچنے اور اس کے انجام کی طرف متوجہ کرتے تھے، اس وقت سے یہ سلسلہ چلتا آرہا ہے۔

خطبۂ جمعہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے دیے جانے کا سلسلہ عربی سے شروع ہوا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولین مخاطبین عرب تھے اور پھر یہ عربی ہی میں دیا جاتا رہا، تو عربی جاننے والوں کا کام تو اس سے چلتا ہے، لیکن بعد میں اسلام کے ماننے والے دنیا کی دیگر زبانوں کے بھی ہوتے چلے گئے تو یہ خطبہ عربی میں ہونے کے سبب اس کی باتیں عربی نہ جاننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں، لہذا اس کے لیے ہمارے علماء نے تلافی کی صورتیں نکال لیں، مثلاً عربی خطبے کے دوران میں ہی ضروری باتیں اردو یا مقامی زبان میں بھی کہہ لیتے ہیں، یا خطبہ ونماز سے قبل یا نماز کے بعد اردو یا مقامی زبان میں ضروری باتیں بتاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک سودمند طریقہ یہ بھی سامنے آیا کہ سمجھ اور علم دین رکھنے والے ہمارے کسی ایک یا کئی علماء کے ذریعے جمعہ کے موقع پر اردو میں قرآن وحدیث

میں بتائی ہوئی وہ باتیں جو مسلمان کی زندگی کو اپنے رب کی فرماں برداری کی زندگی بنانے والی اور اپنے رب کی رضامندی دلانے والی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ باتیں جو مسلمان کی اسلامی زندگی کو بگاڑنے اور نافرماں برداری کی زندگی بنانے والی اور پروردگار کو ناراض کرنے والی ہیں، الگ الگ خطبوں میں دینے کے لیے تیار کرادی جائیں اور یہ خطبے سال بھر کے جمعوں کے لحاظ سے ہوں، تاکہ خطیب حضرات ان سے مدد لے کر عامۃ المسلمین کے ساتھ بتا سکیں اور سمجھا سکیں۔

الحمدللہ اس کام کو کئی مختلف حضرات علماء نے کیا، اسی ضمن میں زیادہ باضابطہ اور تفصیلی طریقے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کی کئی مقتدر شخصیتوں کی فرمائش اور مشورے سے انجام دیا ہے، انھوں نے سال بھر کے جمعوں کی تعداد جو قمری سال کے اعتبار سے پچاس سے اوپر ہوتی ہیں، تقریباً ۵۵-۵۴ خطبوں میں مسلمان کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور آسان اور شستہ زبان میں بات کو ادا کیا ہے۔ ان کی علمی و دینی صلاحیتیں ان کے اس کام میں معاون بنی ہیں۔ وہ ہندوستان کے بڑے صاحب علم و دانش عالم دین ہیں۔

انھوں نے اس طریقے سے ہمارے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تجویز اور توجہ دہانی اور اس سلسلے میں اس کی فکرمندی اور کوشش کو اہم اور خصوصی مدد پہونچائی ہے، جس کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں اور امید کرتے ہیں کہ خطبات اصلاح معاشرہ کی مہم کے لیے بہترین سوغات ثابت ہوں گے اور اصلاح معاشرہ کے لیے کام کرنے والوں کو ان سے ان کے کام کے انجام دینے کے لیے تقویت کا اچھا سامان مہیا ہوگا۔

مجھ سے انھوں نے فرمائش کی کہ ایک تقریظ میں بھی لکھوں، چنانچہ میں نے یہ مذکورہ بالا باتیں پیش کردیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مفید بنائے، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

۳۰/۰۶/۱۴۲۷ھ
۲۷/۰۷/۲۰۰۶ء

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اردو خطبات جمعہ

ایک کامیاب دینی کوشش اور ایک اہم معاشرتی اصلاحی اقدام!

﴿حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند﴾

اسلام میں یوم جمعہ ایک بافضیلت یوم عبادت ہے۔ جس پر یہ وضاحت شرعی شاہد عدل ہے کہ عالم جنت میں ہفتہ کے بعد آنے والے وقت کا نام ''جمعہ'' ہی ہوگا۔ جب کہ دنیا کے سورج کے طلوع وغروب سے ظاہر ہونے والے دیگر تمام ایام وہاں نہیں ہوں گے۔

اس یوم مبارک کی نماز کے ساتھ خطبہ کو لازم فرما کر اس کی تقدیس کو عظیم تر فرما دیا گیا ہے۔ اس خطبہ میں چونکہ شان ذکر وعبادت بھی شامل ہے اس لیے خطبہ جمعہ کا عربی میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس میں مسائل وفضائل ودینیہ بھی چونکہ شامل ہوتے ہیں جس سے عربی نہ جاننے والے براہ راست مستفید نہیں ہوسکتے۔ اس کے لیے قبل از نماز جمعہ ان مسائل وفضائل پر مشتمل خطبات کی تدوین اردو زبان میں بھی مناسب سمجھی گئی جس کا بنیادی مقصد ملت کی معاشرتی اصلاح ہے۔ گویا یہ اردو خطبات اصلاح معاشرہ میں ایک خوش آیند تبدیلی ہے، جس کی تائید حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس اسوۂ مبارکہ سے بھی ہوجاتی ہے کہ حضرت خلیل اللہ سے قبل صلحائے امم اپنے معاشرے میں توحید ربانی کے بنیادی عقیدہ کو دل ودماغ میں راسخ ومستحکم کرنے کے لیے اپنے اردگرد اور آمنے سامنے کے زبردست مظاہر قدرت خداوندی کو بطور دلیل پیش فرما کر مدلل کرتے تھے، لیکن ان کے بعد عامۃ الناس نے ان مظاہر قدرت ہی کو معبود قرار دے کر ان کی پرستش شروع کردی اور شرک کا باب کھل گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کو ملحوظ فرما کر انسانیت کو مظاہر پرستی سے بچانے کے لیے، پرواز ہدایت میں یہ حکیمانہ تبدیلی فرمائی کہ مظاہر قدرت کے

بجائے ''روح انسانی'' کو خدا شناسی کا وسیلہ بنایا کہ جس میں مخلوق ہونے کے باوجود خالق اکبر اللہ رب العزۃ نے روح کو اپنی بعض صفات مخصوصہ خالقیت سے متصف فرمادیا، جیسے اللہ مدبر کائنات ہے تو روح مدبّر بدن ہے، اللہ ہر جگہ موجود ہے مگر لائق اشارہ نہیں ہے۔ ایسے ہی روح کی بھی کل بدن میں جلوہ گری کے باوجود مشارٌ الیہ نہیں بنتی۔

ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ توحید کے بارے میں یہ جدید وموٴثر ترین پرواز ذریعۂ رسوخ تو قوی ترین بنا ہی لیکن اس پرواز جدید نے مظاہر پرستی کا باب بھی ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

اردو خطبات کی قرار واقعی افادیت چونکہ اس پر موقوف تھی کہ آسان زبان میں ضروری مسائل وفضائل کے ساتھ خطبات عقائد صحیحہ، عبادات لازمہ، اوقات متبرکہ، معاملات عادلہ اور اخلاق حمیدہ کی تذکیر و یاددہانی پر ضروری تفصیلات کے ساتھ مشتمل ہوں۔ اسی بنیاد پر معاشرے کی اصلاحی ضروریات سے بخوبی واقف اور دینی و علمی لحاظ سے وسیع النظر عالم کی اس کے لیے ضرورت تھی، جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارباب بست وکشاد کی نگہ انتخاب فاضل محترم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی کی شخصیت پہ پڑی، یہ موزوں ترین انتخاب تھا، مولانا موصوف نے نہ صرف اس خدمت وقیعہ کو قبول فرمایا، بلکہ اپنی بہترین علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر بہت قلیل مدت میں اس کی تکمیل ۵۵ خطبات کی تدوین کے ذریعہ فرمادی۔ جس میں سلاست بیان اور آسان زبان کے ساتھ، آیات مناسبہ، احادیث صحیحہ اور تفاصیل ضروریہ نے ان کی افادیت کو غیر معمولی طور پر وسیع الذیل کردیا۔

مدوّن خطبات محترم مولانا سعود عالم صاحب قاسمی، بجا طور پر ملت اسلامیہ کی جانب سے تبریک وتشجیع کے ساتھ لائق تشکر ہیں اور منجانب اللہ اس دائمی دینی خدمت عظیمہ پر انشاء اللہ العزیز مستحق اجر وثواب بھی ہیں۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

احقر محمد سالم قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف)

۱۷؍جولائی ۲۰۰۶ء

تقریظ

(جناب سید حامد صاحب، چانسلر جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)

اسے توارد کہیے یا ایک شدید ضرورت کا اجتماعی احساس، کہ اسلام نے کلمہ گو کو رہِ راست پر چلنے اور اخلاق و اطوار کی تہذیب کے لیے ایک بڑا ذریعہ عطا کیا ہے، جس کا استعمال انھوں نے معلوم نہیں کیوں ترک کر دیا۔ عرب یا عربی داں ممالک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جہاں مسلمان بستے ہیں خطبہ بالعموم عربی میں دیا جاتا ہے۔ چونکہ نمازی عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے اس لیے وہ خطبہ کا مفہوم نہیں سمجھ پاتے اور وہ ان کے نقطۂ نگاہ اور اخلاق و اطوار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس طرح اسلام کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے اور برائیوں سے بچنے اور عادات اور اعمال کو پاکیزہ رکھنے اور خیر سگالی اور انسان دوستی کا ایک بڑا حربہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

اس بات کو دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ایمان اور اس کی پیروی میں ڈھیل آنے لگتی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ بات بڑے پیمانے پر ہوئی اور ہمارے قول اور فعل میں تفاوت راہ پا گیا، جو دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ ہم نے ایک حد تک عقیدہ کو درست رکھا اور عبادت کی پابندی کی، لیکن ہم یہ بھولنے لگے کہ عقیدہ کی درستی اور عبادات کی پابندی کا بڑا فیض یہ ہے کہ انسان برائیوں سے دامن بچاتا رہے اور بددیانتی، حرص اور طمع، عداوت اور دلشکنی کو اپنے پاس کبھی نہ پھٹکنے دے۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی آئے دن دیکھنے میں آتی ہیں کہ انسان روزے نماز کے پابند ہیں، ان کے عقاید بھی کم و بیش ٹھیک ہیں لیکن وہ اعمال کی طرف سے غفلت برتنے لگتے ہیں۔ ناانصافی اور دلشکنی

کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا، نہ یہ احساس ان کے دامنِ دل کو چھوتا ہے کہ یہ اعمال دین کی تعلیمات کے برعکس ہیں اور ان کی بداعمالیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگ ان کے دین کے متعلق غلط رائے قایم کرتے ہیں۔

اور ہے تیرا شعار آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

عقاید واقوال اور دوسری طرف اخلاق وافعال کے درمیان جو فاصلہ حائل ہوگیا ہے اس کی طرف اکثر دوسرے مذاہب کے ماننے والے مفکرین کی نگاہ غلط انداز پڑتی رہی ہے۔ لیکن ہمیں اس کی زیادہ فکر نہیں کہ اغیار ہمیں کیا سمجھتے ہیں اور ہماری بابت کیا کہتے ہیں۔ ہمیں بڑی فکر اس بات کی ہے کہ ہم اپنے دین پر اخلاص اور استقامت اور اعتماد کے ساتھ عمل کریں تاکہ ہماری دنیا بھی سنور جائے اور ہماری آخرت بھی۔

انسان کی فطرت ہے کہ جو بات اس کے کانوں میں بار بار ڈالی جائے وہ پہلے ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ راقم سطور کے بچپن نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب استاد آموختہ دوہرانے کے بعد ہی آگے بڑھتے تھے۔ دینی اور اخلاقی تعلیم کا یہ سلسلہ جو ''خطبات جمعہ'' سے انشاءاللہ شروع ہوگا محاسن اخلاق اور دین کے بنیادی اصولوں کو ہر جمعہ میں دوہرائے گا تاکہ انھیں بھلایا ہی نہ جاسکے۔

قارئین کرام شاید ہندوستانی مسلمانوں کے تناظر میں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیں گے کہ ان کے اہل وطن ان کی عبادات کو نہیں دیکھیں گے، نہ ان کے عقاید کو ٹٹولیں گے۔ وہ تو صرف یہ دیکھیں گے کہ مسلمان کیسے شہری ہیں، اچھے یا بُرے، وہ آپس میں اور خود ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے ان کے وطن کو فایدہ پہنچتا ہے یا نقصان، اس کے ارتقا میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ ان کی مثال کا ان کے ہم وطنوں پر اچھا اثر پڑتا ہے یا بُرا۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ امید ہے کہ جن خطبات کو مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بڑی لیاقت اور ریاضت کے ساتھ قلمبند کیا ہے وہ ہماری مساجد میں اگر پابندی کے ساتھ ہر جمعہ اور عیدین کے موقع پر دیے گئے تو اصلاح معاشرہ کا کام بڑے پیمانے پر انجام پا جائے گا انشاء اللہ اور وہ غلط فہمیاں بھی آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گی جو ہمارے اہل وطن کے دلوں میں ہماری بابت گھر کر گئی ہیں۔

یہ ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر اس گرانقدر تعاون کا اعتراف نہ کیا جائے جو خطبات جمعہ کی اس مہم کو جناب عبد المعید صاحب صدر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے دیا گیا۔

ہر چند کہ خطبات کی تسوید کی فرمایش مولانا (ڈاکٹر) سعود عالم قاسمی صاحب سے ہمارے بعض اکابرین پہلے ہی کر چکے تھے، تاہم میں اپنی ذات پر ان کا خصوصی احسان سمجھتا ہوں کہ بالآخر اپنی گراں قدر مصروفیات کے باوجود انھوں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا اور اسے ختم کر کے ہی دم لیا۔ اللہ ان کی مساعی جمیلہ کو مشکور فرمائے اور ان کے خطبات کو دیرپا اور دوررس اثرات سے نوازے۔

احقر

سید حامد

۲۳ جولائی ۲۰۰۶ء

خطبہ جمعہ - اہمیت اور تقاضے

دین اسلام میں کلیدی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔ اسے دین کا ستون اور مومنوں کی معراج کہا گیا ہے۔ نماز وقت پر اور مسجد میں با جماعت ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مسجد عبودیت یعنی بندگی، عاجزی اور خودسپردگی کی ہی جگہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور دینی مرکزیت کی بھی علامت ہے۔ مختلف رنگ و نسل، برادریوں، قبیلوں، پیشوں اور مختلف حالات وخیالات کے لوگ معاشی طور پر منتشر اور متفرق لوگ جب ایک ساتھ مسجد میں جمع ہوتے ہیں تو عبادت اور اخوت کی شان کا دلفریب منظر پیدا کرتے ہیں۔ مسجد ان کو عبادت کا ماحول فراہم کرتی ہے اور اپنے رب سے جوڑ دیتی ہے اور یہی مسجد ان کو اخوت اور مساوات کی لڑی میں پرو کر انسانی زنجیر یا سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتی ہے۔ پانچوں وقت اور ہفتہ بھر کی یہ اجتماعی عبادت جمعہ کی نماز سے جڑ جاتی ہے اور عبودیت و اجتماعیت کی یہ لہریں دریا کی روانی اور سمندر کے موج کی طرح روحانی اور سماجی زندگی کی حرکت، فعالیت، نمو اور انقلاب کی علامت بن کر اسلام کی عظیم قوت وشوکت کی نقیب بن جاتی ہیں۔ [1]

عبودیت، اخوت اور اجتماعیت کا جو موقع نماز جمعہ کی شکل میں اسلام نے عطا کیا ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب اس کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ نماز جمعہ میں عبادت اور اجتماعیت یعنی روحانی اور سماجی قدروں کا جو حسین اشتراک پایا جاتا ہے وہ انسانی زندگی پر دوررس اثرات مرتب کرتا ہے۔

عام نمازوں کے لیے تو مسلمان صرف وضو کر کے مسجد میں حاضر ہوتا ہے مگر

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب مسجد اسلامی معاشرہ میں، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نماز جمعہ کے لیے وضو کرنے کے علاوہ غسل بھی کرتا ہے، کپڑے بھی تبدیل کرتا ہے اور ممکن حد تک خوشبو لگا کر اہتمام کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا ہے اور اپنے سارے کاروبار اور معمولات زندگی کو چھوڑ کر آتا ہے کیونکہ اس کے پروردگار نے نماز جمعہ کے لیے اسی طرح کا اہتمام کرنے کا ان کو حکم دیا ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (الجمعۃ--۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔

خطبہ جمعہ

نماز جمعہ عام نمازوں کی طرح صرف سر جھکانے کی اجتماعی کوشش نہیں بلکہ مسلمانوں کو تعلیم، تذکیر، وعظ ونصیحت اور اصلاح واحتساب کی دعوت بھی دیتی ہے، اسی لیے نماز جمعہ سے پہلے خطبہ جمعہ کو جو دو نشستوں میں دیا جاتا ہے شریعت نے نماز جمعہ کا لازمی جزو قرار دیا ہے، یہ خطبہ مسلمانوں کے ہفتہ بھر کے کاموں کی خود احتسابی اور اگلے ہفتہ بھر کے کاموں کی دینی منصوبہ بندی کا محرک ہے، اس خطبہ میں جہاں اللہ کی حمد وثنا ہوتی ہے اس کے رسولوں پر درود بھیجا جاتا ہے، دینی شعائر اور دینی احکام کا بیان ہوتا ہے، اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین ہوتی ہے، وہاں امت کے مسائل، اسلام کو درپیش داخلی اور خارجی چیلنج کا تذکرہ ہوتا ہے، کفر وشرک، مہلک رسموں اور بے دینی سے پرہیز کرنے کی نصیحت ہوتی ہے، باہمی تعلقات درست کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، امت مسلمہ کے لیے دعائیں ہوتی ہیں اور توبہ واستغفار کا

اعادہ ہوتا ہے۔ جو مسلمان پانچ نمازوں میں مسجد حاضر نہیں ہوتے وہ بھی نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں، خطبہ جمعہ کے ذریعہ ان کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے اور اسلامی نظام زندگی کے مختلف گوشوں سے ان کی واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے، گویا مسجد جمعہ مسلمانوں کی عبادت گاہ بھی ہے اور ان کی درس گاہ بھی ہے، جہاں اسلام کی نظری اور عملی تعلیم ایک ساتھ انسانی زندگی میں ڈھلتی ہے۔ خطبات جمعہ کے ذریعہ ان کی دینی وسماجی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے، ان کے افکار ورسوم کی تطہیر ہوتی ہے اور ان میں دین سے وابستگی کا، اللہ کی بندگی کا اور پاکیزہ زندگی گزارنے کا عزم وحوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

روحانی مناسبت، پاکیزہ ماحول، نمازیوں کی ذہنی یکسوئی اور جذبہ اطاعت کی وجہ سے خطبہ جمعہ کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ انسانی دل ودماغ میں جگہ بناتا ہے اور انسانی خیالات اور رویوں کا رخ موڑ دیتا ہے۔

رسول کریمؐ کا خطبہ

محسن انسانیت جناب رسول کریم ﷺ کے خطبات کی اثر انگیزی اور انقلابی قوت تمام دنیا کے معلموں، مصلحوں اور خطیبوں کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خطبے مختصر مگر جامع، سادہ مگر موثر ہوتے تھے۔ قلب کو متحرک اور دماغ کو منور کرنے والے، ضمیر کو بیدار اور جذبات کو معتدل کرنے والے، فکر میں پاکیزگی اور عمل میں پختگی عطا کرنے والے ہوتے تھے۔ روحانی اور ربانی قدروں سے معمور، اور حکمت و دانائی سے لبریز ہوتے تھے۔ ان خطبات کے نمونے آج تک موجود ہیں۔ زمانہ ان کو پڑھے، سنے اور سر دُھنے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ حضور پاکؐ کے خطبہ کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں **"کانت للنبی ﷺ خطبتان یجلس بینھما یقرا القرآن ویذکر الناس. فکانت صلوتہ قصدا و خطبتہ قصدا"**۔[۱]

نبی ﷺ دو خطبہ دیتے تھے، ان کے درمیان بیٹھتے تھے، قرآن پڑھتے تھے

---

[۱] مسلم، کتاب الجمعہ، فصل یخطب الخطبتین و یجلس بینھما۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الخطبۃ قائما۔

اور لوگوں کو تذکیر کرتے تھے، آپ کی نماز اور خطبہ دونوں معتدل ہوتے تھے۔

خطبہ حجۃ الوداع کی آفاقی اور عالم گیر اثر انگیزی سے کون واقف نہیں ہے، یہ خطبہ اگر ایک طرف روحانی اور سماجی قدروں کا محافظ ہے تو دوسری طرف انسان کے بنیادی حقوق کا پہلا منشور ہے۔ اس خطبہ نے دنیائے انسانیت کو عدل و مساوات، امن و سکون، اخوت و محبت، حق شناسی اور فرض شناسی اور وحدت بنی آدم کی جو بنیاد عطا کی ہے اقوام متحدہ نے اسی بنیاد پر حقوق انسانی کے چارٹر کی عمارت اٹھائی ہے۔ ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے   یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

حضور ﷺ کے خطبات کی اثر انگیزی کا صرف ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت فرماتے ہیں:

وعظنا رسول الله ﷺ موعظة بليغة وجلت منها القلوب وذرفت منها العيون، فقال قائل يا رسول الله كان هذه موعظة مودع فماذا تعهد الينا، فقال اوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة وان عبدا حبشيا، فانه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة.[1]

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں وعظ کہا اور وعظ انتہائی بلیغ تھا، جس سے دل دہل گئے، آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ہم میں سے کسی نے کہا اے اللہ کے رسول! لگتا ہے یہ الوداعی خطبہ ہے، آپ ہمیں کیا نصیحت فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقوی اختیار کرو اور امیر کی بات سنو اور اس کی فرماں برداری کرو، اگر چہ تمہارے اوپر کسی

---

[1] ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ۔

حبشی غلام کو ہی امیر بنا دیا جائے۔تم میں سے جو لوگ زندہ رہیں گے وہ بہت سارے اختلافات دیکھیں گے،تم لوگ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کا اتباع کرنا، اس کو دانتوں سے پکڑنا، دین میں نئی باتوں سے بچتے رہنا، اس لیے کہ ہرنئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔

خطیب کی ذمہ داری

جو شخص جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے مسلمانوں کے سامنے منبر پر کھڑا ہوتا ہے وہ دراصل حضرت رسالت مآب کا جانشین اور نمائندہ ہوتا ہے اور امت کی رہنمائی کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذی علم، سمجھ دار، بُردبار اور خدا ترس ہو اور حسب ذیل دس باتوں کو اپنے اوپر لازم کرلے تا کہ وہ اپنی دینی اور منصبی ذمہ داری صحیح طریقہ سے انجام دے سکے۔

(۱) مسلمانوں کو قرآن وسنت سے جوڑنے کی کوشش کرے، اپنی بات کو قرآن کی آیات اور صحیح احادیث کے ساتھ بیان کرے تا کہ امت کا قرآن سے اور رسولؐ کی سنت سے تعلق پیدا ہو جو ان کے ایمان کی جان ہے۔

(۲) صرف صحیح احادیث بیان کرے، موضوع اور من گھڑت روایات، ضعیف اور غیر معتبر روایات سے پرہیز کرے، کوشش کرے کہ حدیث کا حوالہ بھی بیان کردے بلکہ پہلے سے آیات اور احادیث کا انتخاب کرلے۔

(۳) قصے کہانیوں، توہم پرستی اور غیر اللہ کی اہمیت پر مبنی واقعات سنانے سے گریز کرے، اس کے بجائے انبیاء کرام، سیرت رسولؐ، اسوۂ صحابہ اور سلف صالحین کی عزیمت کے واقعات سنائے، ہر سنی سنائی بات کو بیان نہ کردے۔

(۴) چھوٹے چھوٹے کاموں پر بڑے بڑے اجر کا اور اسی طرح چھوٹے

چھوٹے گناہوں پر بڑی بڑی سزاؤں کا ذکر نہ کرے، اس سے امت میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے، بلکہ انہی جزا وسزا کا ذکر کرے جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں۔

(۵) مسلمانوں کو بے جا خوش فہمی میں مبتلا نہ کرے اور نہ ان کی حوصلہ شکنی کرے، بلکہ انذار اور تبشیر دونوں سے کام لے، یعنی خوف اور خوشی دونوں کا پیغام دے، کیونکہ رسول پاک ﷺ بشیر بھی تھے اور نذیر بھی۔ جب آپ جہنم سے ڈراتے تھے تو جنت کی خوش خبری بھی سناتے تھے۔

(۶) مسلمانوں کو حقیر اور کمتر نہ سمجھے، ان کی دل آزاری نہ کرے، اپنے آپ کو افضل اور برتر نہ سمجھے اور نہ غرور نفس میں مبتلا ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا اپنی تربیت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

(۷) مسلکی، گروہی اور علاقائی تعصب کو ہوا نہ دے، کیونکہ اسلام اسے مٹانے کے لیے آیا ہے بلکہ مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور اخوت کی کوشش کرے اور بار بار اس پر زور دے، مسجد جوڑنے کی جگہ ہے، اسے تفریق کا ذریعہ نہ بنائے۔

(۸) مسلمانوں میں پائی جانے والی فاسد رسموں کی اصلاح پر زور دے، ان کی سماجی اصلاح کرے، بدعات وخرافات سے دور رہنے کی تلقین کرے اور اس کے لیے شیریں لہجہ اور حکیمانہ انداز اختیار کرے۔

(۹) غیر اسلامی نظریات اور اسلام دشمن طاقتوں کے عزائم کا بصیرت سے مطالعہ کرے اور معقولیت سے بیان کرے، امت کو درپیش داخلی اور خارجی خطرات سے آگاہ کرے اور لوگوں کو علم کی رغبت دلائے۔

(۱۰) خطبہ اتنا طویل نہ دے کہ لوگ اکتا جائیں، ان کا ذوق وشوق ختم ہو جائے اور نہ اتنا مختصر کردے کہ خطبہ کی روح فنا ہو جائے، بلکہ اعتدال سے کام لے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ معتدل ہوتا تھا۔

خطبہ کی زبان:

خطبہ کا آغاز اور اختتام عربی زبان میں ہونا چاہیے۔ دوسرا خطبہ بھی جو حمد و صلوٰۃ اور دعا و اذکار پر مشتمل ہوتا ہے عربی میں ہونا چاہیے تاکہ قرآن وسنت کی زبان سے عوام مانوس ہوں، اس کے علاوہ خطبہ اولیٰ کا باقی حصہ جو تذکیر و تبلیغ اور وعظ و نصیحت پر مشتمل ہوتا ہے اس زبان میں ہونا چاہیے جس کو عوام سمجھتے ہوں، ورنہ خطبہ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، خطبہ ایک مذہبی رسم اور روایت نہیں بلکہ خطبہ ہماری دینی ضرورت ہے، عوامی اصلاح کا ذریعہ ہے، خطبہ میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا سننا کافی نہیں، ان کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا مطلوب ہے، اس کے لیے خطبہ کا ایک حصہ اس زبان میں ہونا چاہیے جو عوام کی زبان ہے، یہ امت مسلمہ کے علماء اور فقہاء کی اکثریت کا مسلک ہے، ہندوستان کے بعض علماء عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ دینے کو مکروہ کہتے ہیں، یہ بیسویں صدی کے بعض علماء کی رائے ہیں کسی امام کا مسلک نہیں ہے، جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے تو شمش الائمہ علامہ سرخسی نے صراحت سے نقل کیا ہے۔

لو خطب بالفارسية جاز عند ابی حنيفة علی كل حال وروی بشر عن ابی يوسف انه اذا خطب بالفارسية وهو يحسن العربية لايجزيه الا ان يكون ذكر الله فی ذالک بالعربية فی حرف او اكثر [1]

اگر پورا خطبہ فارسی زبان میں دیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر حال میں جائز ہے، اور بشر امام ابو یوسفؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر عربی سے اچھی طرح واقف ہے پھر پورا خطبہ فارسی میں دیا تو جائز نہیں، البتہ کچھ بھی اللہ کا ذکر عربی میں کر دیا تو جائز ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بانی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کا یہ فتوی مشہور ہے

---

[1] محیط جلد دوم فصل ۲۵

''خطبہ کا اصل مقصود وعظ ونصیحت اور تعلیم وتذکیر ہے اور ہندوستان میں اس مقصود کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے بغیر اس کے کہ اردو وغیرہ میں بیان کیا جائے اس وجہ سے یہ ہونا چاہئے کہ خطبہ میں مناسب وقت جو وعظ ونصیحت اور تعلیم کرنا مقصود ہو وہ اس زبان میں کی جائے جس میں حاضرین سمجھیں اور فائدہ حاصل کرسکیں اور بقیہ مضمون خطبہ کا عربی میں ہو تاکہ خطبہ کا اصل مقصود فوت نہ ہو اور حتی الوسع سلف کی پیروی اور عربی زبان کی فضیلت بھی حاصل ہوجائے''۔[1]

مکہ مکرمہ کی فقہ اکیڈمی نے جس میں تمام ملکوں کے علماء اور فقہا کی نمائندگی ہوتی ہے اپنے پانچویں سمینار میں حسب ذیل قرارداد منظور کی ہے۔

''غیر عرب علاقوں میں جمعہ وعیدین کے خطبہ کے صحیح ہونے کے لیے عربی زبان کی شرط نہیں ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ خطبہ کے ابتدائی کلمات اور قرآنی آیات عربی میں پڑھی جائیں تاکہ غیر عرب بھی عربی اور قرآن سننے کی عادت ڈالیں، اور عربی اور قرآن سیکھنا ان کے لیے آسان ہو، پھر خطیب علاقائی زبان میں انہیں نصیحت اور تذکیر کرے''۔[2]

جو لوگ صرف عربی میں خطبہ دینے پر اصرار کرتے ہیں وہ خطبہ کی اذان سے پہلے ایک اور خطبہ اردو یا علاقائی زبان میں دینے کے قائل ہیں، اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں قرون اولی اور سلف صالحین کے عمل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

خطبہ کے سامعین:

جمعہ کی نماز ادا کرنے والے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز جمعہ کا اہتمام کریں۔ خطبہ سے پہلے مسجد تشریف لائیں، سنت کا اہتمام کریں، خطبہ توجہ سے سنیں اور خاموشی اختیار کریں، حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''**من توضّا فاحسن الوضوٴ ثم اتی الجمعةَ فاستمع وانصتَ**

---

[1] القول المحکم فی خطابۃ العجم، ص۶

[2] مکہ فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلے، ص۱۰۷، نئی دہلی ۲۰۰۴ء

غفر له مابين الجمعة الى الجمعة وزيادة ثلاثة ايام.[۱] جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا پھر جمعہ کی نماز کے لیے حاضر ہوا، خاموشی اور توجہ سے خطبہ سنا اس کے دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں بلکہ تین مزید ایام کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

مسجد میں بعد میں آنا اور گردنیں پھلانگ کر آگے جانے کی کوشش کرنا خلاف سنت ہے، حضرت عبداللہ بن بسر روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے ایک صاحب آئے اور گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو روکا اور فرمایا ''اجلس فقد آذيت''[۲] بیٹھ جاؤ تم نے نمازیوں کو تکلیف پہونچائی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں جمعہ کی نماز کے لیے آیا، حضورؐ خطبہ دے رہے تھے، میں نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے پوچھا یہ سورہ کب نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے غضبناک نگاہوں سے مجھے گھورا اور جواب نہیں دیا، کچھ دیر بعد میں نے پھر سوال کیا، پھر انہوں نے اسی طرح تیکھی نگاہ سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا، کچھ دیر بعد میں نے پھر اپنا سوال دہرایا، پھر انہوں نے وہی طرز عمل اپنایا اور جواب نہ دیا، جب نماز ختم ہوگئی تو میں نے ان سے اس رویہ کی شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ آج کی نماز تو تمہاری وہی حرکت ہے جو تم نے کی ہے، مجھے مزید تکلیف ہوئی اور رسول پاک ﷺ کے پاس پہونچا اور پورا واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا بے شک ابیؓ نے سچ کہا۔[۳]

خطبہ کے دوران باتیں کرنا سنجیدگی اور وقار سے نہ بیٹھنا دین سے بے رغبتی کی علامت ہے، قصداً ایسے وقت آنا جب خطبہ ختم ہو رہا ہو عبادت میں سستی کے مرادف ہے، گو کہ خطبہ کی قضا نہیں مگر خطبہ جان بوجھ کر چھوڑنا سنت کو ترک کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو خطبہ اور نماز جمعہ کا اہتمام کرنے کی توفیق دے (آمین)

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب فضل الجمعۃ
[۲] ایضاً، باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ
[۳] صحیح ابن خزیمہ، کتاب الصلوۃ

ماہ محرم اور ہجری سال

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًاۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًاۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً. (النساء ۹۷تا۱۰۰)

جولوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔فرشتوں نے کہاں، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جوکوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا۔

محرم الحرام ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے، ہجری تقویم جو اسلامی کلنڈر کی

علامت بن چکا ہے، اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے، یہ دراصل اس یادگار واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو رسول کریم ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے سے متعلق ہے، اسلامی تاریخ میں ہجری کلنڈر کی شروعات سب سے پہلے خلیفہ ثانی امیر المومنین سیدنا عمر فاروقؓ نے کی، ۲۰ جمادی الثانی ۱۷ھ بروز جمعرات کو اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عمر فاروقؓ نے ہجری کلنڈر اختیار کیا، اس سے پہلے، ہجری تقویم نہ تو مرتب تھی اور نہ واقعات کا تعین ہجرت کے لحاظ سے کیا جاتا تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سال ولادت یا خانہ کعبہ پر ابرھہ کا ہاتھیوں کا لشکر لے کر آنے اور برباد ہونے کے سال سے دنوں اور واقعات کو بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے جب صحابہ کرام کے مشورہ سے ہجرت نبویؐ کو اسلامی کلنڈر کا نقطہ آغاز قرار دیا تو اللہ نے اسے اس طرح قبولیت عطا فرمائی جس طرح خود ہجرت مدینہ کو قبولیت عطا فرمائی تھی۔ لہٰذا محرم کا مہینہ جو اسلامی ہجری تقویم کا پہلا مہینہ ہے عام انسانوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو اس عظیم ہجرت کی یاد دلاتا ہے جس نے دنیا کی مذہبی تاریخ کا نقشہ تبدیل کر دیا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت ہوئی اور آپ کو رسول پاک ﷺ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دراصل ۲۶ ذی الحجہ کو ایرانی غلام فیروز نے آپؓ کو نماز کی حالت میں برچھی ماری، اسی کے زخم سے تین دن بعد آپؓ کی شہادت ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلسل تیرہ سال تک مکہ کے کافروں کو توحید کی طرف بلایا، کفر وشرک کو چھوڑ کر ایک اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی، اور ظلم و زیادتی کو چھوڑ کر عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرنے کی تعلیم دی، اس کے جواب میں کافروں نے نبی ﷺ، ان کے اہل خانہ اور ان کے ساتھیوں کو گالیاں دیں، الزام تراشیاں کیں، اذیتیں دیں، ابو طالب کی گھاٹی میں قید کیا، قتل کرنے کی سازش کی اور کلمۂ توحید اور اس کے لانے والے حضرت محمدؐ کو نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا، قرآن ان کی حالت کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (الانفال۔۳۰)
وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔

ظلم و جہالت کے اس طوفانی ماحول میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے اپنے ساتھیوں کو حبشہ یعنی موجودہ ایتھوپیا کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا، اور بعد میں آپ خود اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، تاکہ مسلمان ایمان پر قائم رہ سکیں، اسلام پر عمل کر سکیں، توحید کو پھیلا سکیں اور ظلم و جاہلیت کا نشانہ بننے سے محفوظ رہ سکیں۔ جس وقت اللہ کے حکم سے رسول پاکؐ اپنے عزیز ترین دوست سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرت کر رہے تھے اور کفار کے نمائندے آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے، اس وقت کا منظر اللہ تبارک وتعالیٰ اس طرح بیان کرتا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْهُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ (التوبۃ۔۴۰)

تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے، اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا

اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔

تین رات تک رسول پاکؐ اور حضرت ابو بکرؓ غار ثور میں پناہ گزیں رہے اور کفار کے ہرکارے سوا اونٹ کے لالچ میں ان کی خبر لانے میں سرگرداں رہے، بلکہ سراقہ بن جشم کی وہاں تک رسائی بھی ہوئی مگر وہ ایمان کی علامت دیکھ کر حضور سے امان نامہ حاصل کر کے واپس ہو گیا۔ پہاڑ کی ان تین راتوں میں حضرت ابو بکر کی چھوٹی صاحب زادی حضرت اسماءؓ دشوار راستوں سے گذرتی ہوئی اور اہل مکہ کے خوف سے لرزتی ہوئی کھانا اور پانی لے کر اندھیرے میں سرکار دو عالم تک پہونچتی رہی۔ دشمن اسلام ابو جہل نے اس معصوم بچی کو پکڑا اور اس سے ان کے والد اور حضرت محمدؐ کا حال اور پتہ پوچھا، مگر اسلام کی بہادر بیٹی انجان بنی رہی، لعین ابو جہل نے اسے اس زور کا طمانچہ مارا کہ اس کے کان کی بالی اڑ گئی مگر اسلام کی بیٹی نے دشمن کو پیغمبر اسلام کا ٹھکانہ بتا کے نہ دیا۔

تین دن غار ثور میں قیام کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنے آبائی وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ پہونچے تو مدینہ کے مرد و عورت اور بچوں نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا ،انصار مدینہ نے نبی ﷺ اور مہاجر مسلمانوں کی میزبانی اور ان کی بازآبادکاری میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں اور ان کا اس طرح اکرام کیا جیسے اپنے حقیقی بھائیوں اور رشتہ داروں کا کیا جاتا ہے، بلکہ انصار نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے زیادہ مضبوط اور مقدس ہے۔

نبی ﷺ نے مدینہ میں مسجد نبوی بنا کر ایک طرف تو مسلمانوں کی مرکزیت اور جائے عبادت کا انتظام کیا اور ہر مہاجر کو کسی ایک انصاری کا بھائی بنا کر ایک اٹوٹ ایمانی معاشرہ بنا دیا۔ آج دنیا میں ہر جگہ مہاجرین کا مسئلہ اہم بنا ہوا ہے۔ اگر کسی آبادی میں بڑی تعداد میں مہاجرین آ جائیں تو رہائش کے ساتھ روزگار کے مسائل اور سماجی ناہمواریوں کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر نبی ﷺ نے جس

ایمانی بصیرت اور پیغمبرانہ فراست سے اس مسئلہ کو حل کیا وہ آج کے حکمرانوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ رسول پاک ﷺ کی اس معاشرتی منصوبہ بندی کا بھرپور تعاون مدینہ کے انصار نے کیا، رسول پاک ﷺ کے ساتھیوں کے ہر آرام و آسائش کا خیال رکھا اور ان کو کاروبار زندگی میں اس طرح شریک کرلیا کہ انہوں نے مدینہ کو اپنا اصلی وطن بنالیا۔ اللہ نے ان انصار کی قربانیوں کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَايَجِدُوْنَ فِي صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر-۹)

جولوگ ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین صحابہؓ میں مواخات (بھائی چارہ) قائم کرنے کے بعد مدینہ کی آبادیوں بالخصوص یہودی قبائل کے ساتھ مل کر پُر امن بقائے باہم کا ایک معاہدہ کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے، اور اس طرح ایک اسلامی ریاست کی بنا ڈالی، مکہ کے کافروں نے مسلمانوں کی اس آبادی پر جب حملے کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام حملوں کو پسپا کردیا، جنگ بدر، جنگ احد جنگ خندق تک ان کے تمام حملے ناکام ہوئے یہاں تک کہ مکہ بھی فتح ہوگیا۔ ہجرت مدینہ دراصل

مسلمانوں کی برتری اور اسلام کی اشاعت کا فتح باب تھا، کفار نے اپنے ظلم وستم سے اگرچہ مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد اور نصرت کو ہجرت میں رکھدیا اور اس طرح اللہ کا وعدہ اپنے رسول محمد ﷺ پر پورا ہوا وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ۝(الصافات:۱۷۱-۱۷۳) اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

ہجرت ایک ایسی عبادت ہے جس کے متعلق رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

''ان الاسلام يهدم ما كان قبله وان الهجرة تهدم ما كان قبلها [۱] اسلام ماقبل کے سارے گناہ ختم کر دیتا ہے اور ہجرت ماقبل کے سارے گناہ ختم کر دیتی ہے۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اسلام کفر پر غالب آچکا تھا، اب ہر جگہ توحید کا کلمہ بلند کرنا آسان ہو چکا تھا البتہ آپ نے اسلام کی دعوت میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے جہاد کو باقی رکھا۔ فرمایا:

لاهجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية۔ [۲]

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں مگر جہاد اور نیت باقی ہے۔

آج بھی دنیا میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کرتے ہیں، بہت سے لوگ ظلم وستم سے تنگ آ کر اپنا وطن چھوڑتے ہیں اور زیادہ تر لوگ بہتر روزگار اور نوکری کی تلاش میں ہجرت کرتے ہیں، کم لوگ ہیں جو اپنا دین اور ایمان بچانے کے لیے ہجرت کرتے ہیں، حقیقی ہجرت تو یہی ہے کہ برائیوں سے نیکیوں کی طرف ہجرت کی جائے، جہالت سے علم کی طرف ہجرت کی جائے، کفر سے ایمان کی طرف ہجرت کی جائے، الحاد سے اسلام کی طرف ہجرت کی جائے، اللہ تعالیٰ ہمیں مہاجرین و انصار، صحابہؓ جیسا جذبہ ایمان وعمل نصیب کرے (آمین)۔

---

[۱] مسلم کتاب الایمان، فصل ان الاسلام یہدم ما کان قبلہ

[۲] بخاری، کتاب الجہاد، باب وجوب النفیر وما یجب من الجہاد والنیۃ۔

یوم عاشوراء اور شہادت امام حسینؓ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ
مَعَ الصَّابِرِیْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَن یُّقْتَلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ
اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (البقرہ-۵۴-۱۵۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے
والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں،
انھیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں ان
کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔

دسویں محرم الحرام کا دن اسلامی تاریخ میں یادگار دن ہے، یہ دن دو ایسے عظیم واقعات کی یاد دلاتا ہے جو حق و باطل کی معرکہ آرائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ پہلا واقعہ وہ ہے کہ جب فرعون کے ظلم وستم اور جھوٹی خدائی کا سلسلہ عروج کو پہونچا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی اصلاح وتنبیہ کے لیے اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے مبعوث فرمایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام نے فرعون کو راہ راست پر لانے کی پوری جتن کی، نو عظیم معجزات دکھائے پھر بھی وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریا کے پار ہو گئے اور فرعون اور اس کا لشکر پیچھا

کرتا ہوا دریا میں اترا تو ڈوب گیا، فرعون کی لاش آج بھی قاہرہ کے قومی میوزیم میں نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔

جس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات ملی اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ غرق آب ہوا تھا وہ عاشوراء کا دن تھا، بنی اسرائیل اس دن کو یوم نجات کی شکل میں منانے لگے اور اس دن وہ روزہ رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ مدینہ کے یہودی یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تھا، ہم ان کی تعظیم میں روزہ رکھتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہم موسیٰ علیہ السلام کے حق دار تم سے زیادہ ہیں اور پھر آپؐ نے مسلمانوں کو یوم عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔[۱]

جس طرح یہودیوں میں یوم عاشوراء کے روزہ کی روایت تھی اسی طرح جاہلیت کے زمانہ میں قریش میں روزہ رکھنے کی روایت تھی، مگر قریش کے روزہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا،[۲] اس دن کا روزہ نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ بھی رکھتے تھے، جب رمضان المبارک کا روزہ فرض ہوا تو آپ نے مسلمانوں کو اختیار دیا کہ جو چاہے یوم عاشوراء کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے، چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

> ''عاشوراء کے دن قریش جاہلیت کے زمانہ میں روزہ رکھتے تھے، اور محمد ﷺ بھی جاہلیت میں اس دن روزہ رکھتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا، جب رمضان کا روزہ

۱؎ ابوداؤد، کتاب الصیام، باب فی یوم عاشوراء

۲؎ بخاری، کتاب الحج، باب قول اللہ تعالیٰ جعل اللہ الکعبۃ

فرض ہوا تو عاشوراء کے روزہ کا حکم چھوڑ دیا گیا، جو چاہے روزہ
رکھے جو چاہے نہ رکھے"۔[1]

نبی ﷺ نے دسویں محرم کے ساتھ نویں محرم کو بھی روزہ رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر اگلے سال میں حیات رہا تو نویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا مگر اللہ تعالیٰ نے اسی سال ان کو اٹھالیا۔[2]

یوم عاشوراء کا روزہ اگرچہ فرض نہیں ہے مگر اسلام میں اس کی اہمیت کم بھی نہیں ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

"افضل الصیام بعد شهر رمضان شهر الله المحرم
وان افضل الصلوة بعد المفروضة صلاة من اليل "[3]

ماہ رمضان کے روزہ کے بعد سب سے افضل روزہ محرم الحرام کا
ہے اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز تہجد کی نماز ہے۔

دسویں محرم کا دوسرا یادگار واقعہ شہادت امام حسین ہے، یہ اسلامی تاریخ کا ایسا الم ناک حادثہ ہے کہ قیامت تک امت مسلمہ اس کا صدمہ سہتی رہے گی۔ حضرت امام حسینؓ جگر گوشہ رسول، فاطمہ زہرا کے لعل، اسی دن حق کی گواہی دیتے ہوئے میدان کربلا میں شہید ہوئے، مسلمانوں کے لیے رسول پاک کے بعد ان کے اہل بیت یعنی افراد خاندان سے محبت محض جذباتی معاملہ نہیں ہے بلکہ عقیدہ وایمان کا معاملہ ہے، اس پاکیزہ خاندان کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی خاندان پاکیزہ نہیں، اور اس عظیم خاندان کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی خاندان عظیم نہیں ہے، کیونکہ اس خاندان کے سربراہ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ان کے اہلِ خانہ یعنی ازواج و اولاد اور احفاد کی پاکیزگی کے سلسلہ میں خود قرآن کا یہ اعلان کافی ہے:

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصیام، باب فی یوم عاشوراء
[2] ایضاً
[3] ایضاً، باب فی صوم المحرم

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا. (الاحزاب-۳۳)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کردے۔

ان پاکیزہ اور برگزیدہ افراد خاندان کو اپنی جگہ بطور نمونہ چھوڑ کر رسول پاک ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے، آپ نے فرمایا:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی۔[1]

میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنا خاندان۔

اس پاکیزہ خاندان کا وہ عظیم المرتبت انسان، جس کو خود رسول پاک ﷺ نے ٹوٹ کر پیار کیا ہو مظلومانہ طریقہ سے شہید کیا جائے، امت اس کو کیسے بھول سکتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حسینؓ گرتے پڑتے آ گئے، وہ دونوں سرخ قمیص پہنے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے، ان دونوں کو اٹھایا اور منبر پر تشریف لائے، پھر آپ نے فرمایا اللہ نے سچ کہا ہے کہ ”تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں“ میں نے ان دونوں کو دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہوسکا، پھر آپ نے خطبہ جاری رکھا۔[2]

دسویں محرم کا دن امام حسین کی شہادت کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے کہ جیسے یہ مقدس لہو آج بھی تازہ اور گرم ہو، امام حسین کی شہادت کا جو لہو بہا ہے وہ مسلمانوں سے آنسوؤں کی شکل میں خراج عقیدت وصول کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

---

[1] مسلم، فضائل الصحابۃ

[2] ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب الامام یقطع الخطبۃ للأمر یحدث

لیکن ذرا سوچئے کہ امام حسینؓ نے کس بات کے لیے جنگ کا فیصلہ کیا، کس چیز کے لیے جان دی، اور کس مقصد کی خاطر جام شہادت نوش فرمایا؟ وہ مقصد یہ تھا کہ، خلافت اللہ کی امانت ہے، اس کا وراثت سے تعلق نہیں، اس کا تعلق استحقاق سے ہے، باپ کے بعد بیٹا ولی عہد ہو کر منصب خلافت پر فائز ہو یہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ تو ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی خلافت کا حق دار وہ ہے جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ صالح اور پرہیزگار ہے۔ قرآن کریم کی صراحت ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء-۱۰۵)

بے شک زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

امام حسینؓ نے جس شخص کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھا، اس کے خلاف خروج کیا، وہ جانتے تھے کہ فوج حکمراں کے پاس ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ حکومت کی تلوار کے خوف سے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیں گے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اہل بغداد عزم و حوصلہ کا مظاہرہ نہیں کریں گے پھر بھی وہ مٹھی بھر صاحب عزیمت مومنوں کی جماعت کو لے کر میدان کربلا کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ یزیدی فوج کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ امام حسین کی شہادت اسلام کو زندہ و تابندہ رکھنے کی انقلابی تحریک کا آغاز تھا۔ اس تحریک کے علم بردار ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مصلحت اندیش انسان کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی فوج سے مٹھی بھر مسلمانوں کے ٹکرانے کا حاصل ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہے، مگر جو لوگ حق کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ رسول ﷺ کی سنت مطہرہ کو مسخ ہونے سے بچانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں پر صالح اور متقی افراد کی خلافت کے آرزومند ہیں، وہ جانتے ہیں کہ حق کے طرف دار ہر زمانہ میں کم رہے ہیں اور باطل ہمیشہ لاؤ لشکر میں آگے رہا ہے۔ مگر ہر زمانہ میں

صاحب عزیمت لوگ اٹھتے رہے ہیں اور حق و باطل کا فرق واضح کرنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے ہیں۔ ایسے تمام لوگ جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی خاطر شہید ہوئے، ان کی روحوں کو سلام ہو، ان کا روحانی پیغام عام ہو، اور ان کا جذبۂ حق مسلمانوں کے جذبات کا امام ہو، ان تمام شہداء اسلام میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت خصوصی مرتبہ کی حامل ہے اور امت مسلمہ کو یہ پیغام دیتی ہے۔

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی ۔۔۔ آزادی حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر تیرا نیزے کی نوک پر ۔۔۔ لیکن تو فاسقوں کی اطاعت نہ کر قبول

حضرت امام حسینؓ کی شہات کا تقاضا سینہ کوبی اور گریہ وزاری نہیں ہے بلکہ اس عزم وحوصلہ کو پیدا کرنا ہے جو حق کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، اس سنت کو زندہ کرنا ہے جس پر امام حسینؓ نے جان دی، اور اس پیغام کو عام کرنا ہے جس کے لیے امام ذی احترام نے جام شہادت نوش فرمایا۔ کیونکہ حق و باطل کی کش مکش ہمیشہ جاری ہے اور ہر زمانہ میں امام حسینؓ کے نقش قدم کے اتباع کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام پر قائم رہنے اور اس کے لیے قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

تعلیم کی اہمیت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ . خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ . الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق: ۵-۱)

پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

دنیا کے دوسرے تمام مذاہب کے مقابلہ میں دین اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنی شروعات علم سے کی ہے، مذہب کی بنیاد ایمان وعمل ہے اور ایمان وعمل کی بنیاد علم ہے، چنانچہ سب سے پہلے جبریل امین جو وحی لے کر محمد ﷺ کے پاس تشریف لائے وہ سورہ العلق کی ابتدائی آیات تھیں۔ اس وقت محمد ﷺ غار حرا میں ذکر وفکر میں مشغول تھے، جبریلؑ نے اللہ کا پیغام پہونچایا اور یہاں سے رسالت محمدی اور شریعت محمدیؐ کا آغاز ہوا،

ان چھوٹی چھوٹی پانچ آیات میں براہ راست تعلیم پر زور دیا گیا ہے، تین مرتبہ علم کا دو مرتبہ پڑھنے کا اور ایک مرتبہ لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے، قرآن کریم میں علم کی اہمیت پر دوسرے مقامات میں بھی زور دیا گیا ہے، یہ تعلیم ایسے وقت اور ایسے سماج

میں دی گئی تھی جب لوگ جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے، جن کے پاس علم تھا وہ بھی اس کی شمع بجھا کر اندھیرے میں اپنا وجود کھو چکے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد ﷺ کو آخری رسول بنایا اور مسلمانوں کو آخری امت بنایا۔ اس امت کو دنیا میں باقی رہنے اور ترقی کرنے کے لیے دو بنیادی نظریے عطا کیے، ایک علم اور دوسرا ایمان۔ یہی دونوں چیزیں امت مسلمہ کی نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہیں، اور انہیں بنیادوں پر امت ترقی کر سکتی ہے، یہ دونوں چیزیں دراصل دو روشنی ہے، ایک اندر کی روشنی اور ایک باہر کی روشنی، ایمان اندر کی روشنی ہے اور علم باہر کی روشنی، اگر یہ دونوں موجود ہوں تو امت اپنی ترقی کی راہ آسانی سے دیکھ سکتی ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک غائب ہو جائے تو راستہ نظر نہ آئے گا منزل تک امت پہونچ نہ پائے گی اور وہ ذلت وپستی کا شکار ہو جائے گی، اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے،

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ
وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْر (المجادلہ۔ ۱۱)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اہل علم ہیں اللہ ان کے
مرتبے بلند کرتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ نے ترقی کا یہ عالمی اصول مسلمانوں کو دیا تھا اور جب تک مسلمان علم و ایمان کے مشعل بردار رہے دنیا کی امامت کے حق دار رہے اور جب ان کے ہاتھ سے یہ روشنی گئی ذلت وخواری سامنے آ گئی۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا، ارشاد فرمایا

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم [۱]
علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

اقوام متحدہ نے علم حاصل کرنے کو انسان کا حق قرار دیا ہے مگر اسلام کا امتیاز

---

[۱] ابن ماجہ، مقدمہ

یہ ہے کہ اس نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے، حق اور فرض میں فرق یہ ہے کہ حق چھوڑا جاسکتا ہے، مگر فرض چھوڑا نہیں جاسکتا، اگر کوئی اپنا حق نہ لے تو اس پر زور زبردستی نہیں، مگر کوئی اپنا فرض انجام نہ دے تو اس سے باز پرس ہوگی اور سزا دی جائے گی، چنانچہ علم حاصل نہ کرنا اور اپنے بچوں کو تعلیم سے محروم کرنا ایسا گناہ ہے جس پر مواخذہ ہوگا اور سزا دی جائے۔

رسول پاک ﷺ نے اس فرض کو ادا کرنے والوں کو یعنی تعلیم حاصل کرنے والوں کو اللہ کا مہمان اور اللہ کا مسافر کہا ہے جو براہ راست اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے اور دنیا کی ہر شے ان کے لیے رحمت کی دعائیں کرتی ہیں، چنانچہ حضرت ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو علم حاصل کرنے کے لیے راہ طے کرتا ہے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے، فرشتے طالب علم کے لیے پر بچھا دیتے ہیں، عالم کے لیے آسمان و زمین کی ہر چیز مغفرت طلب کرتی ہے۔ یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی، عالم کی فضیلت عبادت گذار پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر، علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں، بے شک انبیاء دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں، جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ حاصل کرلیا"۔ [1]

علم کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات کی پہچان ہو جائے، اپنے معاشرہ اور کائنات کی پہچان ہو جائے اور اپنے پیدا کرنے والے اللہ کی اور اس کے احکام کی پہچان ہو جائے، اس علم کے دو ذریعے ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ کی وحی جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں کی پاس آتی ہے اور دوسرا انسان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ جس کے لیے

---

[1] ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ

اللہ نے عقل وحواس انسان کو عطا کیے ہیں۔ یہ دونوں ذرائع ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو وسیع اور اتھاہ سمندر بنایا ہے، جو شخص جتنا بھی علم حاصل کرے وہ کم ہے، اسلام نے علم کو دین و دنیا کے دو خانوں میں تقسیم نہیں کیا ہے، یہ تقسیم بعد کے زمانہ میں ضرورتوں کے لحاظ سے کی گئی ہے، ہر وہ علم جو انسان کو اللہ، کائنات اور اپنی ذات کی معرفت عطا کردے دین کا علم ہے اور ہر وہ علم جو اسے اس معرفت سے دور کردے وہ لادینی علم کہلائے گا۔

دنیا اور آخرت دونوں مومن کے لیے ہے، اس لیے دونوں کی معرفت مومن کے علم کا مقصد ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہمیں یہ دعا سکھائی ہے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ-۲۰۱)

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں عذاب جہنم سے بچا۔

یہ دعا بہت جامع ہے، اس میں دونوں جہان کی سعادت شامل ہے، اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس وقت ہمارے ملک میں علم کے دو دھارے ہیں ایک دینی علم کا اور دوسرا عصری علم کا۔ علم دین کے حامل عصری علم سے واقفیت نہیں رکھتے اور عصری علم کے حاملین دینی علم سے واقفیت نہیں رکھتے، یہ مسلمانوں کے لیے نہ مناسب ہے اور نہ اسلام کے مزاج کے مطابق ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کے عطا کردہ علم کو چھوڑ دینا بڑی بدنصیبی ہے، اور عصری علم کی ضرورت کو نظر انداز کردینا پست ذہن کی علامت ہے۔

جنگ بدر میں جو کفار مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ان کے بارے میں صحابہ کرام کے مشورہ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طے فرمایا کہ ان کو تاوان

اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، مگر جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے کہا گیا کہ ہر قیدی دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے تو اسے بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا جائے گا، غور کرنے کی بات ہے کہ رسول پاکؐ نے کافروں کو مسلمان بچوں کا معلم بنایا اور ان سے وہ تعلیم دلوائی جو ان کے پاس تھی، یہ سنت مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ غیر مسلموں کے پاس جو علم ہے اسے بھی حاصل کرنا ہمارے دین کا تقاضا ہے، کیونکہ علم مومن کی میراث ہے، اس کا ہتھیار اور اس کا زیور ہے، یہی مطلب ہے رسول اللہ کی اس حدیث کا، جس کی روایت حضرت ابوہریرہؓ نے کی ہے۔

کلمة الحکمة ضالة المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا[۱]

دانائی کی بات مومن کا گم شدہ سامان ہے، وہ جہاں اسے پائے
اس کو حاصل کرنے کا وہ زیادہ حق دار ہے۔

رسول پاک ﷺ کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمارے اسلاف نے یونان، روم اور ہند کے براہمنوں کے علم کو حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ان علوم کو اتنی ترقی دی کہ وہ ان علوم کے امام بن گئے، بہت سے علوم خود انہوں نے ایجاد کر ڈالے، اور دنیا کی ترقی کا ذریعہ بنے، طب یونانی کو مسلمانوں نے ترقی دی، حساب، الجبرا، جغرافیہ کو مسلمانوں نے ترقی دی، علم تاریخ اور سماجیات کے اصول مسلمانوں نے مرتب کیے، ہیئت اور فلکیات کو مسلمانوں نے ترقی دی، جراحی و سرجری، اور قورنیہ (علم چشم) مسلمانوں نے ایجاد کیے، اور یہ وہ مسلمان تھے جو قرآن و سنت کا بھی پورا علم رکھتے تھے۔ اس وقت پھر ضرورت ہے کہ مسلمان تعلیم حاصل کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنالیں اور اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، علم کے ذریعہ ان کو دولت، عزت، روشنی، وقار اور ترقی حاصل ہوگی۔ قدرت کے قانون میں روشنی اور تاریکی برابر نہیں ہوسکتی، علم اور جہالت برابر نہیں ہوسکتی، اسی طرح علم والے

---

[۱] سنن ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ

اور جاہل برابر نہیں ہوسکتے ،علم دنیا وآخرت کی سعادت عطا کرتا ہے اور جہالت ان ساری چیزوں سے انسان کو محروم کردیتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ (الزمر – ۹)

آپ کہد یجیے کہ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے برابر ہوسکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو عقل مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

علم اور جہالت کا یہ فرق دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گا ،اہل علم ترقی کریں گے اور جاہل پستی کی طرف جائیں گے۔یہ پستی ،سماجی ،ملکی ہر طرح کی ہوسکتی ہے،حضرت مصعب بن زبیرؓ نے اپنے صاحب زادے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''بیٹے علم حاصل کرو اگر تمہارے پاس مال ہے تو علم تمہارا جمال ہے،اور اگر تمہارے پاس مال نہیں ہے تو علم تمہارا مال ہے''

اپنے بچے بچیوں کو اچھی تعلیم دینا ماں باپ کی ذمہ داری ہے اور اسی کے ساتھ بہترین تحفہ بھی ہے۔رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ما نحل والد ولد امن افضل ادب'' [1]

(کوئی والد اپنی اولاد کو عمدہ تعلیم سے بہتر تحفہ نہیں دیتا۔)

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو علم وایمان کے نور سے منور کردے اور ان کو توفیق دے کہ وہ اپنے بچوں کو علم سے آراستہ کریں۔(آمین)

---

[1] سنن ترمذی،ابواب البر والصلۃ

کفر و شرک کی حقیقت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِیْدًا۔ (النساء-۱۱۶)

اللہ اس کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم تر جسے چاہے معاف کر سکتا ہے، جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔
سورہ النساء کی آیت ۴۸ میں بھی یہی مضمون دہرایا گیا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، وہ بندوں کے سارے گناہ معاف کر سکتا ہے، مگر شرک ایسا گناہ ہے کہ وہ کبھی اس کو معاف نہیں کرے گا۔ شرک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور حقوق و اختیارات میں کسی اور کو شریک اور ساجھی قرار دینا، ذات میں شرک کا مطلب ہے ایک سے زیادہ خدا ماننا، جیسے زرتشتی لوگ روشنی اور تاریکی کا الگ الگ خدا مانتے ہیں یا جیسے ہندوستان کے مشرکین ان گنت دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔

صفات میں شرک کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی حمیدہ صفات کو اللہ کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرنا، مثلاً یہ سمجھنا کہ موت و حیات کا مالک اللہ کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے، پانی کوئی اور برساتا ہے، روزی کوئی اور دے سکتا ہے وغیرہ اور حقوق و اختیارات

میں شرک کا مطلب یہ ہے کہ جو حق اللہ کا ہے وہ کسی اور کو دینا، مثلاً قربانی کسی اور کے نام پر کرنا، نذر و نیاز کسی اور کے نام پر کرنا، مدد اور دعا کسی اور سے مانگنا وغیرہ۔

شرک کی یہ تمام شکلیں بدترین گناہ ہیں۔ ایسے گناہ کی اللہ کے یہاں کوئی معافی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرسکتی کہ بندہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کر کے اس کی شان اور مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کرے۔ جو لوگ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اللہ کی ناراضگی ہمیشہ کے لیے ان پر مسلط ہو جاتی ہے جب تک کہ وہ توبہ نہیں کر لیتے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ان تجعل للہ ندا وھو خلقک ''[۱] تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جبکہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے۔

شرک انسانی عقل وفطرت کے خلاف ایک گھٹیا عقیدہ ہے، جس کی کوئی معقولیت اور دلیل نہیں ہے۔ شرک کر کے انسان اپنی حیثیت اور شرافت کو کم کر لیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیشتر مخلوق سے افضل اور اشرف بنایا ہے، جب انسان دوسری مخلوق کو معبود اور حاجت روا بناتا ہے تو وہ اپنی عزت وشرافت کو بھی گھٹا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کے بودے پن کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَاباً وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ وَإِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئاً لَا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ. مَاقَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ (الحج:۷۴-۷۳)

اے لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو، جن معبودوں کو تم

---

[۱] ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ الفرقان

خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا
چاہیں تو نہیں کر سکتے، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے
جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے، مدد چاہنے والے بھی کمزور
اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور، ان لوگوں نے اللہ کی
قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے، بے شک
اللہ قوت اور عزت والا ہے۔

جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے بظاہر اچھے کام بھی رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دنیا میں بھلائی کے بہت سے کام ہیں جو مشترک لوگ کرتے ہیں، ان کا فائدہ دنیا میں تو ہو سکتا ہے، آخرت میں ان اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا، کیونکہ شرک اچھے کام کا وزن گھٹا دیتا ہے اور ان کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ن اشْتَدَّتْ بِهِ
الرِّيْحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى
شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيْدُ۔ (ابراہیم۔۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال
اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو،
وہ اپنے کام کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے، یہی پرلے درجہ کی
گمراہی ہے۔

ایک دوسری آیت میں مزید وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ
لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (الزمر۔۶۵)

(اے محمد ﷺ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام
انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جاچکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا
عمل ضائع ہوجائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔

شرک انسانی عقل و ذہن کو مطمئن نہیں کرسکتا، مشرک اپنے عقیدہ کے باطل ہونے پر اگر غور کرے تو اس کا باطل ہونا ضرور واضح ہوجائے گا، کیونکہ شرک کا سارا معاملہ اوہام، اندھی تقلید اور باپ دادا کے رسم و رواج پر چلتا ہے، جسے فطرت سلیم قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ شرک کو اللہ تعالیٰ نے ظلم عظیم کہا ہے، حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت قرآن پاک میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَاِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ
اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (لقمان-۱۳)

اور یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کررہا تھا، اس نے کہا بیٹا!
اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ظلم کہتے ہیں کسی پر زیادتی کرنے اور کسی کا حق مارنے کو، شرک کرنے والا اپنے پروردگار اور خالق و مالک کا حق بندگی مار کر غیر اللہ کو دیتا ہے اور ایسے لوگوں یا ایسی چیزوں کو اللہ کے برابر کردیتا ہے جو خود اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور اللہ کی محتاج ہیں۔ اسی طرح شرک کرکے انسان اپنی عزت نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کیونکہ خود سے بھی کم تر چیزوں کو اپنا معبود اور مسجود بنالیتا ہے۔

شرک کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اللہ کے لیے ازواج و اولاد یعنی بیوی اور بیٹا بیٹی وغیرہ ثابت کرے، جس طرح یونان اور ہندوستان کے بت پرستوں نے اور عیسائیوں نے خدا کے لیے ازواج و اولاد کا عقیدہ اختیار کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا۔ تَكَادُ

السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۔(مریم،۸۸-۹۴)

وہ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سخت بے ہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو، قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں اس بات پر کہ لوگوں نے رحمان کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا، رحمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، زمین و آسمان کے اندر جو بھی ہیں، وہ سب اللہ کے سامنے بندہ کی حیثیت سے پیش ہوں گے، سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے توحید کا دعویٰ کرتے ہیں، اللہ پر ایمان بھی رکھتے ہیں، مگر اپنے ایمان کے ساتھ مشرکانہ اعمال بھی ملا دیتے ہیں، ان کا ایمان مشرکانہ عقیدہ اور عمل کے ساتھ کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا، کیونکہ شرک اور ایمان ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان کے ساتھ شرک کی ذرا بھی آمیزش ایسی ہے جیسے کسی نے دودھ میں پیشاب کا قطرہ ڈال دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کی آمیزش کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ۔(یوسف-۱۰۶)

ان میں سے اکثر لوگ اللہ کو مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔

اس آیت کی کچھ وضاحت اس حدیث سے ہو سکتی ہے جس کی روایت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''میری امت کے ستر ہزار لوگ بلاحساب وعذاب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں کراتے، جانوروں کو داغتے نہیں، بدشگونی نہیں کرتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں''۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

انا اغنی الشرکاءِ من الشرک مَن عَمِلَ عملا اشرک فیه غیری ترکته وشرکه.[2]

میں شرک کے معاملہ میں تمام شرکاء سے بے نیاز ہوں جس نے کسی عمل میں میرے علاوہ کسی کو شریک کیا میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

شرک کی طرح الحاد بھی ناقابل معافی گناہ ہے، الحاد کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی معبودیت اور حاکمیت کا انکار کرنا، موجودہ زمانہ میں شرک کی طرح الحاد میں بھی بہت سے لوگ مبتلا ہیں، بلکہ زیادہ تر پڑھے لکھے اور عقل مند لوگ ہی الحاد کا شکار ہیں۔ مشرک کا جو انجام ہوگا وہی انجام ملحد کا بھی ہوگا کیونکہ الحاد اللہ سے بغاوت ہے اور اس کے وجود کا انکار ہے، اس کی سزا نارِ جہنم ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سارے انسانوں کو کفر وشرک اور الحاد سے بچائے۔ (آمین)

---

[1] بخاری، کتاب الطب، باب من لم یرق

[2] مسلم، کتاب الزہد، باب تحریم الریاء

اخلاص فی الدین

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوْا اللّٰـهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ
حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ
الْقَیِّمَةِ ۔ (البینۃ-۵)

اور اُن کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن صخر روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

ان اللـه لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر
الی قلوبکم واعمالکم۔[1]

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کے عقیدہ اور عمل کی قبولیت کا تعلق نیت اور اخلاص سے ہے، جیسی نیت ہوگی ویسا ہی نتیجہ ہوگا، درست عقیدہ اور حسن عمل کا اختیار کرنا مومن کی کامیابی کا راستہ ہے مگر عقیدہ و عمل اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو، بہت مشہور حدیث ہے جس کے راوی حضرت عمر فاروقؓ ہیں اور جسے امام بخاری اور امام

---

[1] مسلم، کتاب البر، باب تحریم ظلم المسلم

مسلم دونوں نے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الاعمال بالنیة وانما لکل امرءٍ مانوی ومن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته لدنیا یصیبها او امرة ینکحها فهجرته الی ماهجر الیه۔[1]

عمل کی مقبولیت نیت پر منحصر ہے اور ہر انسان کو وہی ملے گا جو اس کی نیت ہوگی، جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی اور جس نے ہجرت دنیا کمانے کے لیے کی یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے کی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے شمار کی جائے گی۔

انسان بہت سے نیک اعمال کرتا ہے، ان کے پیچھے انسان کا کوئی مقصد اور اس کی نیت موجود ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کی نیت کسی انسان کو خوش کرنے کی، لوگوں کی نظر میں سرخرو بننے کی، عہدہ و منصب حاصل کرنے کی یا دنیا کا کوئی اور فائدہ حاصل کرنے کی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا اے اللہ کے رسول جہاد فی سبیل اللہ کیا ہے؟ کیونکہ کہ ہم میں سے بعض لوگ غصہ کی وجہ سے جنگ کرتے ہیں، بعض لوگ عصبیت اور اپنے قبیلہ کی حمایت کی وجہ سے جنگ کرتے ہیں یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل الله۔[2]

جس نے اس لیے جنگ کی کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، اسی نے فی سبیل اللہ جہاد کیا۔

اگر کوئی مسلمان نیکی اور بھلائی کا چھوٹا سے چھوٹا کام کرتا ہے مگر اس کی نیت خالص

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب ماجاء ان الاعمال بالنیة

[2] بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی ہے، تو اللہ کے نزدیک اس کو پورا اجر ملے گا، یعنی کام کا بڑا اور چھوٹا ہونا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت عمل میں اخلاص کو حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ کی خلافت میں قادسیہ کی جنگ ہوئی، مسلمانوں کا مقابلہ ایران کی زبردست حکومت سے ہوا، مسلمانوں کو اللہ نے مجوسیوں پر فتح عطا کی، مال غنیمت میں کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آئے، امیر لشکر کے پاس جب مال غنیمت کا ڈھیر لگایا گیا تو اس میں کسریٰ کا قیمتی تاج نہیں تھا اور نہ کسی کو معلوم تھا کہ وہ کس کے ہاتھ لگا ہے، ایک شخص خاموشی سے کسریٰ کا تاج لے کر آیا اور مال غنیمت کے ڈھیر میں جمع کر کے واپس جانے لگا، امیر لشکر نے کہا اے شخص تو نے اتنا قیمتی سامان جمع کیا ہے اپنا نام تو بتا، اس مسلمان فوجی نے کہا میں نے جس اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے یہ کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی بندہ کا عمل قبول کرتا ہے جس میں اخلاص ہو۔ قرآن پاک میں منافقوں کے ایمان کی کمی اور عملی سرگرمیوں پر گرفت کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُوْلٰئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ سَوْفَ یُؤْتِی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْراً عَظِیْماً۔ (النساء-۱۴۶)

البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

جس طرح انسان بہت سے نیک کام کرتا ہے اور نیت خالص نہ ہونے کی وجہ سے سب برباد ہو جاتے ہیں اسی طرح مومن کو کبھی عمل کرنے کا موقع نہیں ملتا مگر اس کی نیت میں اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے عمل کا اجر عطا کر دیتا ہے، حضرت

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب ہم لوگ غزوہ تبوک سے واپس لوٹ رہے تھے تو حضور پاکؐ نے فرمایا:

''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مدینہ میں رہ گئے، جہاد میں شریک نہ ہوسکے، نہ تو ہمارے ساتھ کسی گھاٹی میں اترے اور نہ کسی وادی میں آئے، مگر وہ لوگ (اجر میں) ہمارے ساتھ ہیں، ان کو بیماری نے روک رکھا تھا'' ۱؎

سہل بن حنیف اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سال الله الشهادة بصدق بلّغه الله منازل الشهداء، وان مات على فراشه ۔ ۲؎

جس نے اللہ تعالیٰ سے صدق دل کے ساتھ شہادت کی دعا مانگی، اللہ تبارک وتعالیٰ اسے شہیدوں کا اجر عطا کرے گا اگرچہ اسے اپنے بستر پر ہی موت آئے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے، بندہ کے ہر عمل اور حرکت پر اس کی نظر ہے۔ بندہ کی چھپی اور کھلی ساری باتیں اس کے سامنے ہیں، وہ بندہ کے دلوں کے حالات اور نگاہوں کی گردش کو بھی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ (آل عمران-۲۹)

اے نبی! لوگوں کو خبر دار کردو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، اسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہرحال اسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اللہ ہر چیز پر حاوی ہے۔

۱؎ بخاری، کتاب الجہاد

۲؎ مسلم، کتاب الامارۃ، باب استحباب طلب الشہادۃ فی سبیل اللہ

اگر ایک مزدور یا ملازم کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مالک اسے دیکھ رہا ہے تو وہ اپنا کام محنت، مستعدی اور خوش اسلوبی سے کرتا ہے۔ اور اگر اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کا مالک موجود نہیں ہے تو وہ اپنے کام میں غفلت اور لاپرواہی برتتا ہے۔ اسی طرح بندہ کو خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس ہو جائے تو اس کا ہر عمل درست ہو جائے بلکہ اس کے عمل میں حسن پیدا ہو جائے۔ اخلاص نیت کا یہی وہ نکتہ ہے جسے حضرت جبریل امینؑ نے رسول کریم ﷺ کو بتایا تھا، جب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ تو حضرت جبریلؑ نے بتایا:

"ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"[1]

اللہ کی عبادت اس طرح کیجیے کہ آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں اگر یہ کیفیت نہ ہو تو اتنی ضرور ہو کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔

عبادت میں روزہ، نماز، حج، زکوۃ، جہاد، تعلیم، خدمت وغیرہ ساری عبادتیں شامل ہیں۔ اگر مومن ان سارے کاموں میں اللہ کو سامنے رکھے تو، اس کی عبادت شرف قبولیت سے محروم نہیں رہے گی۔

مصیبت کے دنوں میں وہ اعمال کام آتے ہیں جو صرف اللہ کی رضا کے لیے کیے گئے ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تین آدمی سفر کر رہے تھے، رات ہوئی تو ایک غار میں رات گذارنے کے لیے داخل ہو گئے۔ پہاڑ کی ایک چٹان لڑھک کر غار کے منہ پر آ کر رک گئی اور نکلنے کا راستہ بند ہو گیا، وہ تینوں آپس میں بولے، اب ہم لوگ اس غار سے اسی صورت میں نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے صالح اعمال کے واسطے سے دعا کریں۔ چنانچہ ایک نے اس طرح دعا کی، الٰہی: میرے بوڑھے والدین تھے، میں ہمیشہ ان کو اپنے مال و اولاد پر مقدم رکھتا تھا، ایک دن میں لکڑی کاٹنے جنگل گیا، لوٹا تو دیر ہو چکی تھی، میں نے ان کے لیے دودھ دوہا مگر وہ سو

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام

چکے تھے، ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لیے میں کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی، میرے پاس میرے بچے بھوک سے بلکتے رہے، جب والدین اٹھ گئے تو میں نے ان کو دودھ پلایا۔ میرے اللہ اگر میں نے تیری رضا حاصل کرنے کے لیے یہ کیا تھا تو آج اس چٹان سے نجات دے، اللہ نے چٹان کو تھوڑا کھسکا دیا۔

دوسرے نے کہا: الٰہی! میری چچازاد بہن تھی جسے میں بہت پیار کرتا تھا میں نے اس سے برائی کا ارادہ کیا مگر وہ باز رہی، ایک مرتبہ قحط سالی ہوئی وہ مجھ سے پیسہ مانگنے آئی، میں نے ایک سو بیس دینار اسے دیے اور بدکاری کا وعدہ لے لیا، جب میں نے اسے لٹا دیا تو اس نے کہا "اللہ سے ڈر اور اس کی مہر نہ توڑ" میں نے اسے چھوڑ دیا اور پیسہ بھی واپس نہ لیا، اگر میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا تھا تو آج اس پتھر سے نجات دے۔ اللہ نے پتھر کو اور کھسکا دیا۔

تیسرے نے التجا کی، اے اللہ میرے کچھ مزدور تھے، میں نے سب کو مزدوری دے دی مگر ایک مزدور اپنی مزدوری میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا، میں نے اس کی مزدوری کا پیسہ کاروبار میں لگا دیا یہاں تک کہ وہ بہت ہوگیا، مدت بعد وہ لوٹا اور اپنی مزدوری طلب کی، میں نے کہا یہ سب اونٹ، گائے، بکری، غلام تیرے ہیں۔ اس نے کہا اللہ کے بندے مذاق نہ کر مزدوری دے، میں نے کہا، مذاق نہیں یہ سب تیرا ہے، تب وہ سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا اور کچھ نہ چھوڑا۔ اے اللہ اگر میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا ہے تو اس مصیبت سے نجات دے۔ اللہ نے پتھر کو پورا کھسکا دیا اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خالص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے جو عمل کیا جائے وہ آخرت میں نفع بخش تو ہوگا ہی، دنیا میں بھی اس کے اثرات اور ثمرات اللہ ظاہر کر دیتا ہے۔ اللہ ہمیں اخلاص فی الدین کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ۔

اللہ پر ایمان

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیَ اِلَیْهِ اَنَّهُ لَآ
اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنَ۔ (الانبیاء-۲۵)

اے محمدؐ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے
کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

دنیا میں جتنے نبی اور رسول آئے سب نے ایک ہی بات کی انسانوں کو دعوت دی، وہ یہ کہ ایک اللہ کو معبود مانیں اور اسی کے آگے سر جھکائیں، اسی کو ایمان باللہ کہتے ہیں، یہی توحید ہے اور اسی بنیادی کلمہ کی تشریح پورا قرآن کرتا ہے، شرعی اعتبار سے ایمان کا مطلب ہے اللہ کو دل سے ایک ماننا، زبان سے اس کا اقرار کرنا اور عمل سے اس کی تصدیق کرنا۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کو اکیلا خالق، مالک، رازق اور معبود تسلیم کر کے اپنا پورا وجود اس کے حوالہ کر دینا اور اس کے حکم پر سر جھکا دینا۔

توحید کے دو پہلو ہیں ایک توحید ربوبیت اور دوسرے توحید الوہیت، توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو کائنات کا پیدا کرنے والا تسلیم کیا جائے، وہ خالق و مالک اور رازق ہے، اسی نے یہ کائنات بنائی ہے اور اسی نے رزق رسانی کا سامان کیا ہے، اس کی شکر گذاری کا تقاضا ہے کہ اسی کے آگے سر جھکایا جائے اور ہر چیز اسی سے مانگی جائے، قرآن پاک میں توحید ربوبیت کی بہت سی آیات ہیں، ایک آیت میں ہے:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَاداً وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔(البقرہ-۲۱،۲۲)

لوگو! اپنے اس رب کی بندگی کرو جو تمہارا اور تم سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کا خالق ہے، شاید کہ تم بچ جاؤ، وہ رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا، آسمان کی چھت بنائی اور اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل تمہارے رزق کے لیے پیدا کیے، پس تم جان بوجھ کر اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

یعنی کائنات کی ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق و مالک اللہ ہے۔ عرب کے ایک بدو سے کسی نے اللہ کی وحدانیت کا ثبوت پوچھا تو اس نے برجستہ کہا:

''سبحان الله ! اونٹ کی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، قدم کے نشان چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں، یہ برجوں والا آسمان، یہ پھیلی ہوئی زمین اور یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کیا اللہ تعالیٰ کا پتہ نہیں دیتے؟'' [۱]

ایک شاعر نے توحید کے اس نکتہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر شے ترے جمال کی آئینہ دار ہے
ہر شے پکارتی ہے تو پروردگار ہے

قرآن کریم میں بھی آثار کائنات کو اللہ کی وحدانیت کی معرفت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ اِخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (یونس-٦)

یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، جلد اول، ص ۵۸

نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے ان لوگوں کے لیے
نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں۔

توحید الوہیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا پرستش کے لائق ہے، وہ معبود حقیقی ہے، صرف اسی کی عبادت بجالانی چاہیے، اس کے علاوہ کسی اور معبود کو ماننا اور سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰـهِ اِلٰهاً آخَرَ لاَ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْئٍ
هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ.
(القصص-۸۸)

اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، اللہ کے سوا کوئی معبود
نہیں ہے، ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اللہ کی ذات کے،
حکمرانی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَهُوَ اللّٰهُ لاَ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ
وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔(القصص-۷۰)

وہی ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے لیے حمد ہے
دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی
طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔

اللہ کے علاوہ کسی شخص یا چیز کو سجدہ کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اولیاء، انبیاء اور فرشتے جو اللہ کے مقرب بندے ہیں ان کو بھی سجدہ کرنا جائز نہیں۔ جو شخص تمام معبودوں کا انکار کر کے اللہ وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے درحقیقت وہی شخص جنت میں جانے کا مستحق ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما من عبد قال لا اله الا الله ثم مات علی ذلک الا
دخل الجنة ۔[1]

جو بندہ لا الـــه الا الـلـــه کا اقرار کرتا ہے اور اس کا انتقال اسی
ایمان پر ہوتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

ایمان باللہ کے بہت سے مطالبے اور تقاضے ہیں، جن میں سے کچھ اہم تقاضے حسب ذیل ہیں:

(۱) ایک تقاضا یہ ہے کہ بندہ اللہ سے محبت کرے اور ہر چیز سے زیادہ اس کو چاہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَاداً يُّحِبُّوْنَهُمْ
كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ . (البقرہ-۱۶۵)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مقابل بناتے
ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کرنی
چاہیے اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ سے سب سے زیادہ
محبت کرتے ہیں۔

اللہ کی محبت بندہ کے اندر اطاعت اور فرماں برداری کا شوق پیدا کرتی ہے۔

(۲) ایمان کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور اس کی خشیت بندہ کے دل میں موجود ہو، مومن کی علامت قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ ۔ (المومنون-۵۷)

جو لوگ اپنے رب کی خشیت سے ڈرتے ہیں۔

اللہ کی خشیت انسان کو گناہوں سے باز رکھتی ہے اور ایمان کی حفاظت کرتی ہے۔

(۳) ایمان کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اللہ کی یاد سے ہمیشہ اپنے دل کو روشن

---

[1] بخاری، کتاب اللباس

رکھے، اللہ کی یاد بندہ کے دل کو قوت بخشتی ہے، اس کے ذہن کو منور کرتی ہے اور اللہ سے تعلق مضبوط رکھتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّقُعُوْداً وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرہ-۱۹۱)

جو لوگ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں، پروردگار یہ سب کچھ تو نے بے کار نہیں پیدا کیا ہے، تو پاک ہے، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

(۴) ایمان کا چوتھا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے ایمان کو خالص اور بے آمیز رکھے، اس کے ساتھ شرک اور ظلم کی آمیزش نہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُھْتَدُوْنَ۔ (الانعام-۸۲)

حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔

(۵) ایمان کا پانچواں تقاضا یہ ہے کہ بندہ ایمان لانے کے بعد کسی طرح کا شک و شبہ اپنے دل میں نہ لائے بلکہ بصیرت کے ساتھ ایمان پر قائم رہے، شک و شبہ اور تردد میں نہ پڑے، سچے مومن کی پہچان یہ ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا۔ (الحجرات-۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان

لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا۔

(٦) ایمان کا چھٹا تقاضا یہ ہے کہ بندہ ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے، جب مخالفتوں کا طوفان آئے تو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ایک شخص نے رسول پاک ﷺ سے پوچھا کہ آپ مجھے ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد پھر کسی سے نہ پوچھنا پڑے تو آپ نے فرمایا قل آمنت بالله ثم استقم [1] کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔

(٧) ایمان کا ساتواں تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنی ضرورت اللہ ہی کے سامنے رکھے اور اسی سے دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِی عَنِّی فَاِنِّی قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَالْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ (البقرہ-١٨٦)

اور اے نبیؐ میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے رب سے مانگے، یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور جوتے کا تسمہ (فیتہ) ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگے'' [2]

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کامل نصیب کرے۔ (آمین)

---

[1] مسلم، کتاب الایمان

[2] ترمذی، کتاب الدعوات

رسالت پر ایمان

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ (البقرہ-۲۷۵)

رسول اس ہدایت پر ایمان لائے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کی گئی اور مومنین بھی، یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور فرماں برداری کی، ہمارے رب ہم تم سے مغفرت کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

اللہ پر ایمان لانے کا لازمی حصہ ہے کہ اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے، کیونکہ رسول ہی کے ذریعہ اللہ کی معرفت، اس کے احکام سے واقفیت اور اس کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کرنا ممکن ہے، رسولوں کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لانے کا دعویٰ ایسا ہی باطل ہے جس طرح بغیر سیڑھی کے چھت پر پہونچنے کا دعویٰ باطل ہے۔
اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں بھیجا تو ان کو یہ تاکید کی کہ جب میری ہدایت تمہارے پاس یعنی تمہاری اولاد کے پاس آئے تو جو لوگ اس

ہدایت کواختیار کریں گے ان کو کوئی خوف اورغم نہ ہوگا۔ اللہ کی ہدایت اس کے رسولوں ہی کے ذریعہ آتی ہے، انسانوں کے پاس اس کی ہدایت کو حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ فَمَنْ آمَنَ وَاَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُوْنَ. (الانعام-۴۸)

اور ہم رسولوں کو اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ خوشخبری دیں (اہل ایمان کو) اور ڈرائیں (اہل کفر کو) تو جو ایمان لائے اور اصلاح کی ان کو کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔

رسول انسانوں کے پاس اللہ کا پیغام لے کر اس لیے آتے ہیں تا کہ اتمام حجت ہو جائے، یعنی بندہ کو قیامت کے دن یہ کہنے کا جواز نہ رہے کہ کوئی رسول ہمارے پاس آیا ہی نہیں تو ہم کیسے اللہ کو پہچانتے اور اس کا حکم بجا لاتے؟ رسول اللہ کا حکم پہنچاتے ہیں، اس کی وضاحت کرتے ہیں، اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے انسانوں کے دل ودماغ میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی کو اتمام حجت کہا جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْماً ○ رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً۔ (النساء:۱۶۵-۱۶۴)

اور ہم نے ان رسولوں کو بھیجا جن کا ذکر تم سے اس سے پہلے ہم کر چکے ہیں اور ان رسولوں کو بھی بھیجا جن کا ذکر ہم نے تم سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تا کہ ان رسولوں

کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت
باقی نہ رہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔

رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر محمد ﷺ تک جتنے انبیاء اللہ کی دعوت دینے کے لیے تشریف لائے ان سب کو تسلیم کیا جائے۔ بعض انبیاء کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا اللہ کے نزدیک کفر ہے اور سارے انبیاء کا انکار کرنے کے برابر ہے، چنانچہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو نبی مانتے ہیں مگر ان کے بعد حضرت عیسیٰؑ اور محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اسی طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بعد محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، ان کے انکار کو اللہ نے کفر قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ
بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُوْلٰٓئِکَ ھُمُ
الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا۔ (النساء–۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ
اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم
بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ
میں ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے
کافروں کے لیے ہم نے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ اپنے رسولوں کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجتا ہے مگر رسول کی حیثیت نامہ بر، پیغام بر اور ڈاکیہ جیسی نہیں ہوتی کہ وہ پیغام پہونچادے اور اس کا کام ختم ہو جائے بلکہ رسول رہنما ہوتا ہے، پیشوا ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے شارع اور فرمانروا ہوتا ہے، اس کا ہر حکم ماننا اسی طرح واجب ہے جس طرح اللہ کا حکم ماننا واجب ہے، کیونکہ رسول اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتا اس کا ہر حکم اللہ کی طرف سے اور اللہ کے لیے ہوتا ہے، اسی لیے وہ قوم کی ہدایت کی فکر میں گھلتا ہے اس کے لیے اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے اور

اس کی خاطر ہر قسم کی مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-٦٤)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسے اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول رہنما ہوتا ہے اور اپنی امت کے لیے نمونہ ہوتا ہے، اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر انسانوں کی ہدایت کا کام سونپ دیتا، مگر اللہ نے فرشتوں کے ذریعہ وحی ضرور بھیجی اس معنی میں فرشتوں کو بھی رسول کہا گیا ہے لیکن انسانوں کی ہدایت کے لیے خود انسانوں میں سے بہترین افراد کو رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے، تا کہ وہ انسانوں کے لیے نمونہ اور رول ماڈل بنیں، ان رسولوں نے انسانی ضرورتوں کے مطابق شادیاں بھی کیں، ان کی اولاد بھی ہوئی اور کاروبار زندگی بھی اچھے طریقہ پر انجام دے کر دکھایا تا کہ لوگ ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگیاں گذاریں، اپنے معاملات درست کریں اور اپنی سیرت کو سنواریں۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں اور ان کی قوموں کا ایک مکالمہ قرآن میں اس طرح بیان کیا ہے:

قَالُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَاْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (ابراہیم: ۱۰-۱۱)

(مشرکوں نے کہا) تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو، چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے تھے ان سے ہمیں روک دو تو لے آؤ کوئی واضح سند، ان کے رسولوں نے ان سے کہا، واقعی ہم تم جیسے انسان ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو

چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے
کہ ہم تمہارے پاس اللہ کے اذن کے بغیر کوئی سند لائیں۔

رسالت کا عقیدہ ہندو مذہب کے عقیدہ اَوتار سے مختلف ہے جس میں خدا انسان کے روپ میں آجاتا ہے، اسی طرح عیسائیت کے عقیدہ سے مختلف ہے جس میں نبی خدا کا بیٹا بن کر اس کی خدائی میں شریک ہوتا ہے، نبی انسان ہی ہوتا ہے مگر برگزیدہ اور افضل انسان۔

رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ رہی ہے کہ ہر قوم میں الگ الگ رسولوں کو بھیجا ہے، چنانچہ ایک ہی وقت میں متعدد رسول دنیا میں آئے ہیں، مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں نبی بنائے گئے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اہل مصر کی طرف نبی بنائے گئے، جس میں آل فرعون اور بنی اسرائیل شامل تھے، چنانچہ موسیٰؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (ابراہیم-۵)

بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا
کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

اسی طرح عیسیٰؑ بھی قوم بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے، جس کی صراحت قرآن میں "وَرَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ" کے ذریعہ کی گئی ہے، یہ خصوصیت صرف محمد ﷺ کی ہے کہ ان کو کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کے لیے نہیں بلکہ سارے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، چنانچہ قرآن ان کے لیے اپنی قوم کے بجائے عام انسانوں کی رہنمائی کی تعبیر استعمال کرتا ہے اور رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلٰی

النُّوْرِ ۔(ابراہیم-۱)
اے محمدؐ یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف نازل کی تا کہ تم لوگوں کو
تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔
اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمدﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا تھا:
قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعاً (الاعراف-۱۵۸)
اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی دوسری سنت یہ رہی ہے کہ ہر قوم میں اسی زبان کے بولنے اور سمجھنے والے رسولوں کو بھیجا ہے، تا کہ پیغام کو پہونچانے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، افہام وتفہیم میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔(ابراہیم-۴)
اور ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اسے قوم کی زبان میں
بھیجا ہے تا کہ رسول ان لوگوں کو اچھی طرح پیغام سمجھا دے۔

آخری رسول محمدﷺ کو عربی زبان میں بھیجا گیا، عربی زبان اس وقت کی عالمی زبان تھی اور آج بھی اس کی عالمی حیثیت باقی ہے۔ قرآن اور محمد عربیﷺ کا پیغام اچھی طرح سمجھنے کے لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو عربی زبان کی تعلیم دیں۔

تمام رسولوں کی رسالت کا خلاصہ محمدﷺ کی رسالت ہے، ان کی تعلیم پر عمل کرنا گویا سارے رسولوں کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان وعمل کی توفیق دے (آمین)

آخرت پر ایمان

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (البقرہ-۴۸)

لوگو! ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا،
نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی سے فدیہ لے کر
چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کی مدد کی جائے گی۔

دنیا اور اس دنیا کی ساری چیز فنا ہونے والی ہے، انسان کو مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا اور اس کا حساب و کتاب ہوگا، پھر اس کے عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے اس کو جنت کا انعام یا جہنم کی سزا دی جائے گی، یہی عقیدہ آخرت ہے۔

دنیا میں انسان جب کوئی جرم کرتا ہے اور پکڑا جاتا ہے، تو سمجھتا ہے کہ دوست احباب اور اثر و رسوخ رکھنے والے اس کی حمایت کریں گے۔ اس کے ماں باپ اور خاندان کے لوگ اسے چھڑا لیں گے، وہ خود اپنی دولت سے رشوت یا تاوان دے کر چھوٹ جائے گا، وکیل اور قانون کے ماہرین یا سیاسی قائدین اس کی مدد کریں گے اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ مجرم ان سہاروں کی مدد سے بلا سزا کے چھوٹ جاتا ہے، لیکن اللہ کی عدالت اور اللہ کی گرفت ایسی ہے کہ قیامت میں کسی کی مدد، کسی کی سفارش، کوئی فدیہ یا رشوت یا کوئی اور راہ نجات اللہ کے علاوہ نہیں ہوگی، دنیا کے بے ضابطہ طور

طریقوں سے انسان کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ وہ ایمان وعمل سے غافل ہو کر آخرت میں بھی چھوٹ جانے کے فریب میں مبتلا ہو جائے، قرآن پاک میں ہے:

یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا یَوْماً لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْئاً ، اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ، فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔(لقمان-۳۳)

اے لوگو، اپنے رب کے غضب سے بچو، اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے مدد نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، پس دنیا کی زندگی تمھیں دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز اللہ کے معاملہ میں تم کو دھوکہ دینے پائے۔

آخرت کا یہ عقیدہ نہایت فطری ہے اور عقل وفہم میں آنے والا ہے، بہت سے لوگ گناہ اور ظلم کرتے ہیں اور دنیا میں سزا سے بچ جاتے ہیں، دوسرے بہت سے لوگ ظلم وزیادتی کا شکار ہوتے ہیں اور انصاف پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انسان کی عقل اور فطرت پکارتی ہے کہ کوئی ایسا دن آئے جب جرم کرنے والے کو اس کی سزا ملے اور ظلم سہنے والے کو انصاف ملے۔ انسان کی عقل وفطرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عدالت ورحمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ دن ضرور آئے جب مومن ومشرک کو گناہگار ونیکوکار کو، ظالم ومظلوم کو اور مجرم ومعصوم کو پورا پورا انصاف ملے۔ چنانچہ آخرت کا دن اسی انصاف کے لیے برپا ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ○ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ

كَالْمُجْرِمِيْنَ۝ مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (القلم:۳۴-۳۶)

ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے ، بے شک متقی لوگوں کے لیے ان کے رب کے یہاں نعمت بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں کا انجام مجرموں کا سا کردیں تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو۔

اگر آخرت اور جزا وسزا کا تصور نہ ہو تو اللہ پر ایمان لانے کا عقیدہ بے فائدہ ہو کر رہ جائے گا، ایسا خدا کس کام کا ہوگا جو نہ تو اپنے باغیوں اور مجرموں کو سزا دے سکے اور نہ ہی اپنے ماننے والوں اور بندگی کرنے والوں کو انعام و اکرام عطا کر سکے، اللہ پر ایمان لانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب انسان عقیدہ آخرت کو مانتا ہے، مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر اور اپنے کیے کا بدلہ پانے پر یقین رکھتا ہے، اسی لیے قرآن پاک میں عقیدۂ آخرت کو اللہ پر ایمان لانے کا ہی ایک حصہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۔ (النحل-۲۲)

تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے مگر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں میں انکار رچ بس گیا ہے اور وہ لوگ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔

آخرت پر ایمان اگر ایک طرف ایمان باللہ کو مکمل کرتا ہے تو دوسری طرف نیک اعمال کا شوق اور خدمت خلق کی توفیق عطا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْماً كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْراً ۝ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَّيَتِيْماً وَّ اَسِيْراً ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْراً ۝ اِنَّا

نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوْساً قَمْطَرِيْراً ٥ فَوَقَاهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْراً۔ (الدہر:۷-۱۱)

یہ لوگ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوگی اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا، پس اللہ تعالیٰ انھیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور سرور بخشے گا۔

عقیدۂ آخرت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اللہ کی نافرمانی سے، برے کاموں سے اور بری باتوں سے بچاتا ہے، گناہ کے تصور سے دل کو پاک کرتا ہے، گناہ کی طرف بڑھتے قدم کو روک لیتا ہے اور گناہ گار کو معذرت، ندامت اور توبہ کا احساس دلاتا ہے۔

حافظ بن عساکر نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان مسجد کا بڑا پابند تھا، ایک عورت اس پر فریفتہ ہوگئی اور اسے بدکاری کی دعوت دینے لگی، بالآخر نوجوان اس کے چکر میں آ گیا اور اس کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا، جیسے ہی انھوں نے برائی کا ارادہ کیا اس کو قرآن کی یہ آیت یاد آ گئی:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔ (الاعراف-۲۰۲)

بے شک جو لوگ متقی ہیں ان کو شیطان کے اثر اگر کوئی برا خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور ان کو صحیح راستہ

نظر آنے لگتا ہے۔

اس آیت کا یاد آنا تھا کہ نوجوان غش کھا کر گر پڑا، جب اسے ہوش آیا تب پھر اسے اپنی حالت اور قرآن کی مذکورہ آیت یاد آئی، وہ پھر بے ہوش ہو گیا، اور اسی حالت میں اس نے جان دیدی۔[۱]

جو لوگ آخرت کے خوف سے بے نیاز ہیں ان کو برائیوں، بے حیائیوں، ظلم و ستم اور گناہ کے کاموں سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ پولس، قانون اور ضابطے سب کچھ وہ توڑ سکتا ہے، موقع پا کر ہر جرم کا ارتکاب کر سکتا ہے، مگر جس شخص کو آخرت میں اللہ کے آگے جواب دہ ہونے کا خوف ہے وہ دن کے اجالے اور رات کی تاریکی، ہر جگہ گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ دنیا پرست یا مادہ پرست نہیں ہو سکتے، دنیا پرستی اور مادہ پرستی منکرین آخرت کا شیوہ ہے، کیونکہ ان کو اسی دنیا میں سب کچھ حاصل کرنا ہے، اس لیے وہ جائز ناجائز ہر طرح سے دنیا کمانے میں لگے رہتے ہیں، جب کہ مومن کو آخرت میں اجر ملنے کا یقین ہوتا ہے، اس لیے وہ دنیا کو آخرت کے اصولوں کی بنیاد پر قبول کرتا ہے۔ قرآن منکرین آخرت کی دنیا پرستی کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَّمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا
يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ وَّمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ
الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۔(البقرہ-۹۶)

تم ان یہودیوں کو سب سے زیادہ جینے کا حریص پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ حریص، ان میں سے ہر شخص ہزار برس جینے کی خواہش رکھتا ہے، حالانکہ یہ لمبی عمر اسے عذاب سے دور نہیں کر سکتی، اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، جلد دوم، ص ۳۱۰

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھ کران کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہیں، اب وہ جو چاہیں کریں، وہ حضرت عیسیٰؑ کے طفیل سزا سے بچ جائیں گے، مسلمانوں میں بھی نادان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ جو چاہیں گناہ کریں حضورﷺ اپنی ہر امتی کی شفاعت کریں گے۔

اگر ہر مجرم کی خواہ اس نے کتنے ہی گناہ کیے ہوں حضورﷺ شفاعت کریں گے تو جزا و سزا کا جو قانون محمدﷺ لے کر آئے ہیں وہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ بے شک رسول پاکﷺ اپنی امتی کی شفاعت کریں گے مگر انہی لوگوں کی کریں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا۔ (طٰہٰ:۱۰۹-۱۰۸)

(قیامت کے دن) آوازیں رحمان کے آگے پست ہو جائیں گی، ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے، اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی، الا یہ کہ رحمٰن جس کو اجازت دے اور اس کی بات سے راضی ہو۔

مختصر یہ ہے کہ آخرت دنیا کا حاصل اور نتیجہ ہے، آخرت میں کامیاب ہونے کے لیے دنیا میں انسان کو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب آخرت سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

ایمان اور استقامت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔ (حمٓ السجدہ:۳۰-۳۲)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی۔ یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے۔

حضرت سفیان بن عبداللہ الثقفیؓ نے جناب رسول کریم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے پوچھنا نہ پڑے، تو آپؐ نے فرمایا قل امنت باللہ ثم استقم[1] کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر جم جاؤ۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان

ایمان کی اصل لذت استقامت ہے اور یہی استقامت ایمان کو معتبر اور مفید بناتی ہے، استقامت آزمائش کے وقت زیادہ مطلوب ہوتی ہے۔ حالات کسی بھی فرد یا قوم کے لیے یکساں نہیں رہتے، اہل ایمان پر بھی اچھے اور خراب دن آتے ہیں بلکہ اہلِ ایمان کی آزمائش دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، کبھی بیماری و آزاری ہوتی ہے، کبھی کفر والحاد کا زور ہوتا ہے، کبھی دشمنوں کا خوف ہوتا ہے، کبھی عزت و آبرو پر حملے ہوتے ہیں۔ ان تمام حالتوں میں سچا مومن گھبراتا نہیں اور گھبرا کر اپنے ایمان میں کمزوری نہیں دکھاتا، بلکہ مضبوطی کے ساتھ ایمان پر جم جاتا ہے، جس طرح آندھی اور طوفانی ہواؤں میں انسان اپنی چادر کو چھوڑتا نہیں بلکہ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور اپنے جسم پر لپیٹ لیتا ہے، اسی طرح مومن ناموافق حالات میں ایمان سے دست بردار نہیں ہوتا بلکہ اس کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔

ایمان کے ساتھ آزمائش ہمیشہ لگی رہتی ہے، انبیاء کرام، صحابہ، صالحین سب آزمائش سے گذرے ہیں مگر ایمان میں کمزوری نہیں دکھائی۔ حضرت ابراہیمؑ کو نمرود نے آگ میں ڈالا تھا، حضرت یوسفؑ کو مصر کے بادشاہ نے جیل میں ڈالا تھا، حضرت زکریاؑ کو حکومت نے آرے سے چیر دیا تھا اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کو ذبح کر دیا تھا، فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور ان کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کو رومی حکومت نے یہودیوں کے کہنے پر سولی پر چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ خود آقائے عربی محمد مصطفی ﷺ کو قتل کرنے کے لیے کفار مکہ نے ان کے گھر کو گھیر لیا تھا، مدینہ میں بھی آپ کو زہر دینے اور قتل کرنے کی مسلسل سازشیں ہوتی رہیں، ان سارے جلیل القدر نبیوں نے حالات کی سختی کو جھیلا، پریشانیاں اٹھائیں، بعض نے جان بھی دے دی مگر ایمان واسلام سے ایک لمحہ کے لیے نہ پھرے۔

حضرت خباب بن ارتؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا اور اللہ سے دعا کرنے کی درخواست کی، آپ نے

فرمایا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جن کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا مگر وہ دین حق سے نہیں پھرتے تھے، لوہے کی کنگھی سے گوشت ہڈی سے نوچ لیا جاتا تھا پھر بھی وہ دین سے نہیں ہٹتے تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ اور ان کے پاک دل صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی مشکلات اور آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے، ایمان ہی کی خاطر حضرت سمیہؓ کو شہید کیا گیا، حضرت بلال حبشیؓ کو چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے پتھر پر لٹا کر کھال ادھیڑی گئی، حضرت صہیب رومیؓ کو اذیت دے کر جسم کو داغا گیا۔ حضرت خبابؓ کو مار مار کر لہولہان کیا گیا، ان کو تیز دھوپ میں پتھر پر لٹا کر ان کی چربی تک پگھلا دی گئی۔ حضور ﷺ اور ان کے اہل خانہ کو شعب ابی طالب میں قید کر کے سوکھا چمڑا اور پتہ چبا کر جینے پر مجبور کیا گیا۔ اہلِ ایمان کے ساتھ ظلم وتشدد اور بربریت کی ایک لمبی داستان ہے، جب کسی نے اللہ وحدہٗ لاشریک کا کلمہ بلند کیا اسے سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، بقول اقبالؒ:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم　　　　که دانم مشکلات لا الٰہ را

جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ جاتا ہوں کیونکہ لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھنے کے بعد جو مشکلات آتی ہیں ان سے میں باخبر ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (البقرہ-۲۱۴)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام

پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے اُن پر سختیاں گزریں،
مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتی کہ وقت کا رسول اور اس کے
ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ (اس
وقت انھیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ سنت الٰہی ہے، تاریخ بھی اس پر گواہ ہے کہ جب اہلِ ایمان نے استقامت اور عزیمت کا مظاہرہ کیا تو اللہ کی مدد ضرور آئی۔ اگر اللہ کی مدد نہ آئی ہوتی تو بدر کے میدان میں مٹھی بھر مسلمان کبھی کامیاب نہ ہوتے اور آج ہمارے دلوں اور ہمارے گھروں میں ایمان کی روشنی نہ ہوتی۔

اسلام کو پھیلانے کے لیے ہمارے رسول ﷺ نے کتنی سختیاں جھیلی ہیں۔ ان کے پاک دل صحابہؓ نے کتنی اذیتیں برداشت کی ہیں شاید آج ہم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہمیں اسلام وراثت میں ملا ہے، اور ایمان کی خاطر کوئی قربانی ہمیں نہیں دینی پڑی ہے، اس لیے مسلمانوں پر ابتدائی عہد کے مظالم کو ہم ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں سکتے، مگر جب آپ سیرت رسول ﷺ پڑھیں گے، صحابہؓ کی داستان حیات پڑھیں گے، تو ابتدائی مسلمانوں کی عظمت کا اندازہ ہوگا۔

ایک واقعہ صحابیٔ رسول حضرت خبیب بن عدیؓ کا سنیے۔ مدینہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس عضل اور قارہ کے منافقین آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے قبیلہ کے لوگ مسلمان ہوئے ہیں، ان کی تعلیم کے لیے کچھ معلمین کو بھیج دیجیے، حضور پاک نے چھ صحابہؓ کو جن میں حضرت خبیب بن عدی بھی تھے ان کی تعلیم کے لیے روانہ کیا، راستہ میں ان لوگوں نے منصوبہ کے تحت غداری کی اور قبیلہ ہذیل کو آواز دی جو تلواریں لے کر آگئے اور ان پر پل پڑے، تین صحابی تو شہید ہوگئے اور تین قید ہوگئے، راستہ میں انھوں نے دو صحابہؓ کو شہید کر دیا اور حضرت خبیبؓ کو مکہ لے گئے اور قریش کے حوالہ

کر دیا۔حضرت خبیب کو کفار مکہ نے مقام تنعیم کے پاس لے جا کر قتل کرنے کا پروگرام بنایا اور اسے ایک تماشہ کی شکل دیدی، حضرت خبیب کے قتل کا تماشہ دیکھنے کے لیے سرداران قریش بھی آئے ، ان میں سفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ اور نوجوان سعید بن عامر بھی تھے،سعید بن عامر اور سفیان بعد میں مسلمان ہوئے۔

حضرت خبیبؓ کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور مکہ کے مرد وعورت اور بچے ڈھکیلتے ہوئے ان کو موت کے میدان میں لا رہے تھے، قاتلوں اور قتل کا تماشہ دیکھنے والوں کے درمیان حضرت خبیبؓ نے دو رکعت نماز ادا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا،اجازت ملنے پر دو رکعت نماز ادا کی ،سر کٹانے سے پہلے سر جھکا کر اپنے ایمان کا ثبوت دیا، کفار مکہ نے قتل کرنے سے پہلے ان کے ناک کان کاٹنا شروع کیے، ان کا مثلہ کیا ، ان کو تڑپایا اور نمک چھڑکنے کے لیے کہا کہ بولو! کیا پسند کروگے کہ تمہاری جگہ تمہارے رسول محمدﷺ ہوتے اور تم کو چھوڑ دیا جاتا؟ حضرت خبیب کے اعضاء کٹ رہے تھے،خون بہہ رہا تھا اور زبان پر یہ الفاظ تھے ”واللہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں سکون کے ساتھ اپنے گھر میں رہوں اور حضور کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھے“ یہ سننا تھا کہ کفار نے شور مچایا مارڈالو،جس وقت حضرت خبیبؓ کے جسم کے ٹکڑے کیے جا رہے تھے،انھوں نے چند اشعار کہے جن کا مطلب یہ ہے:

”اگر میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں اللہ کی راہ میں کس پہلو لٹا کر مجھے قتل کیا جاتا ہے کوئی غم نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اگر وہ چاہے تو میرے جسم کے ہر کٹے ہوئے حصہ کو بابرکت بنادے“۔پھر کفار مکہ نے ان کو سولی پر لٹکا دیا اور حضرت خبیب کی روح کو فرشتے لے کر اللہ کے حضور پہونچ گئے۔

ان ہزاروں واقعات میں جو اسلام کی عظمت کی نشانی ہیں یہ ایک واقعہ ہے۔کیا ہم اسلام کے لیے اس طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں؟ ہمارا حال یہ

ہے کہ جب مشکلات آتی ہیں، تکلیف ہوتی ہے تو ہم بلبلا اٹھتے ہیں، ہمت اور حوصلہ سے ایمان پر ثابت قدم رہنے کے بجائے کمزوری دکھانے لگتے ہیں اور جو لوگ ایمان کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں قربانیاں دے رہے ہیں ان کو ہی قصوروار ٹھہرانے لگتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو آزمائش ضرور آئے گی، اگر آزمائش نہیں ہوگی تو مومن اور منافق کی اور سچے اور جھوٹے کی پہچان نہیں ہوگی، بھٹی میں لوہا تپتا ہے تو کندن بن جاتا ہے اور جو میل کچیل ہوتا ہے وہ راکھ بن جاتا ہے۔ ایمان پر ثابت قدم رہنا مومن کا شعار ہے، علامہ اقبال کہتے ہیں۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو ایمان پر استقامت کی توفیق دے اور اپنی رحمت اور نصرت سے نوازے۔ (آمین)

رحمۃ للعالمین ﷺ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء –۱۰۷)

اے نبیؐ، ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا تعارف رب العالمین کی حیثیت سے کرایا ہے، سورہ الفاتحہ کی ابتدا الحمدللہ رب العالمین سے ہوتی ہے، رب العالمین کا مطلب ہے سارے جہاں کا پالنے والا اور پرورش کرنے والا، اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد ﷺ کا تعارف ''رحمۃ للعالمین'' سے کرایا ہے یعنی سارے جہاں کے لیے رحمت، جس طرح اللہ کو پہچاننے اور اس کی رضا تک پہونچنے کے لیے رسول کا اتباع ضروری ہے اسی طرح اللہ کی ربوبیت کو حاصل کرنے کے لیے رسول کی رحمت کا ہونا ضروری ہے، اگر باغ میں پودے لگا دیے جائیں اور ان کو سیراب نہ کیا جائے ،کھیت میں بیج بودیے جائیں اور ان کو پانی نہ دیا جائے تو پودا پنپ نہ سکے گا سوکھ جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا فائدہ انسان رسول کی رحمت کے بغیر نہیں اٹھا سکتا۔

زمین جب پیاسی ہوتی ہے تو اللہ بارش بھیجتا ہے اسی طرح انسان کی روح جب ہدایت کی پیاسی ہوتی ہے تو اللہ اپنے رسول کو رحمت بنا کر بھیجتا ہے، یوں تو سارے ہی رسول اللہ کی رحمت کے پیغامبر بن کر آئے مگر آخری رسول محمد ﷺ سراپا رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے ۔ اور صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ جنوں، حیوانوں اور تمام مخلوق کے لیے رحمت بن کر آئے، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ رسول کریم

کی زندگی کا ہر عمل انسانی معاشرہ کی ہدایت کے ساتھ رحمت رسانی کا بھی سامان کرتا ہے۔

دنیا میں جتنے جلیل القدر انبیاء گزرے ہیں انہوں نے اللہ کے دین کی طرف انسانوں کو بلایا جن قوموں نے اپنے نبی کو جھٹلایا، ان کو ستایا اور ان کی دعوت کو ٹھکرایا تو ان کے رسولوں نے ان کے لیے بددعا کی اور اللہ نے ان کی بددعا قبول کرتے ہوئے ان قوموں کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ نوح علیہ السلام کی قوم نے جب ان کو جھٹلایا اور ستایا تو حضرت نوح نے اس طرح بددعا کی:

قَالَ نُوْحُ رَّبِّ لاتَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارَا ○ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلاَ يَلِدُوْآ اِلَّا فَاجِراً كَفَّارَا . (نوح .۲۷-۲٦)

نوحؑ نے کہا میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔

اسی طرح حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت موسیٰ علیہم السلام نے اپنی قوم کی گمراہی اور ڈھٹائی پر بددعا کی اور قومیں ہلاک ہوئیں، نبی کو یہ حق حاصل ہے کہ قوم مخالفت کرے تو نبی بددعا کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے خلاف جو بددعا کی اس کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَا اِنَّکَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالاً فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ . (يونس . ۸۸)

موسیٰؑ نے دعا کی اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے
سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا
ہے، اے رب کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تری راہ سے
بھٹکائیں؟ اے رب، ان کے مال غارت کردے اور ان کے
دلوں پر ایسی مہر کردے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک
عذاب نہ دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب مرا، نبی اپنے معاشرہ کے لیے رحمت ہوتے ہیں، جب قوم رحمت کو قبول نہیں کرتی تو ہلاکت اس کا مقدر بن جاتی ہے مگر آخری رسول محمد ﷺ کی شان دوسرے انبیاء سے مختلف ہے، کفار نے آپ کو بھی جھٹلایا، آپ کی مخالفت کی، آپ کو اذیت دی بلکہ آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا، مگر رسول پاک ﷺ نے ان کے لیے بددعا نہ کی، ہدایت کی دعا کی۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں:

قیل یا رسول اللہ ادع علی المشرکین قال انی لم
ابعث لعانا وانما بعثت رحمۃ۔[1]

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مشرکوں پر بددعا کیجیے،
رسول پاک نے فرمایا میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا
ہوں میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات نبی ﷺ تہجد کے لیے کھڑے ہوئے اور ایک ہی آیت پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، وہ آیت یہ تھی:

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ والآدب، باب النہی عن لعن الدواب وغیرہا۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (المائدہ . ۱۱۸)[۱]

محمد ﷺ کو کفار نے جتنی تکلیف پہونچائی اور جتنی مخالفت کی اس کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، سب سے زیادہ تکلیف آپ ﷺ کو طائف کے لوگوں نے پہونچائی، جب آپ ﷺ ان کے پاس دین کی دعوت لے کر تشریف لے گئے، آپ ﷺ کا خیال تھا کہ قریش کے لوگ اگر اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے تو دوسرا بڑا قبیلہ بنوثقیف کا طائف میں ہے اگر وہ لوگ اسلام قبول کرلیں تو اللہ کے دین کی اشاعت آسان ہوجائے گی، اس خیال سے آپ ﷺ نبوت کے دسویں سال طائف تشریف لے گئے، آپ کے غلام حضرت زید بن حارثہؓ ساتھ تھے۔

قبیلہ بنوثقیف کے سردار تین بھائی تھے عبد یالیل، مسعود اور حبیب، ان کی رشتہ داری قریش سے تھی، رسول پاک ﷺ نے ان تینوں بھائیوں سے ملاقات کی، دین کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے نہایت رعونت اور گستاخی سے اس دعوت کو ٹھکرادیا اور رسول کریم ﷺ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے، انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کے پیچھے غلاموں اور اوباش لڑکوں کو لگادیا، وہ آپ ﷺ کے پیچھے شور مچاتے، آپ ﷺ کو دیوانہ کہتے، پتھر مارتے اور رسوا کرتے، ان کے پتھر مارنے کی وجہ سے آپ ﷺ کا جسم پاک زخمی ہوگیا خون رسنے لگا۔ راستہ میں ایک جگہ آپ ﷺ نے آرام فرمایا اور بے قراری کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے ملک الجبال یعنی پہاڑ کے فرشتہ کو آپ کے پاس بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، سلام کیا اور کہا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ قوم کا سلوک دیکھ لیا اور مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ حکم دیں تو ابھی کفار کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں، آپ نے فرمایا نہیں یہ نہیں ایمان لاتے تو شاید ان کی نسلیں

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، المائدہ، آیت ۱۱۸

ایمان لائیں اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا تھا جس وقت وہ اللہ کے ایک نبی (یعنی اپنا) کا واقعہ بیان فرما رہے تھے کہ ان کی قوم نے ان کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا وہ اپنے چہرہ سے خون پوچھتے تھے اور کہتے تھے **اللّٰھم اھدِ قومی انھم لا یعلمون**۔[1] اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ نادان ہے۔

رحمت کی یہ روشن مثال انسانی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی، یہی موقع ہوتا ہے جب نبی بددعا کرتا ہے، اس کی بددعا قبول ہوتی ہے اور قوم ہلاک ہوتی ہے، رسول پاک ﷺ نے بددعا بھی نہیں کی اور فرشتہ نے قوم کو ہلاک کرنے کی پیش کش کی تو رسول پاک نے ہلاکت کی دعا کرنے کے بجائے ہدایت کی دعا فرمائی۔ آخر رحمۃ للعالمین جو ٹھہرے۔

آج مسلمان کا یہ شیوہ ہو گیا ہے کہ جب اسے کسی سے تکلیف پہونچتی ہے تو کہتا ہے میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا، مگر رسول پاک ﷺ کی سنت یہ ہے کہ آپ نے پتھر کھائے جواب میں پتھر نہیں برسائے بلکہ ان کی ہدایت کی دعا کی اور آپ کی دعا قبول ہوئی، دنیا نے دیکھ لیا کہ طائف کی اگلی نسل نے رسول پاک کا کلمہ پڑھ لیا، کل طائف کے لوگ رسول کے دشمن تھے آج طائف کے لوگ رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں۔ یہ کرشمہ تھا اس رحمت کا جسے لے کر آپ دنیا میں تشریف لائے تھے۔

رسول پاک ﷺ کی زندگی سراپا رحمت تھی، زحمت، تشدد، انتقام جیسی چیزیں آپ کے اندر نہ تھیں، یہی وجہ تھی کہ دشمن بھی آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا، اگر ایمان نہ لاتا تو کم از کم آپ کی رحمت بھری شخصیت سے متاثر ضرور ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اس صفت کا اور اس کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الانبیاء، باب حدیث الغار،
نیز دیکھیے: کتاب استتابۃ المعاندین، باب اذا عرض الذمی وغیرہ لسب النبیؐ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ . (آل عمران . ۱۵۹)

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے ۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کی پہچان رحمت تھی، اسی طرح امت رسولؐ کی پہچان بھی رحمت ہونی چاہیے، مسلمان اپنی فیملی کے لیے، اپنے محلّہ اور سماج کے لیے، اپنے ملک اور انسانوں کے لیے رحمت بننے کی کوشش کریں، اس وقت ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ مسلمانوں کو زحمت سمجھا جاتا ہے، ان کو ظلم وتشدد سے جوڑا جاتا ہے، مسلم نوجوانوں میں تحمل اور رواداری کا جذبہ کم ہورہا ہے، ان کو اپنے رسول ﷺ کا اسوہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ رحمۃ للعالمین تھے، رحمۃ للمسلمین نہ تھے، مسلمانوں کے لیے حضور کی رحمت خاص تھی اور تمام انسانوں کے لیے رحمت عام تھی، اس رحمت کا پیغام اور فیضان دنیا تک پہونچانے کے لیے ہم مسلمانوں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، اپنی شخصیت کو رحمت بنانی ہوگی، اپنے رویہ سے رحمت کا ثبوت دینا ہوگا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے رسول ﷺ کی رحمت بھری سیرت کو اپنانا ہوگا۔

سلام اس پر کہ جس نے خون پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو رحمت عالم بنادے (آمین)

اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید۔ اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا. (الاحزاب: ۳۳-۲۱)

''بے شک تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''۔

اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو انسانوں کے لیے مکمل نمونہ بنا کر بھیجا، رسول کریم ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم اپنے آپ میں مکمل ہے اور رسول کریم کی سیرت و شخصیت بھی مکمل ہے اور تمام انسانوں کے لیے اور رہتی دنیا تک کے لیے نمونہ زندگی ہے۔ انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں اور حالتوں کے لیے مختلف رول ماڈل اپناتا ہے، مگر رسول کریم ﷺ کی شخصیت اتنی مکمل اور ہمہ گیر ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ کے لیے رول ماڈل ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ انسانوں میں سب سے زیادہ بااخلاق تھے۔ کان رسول اللہ ﷺ احسن الناس خلقا۔[۱]

عصر حاضر کا انسان عام طور پر اپنی زندگی کو پرائیویٹ اور سماجی دو خانوں میں تقسیم کرتا ہے، وہ اپنی نجی زندگی کے لئے الگ طرز رکھتا ہے اور سماجی زندگی میں کچھ اور اصولوں کا اظہار کرتا ہے، اگر کسی کی ظاہری زندگی کو دیکھئے تو وہ خوشنما خواب نظر آتا ہے مگر اس کی پرائیویٹ زندگی میں جھانکیے تو یہی خواب ڈراونا بن جاتا ہے،

۱؎ مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن خلقہ ﷺ

شخصیت کا یہ تضاد اس لیے ہے کہ انسان دین و دنیا کے دو الگ تصور رکھتا ہے اور یہ تصور اس کی زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ نجی اور سماجی دونوں زندگی کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔

سماجی زندگی دوسرے انسانوں کے ساتھ سلوک، برتاؤ اور رویہ سے تشکیل پاتی ہے، لوگوں سے خوش گواری اور خندہ پیشانی سے ملنا، ان کا مسکرا کر استقبال کرنا اور ان سے شیریں کلام کرنا مہذب زندگی کی پہلی علامت ہے، مسکرا کر ملنے والا مخاطب کے قلب و ذہن میں محبت کی کرن چھوڑ جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی عوامی اور سماجی زندگی کا یہ خوش نما اسوہ ہے۔ جسے آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

کل معروف صدقة وان من المعروف ان تلقی اخاک بوجه طلق۔[1]

''ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی سے مسکرا کر ملو''۔

عام لوگوں پر دوسرا تاثر انسان کی گفتگو اور انداز تخاطب کا ہوتا ہے، انسان اگر صاحب حیثیت ہو، دولت و منصب اور عہدہ و اقتدار کا مالک ہو تو وہ اپنی گفتگو میں اس کا اظہار کرتا ہے، کم حیثیت کے لوگوں پر اپنی بڑائی کا رعب گانٹھتا ہے۔ مگر رسول کریم کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ امیر ہو یا غریب بڑا ہو یا چھوٹا، عقل مند ہو یا بے وقوف، شہری ہو یا دیہاتی ہر شخص کو اپنی خوش کلامی اور شیریں زبانی سے متاثر بلکہ مسحور کر لیتے ہیں۔ رسول پاک نے اپنے اصحاب کی تربیت اس قرآنی اصول پر کی ہے:

قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوْا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ. (بنی اسرائیل :۵۳)

''میرے بندوں سے کہو کہ بات وہ کہیں جو عمدہ اور خوبصورت ہو''

گفتگو کا اک حسیں انداز ہو نرم لہجہ دل نشیں آواز ہو
پیار کا اظہار ہو گفتار سے غیر بن جاتے ہیں اپنے پیار سے

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی طلاقۃ الوجہ

سماجی زندگی کا تیسرا اصول ہے کہ دوسروں کے ساتھ اخلاق و اکرام اور مہربانی کا برتاؤ کرنا۔ ملنے والا اگر بُرا آدمی ہو تب بھی اس سے نفرت کا اظہار کرنے کے بجائے نرمی سے اس کے دل کے دروازہ پر دستک دینا چاہیے، ایک مرتبہ ایک شخص رسول پاک ﷺ کے گھر حاضر ہوا اور اندر آنے کی اجازت مانگی، آپ ﷺ نے اپنی اہلیہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ شخص اپنے خاندان میں اچھا نہیں ہے، ساتھ ہی آپ نے اسے اندر آنے کی اجازت دیدی، جب وہ آیا تو آپ نے نہایت نرمی اور محبت سے گفتگو کی، جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ اللہ کے رسولؐ! اس کے بارے میں آپ کی رائے تو اچھی نہ تھی پھر بھی آپ نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا، ایسا کیوں؟ رسول پاک ﷺ نے فرمایا، اے عائشہ! بدترین آدمی وہ ہے جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔[۱]

عوامی زندگی کا چوتھا اصول یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ جہالت، سختی اور بداخلاقی سے پیش آئیں ان کے ساتھ جوابی بداخلاقی کا معاملہ کرنے کے بجائے تحمل، خوش اخلاقی اور نرمی کا معاملہ کریں، ایک دیہاتی رسول پاک ﷺ کے پاس آتا ہے اور نہایت گستاخی کے ساتھ آپ کی چادر کھینچتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے اونٹ کو غلہ اور کھانے پینے کے سامان سے بھر دیجئے، آپ کی گردن چادر کھینچنے سے سرخ ہو جاتی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میری گردن چھوڑ دو۔ پھر میں تمہارے لئے غلہ دینے کا حکم کرتا ہوں۔ دیہاتی مانگنے کے لیے آیا تھا مگر بدتمیزی اور ظالمانہ طریقہ اختیار کر رہا تھا۔ رسول پاک کو حق تھا کہ اسے غلہ دینے کے بجائے معقول سزا دیتے تا کہ اسے مانگنے کی تمیز آ جاتی مگر آپ نے اس کے اجڈ پن کو نظر انداز کیا اور اس کے اونٹ کو غلہ سے بھر کر اسے خوش خوش رخصت کر دیا۔[۲]

اجتماعی زندگی کے آداب، اور لوگوں میں رہنے اور بسنے کے طریقے اگر

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حسن المعاشرۃ
[۲] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ

انسان کو نہ آئیں تو وہ انسانوں کی بستی میں بھی وحشی بن کر رہ جاتا ہے اور اگر وہ یہ آداب سیکھ لے تو جنگل کو بھی گلشن میں تبدیل کرسکتا ہے، یہی کارنامہ رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا ہے اور اپنی تربیت سے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب سکھائے ہیں۔

حضرت امام حسینؓ نے اپنے والد حضرت علیؓ سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سلوک کے بارے میں پوچھا، حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی، دوست اور داماد تھے اور سیرت محمدی ﷺ کے نہ صرف عالم تھے بلکہ ان کی عملی تصویر بھی تھے، انہوں نے رسول پاک ﷺ کی مجلسی سیرت کی تفصیل اپنے صاحب زادہ کو بتائی:

رسول اللہ ﷺ ہمیشہ خوش گوار اور خوش مزاج رہتے تھے، اخلاق کریمانہ کے حامل تھے، بہت آسانی سے دوسروں کی طرف توجہ فرماتے تھے، سخت دل اور ترش رو نہ تھے، چیختے چلاتے نہ تھے، برے اور بے حیا نہ تھے، نہ کسی کی عیب جوئی کرتے تھے اور نہ بخیل اور کنجوس تھے، جس چیز کو ناپسند کرتے تھے اس سے پرہیز کرتے تھے مگر پیش کش کرنے والے کو اپنے کرم سے مایوس نہیں کرتے تھے اور نہ اس کا وعدہ فرماتے تھے۔

اپنی ذات کو تین چیزوں سے محفوظ کرلیا تھا، لڑائی جھگڑا کرنے سے، کبر و غرور سے اور فضول کاموں سے، لوگوں کو بھی تین چیزوں سے محفوظ کردیا تھا، کسی کی مذمت اور برائی نہیں کرتے تھے، کسی کی نکتہ چینی نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کی پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے، وہی بات کرتے تھے جس میں نیکی اور ثواب کی امید ہوتی تھی اور جب گفتگو فرماتے تھے تو آپ کے ہم نشین صحابہؓ اس طرح خاموشی اور توجہ سے آپ کی بات سنتے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ جب آپ ﷺ خاموش ہوجاتے تھے تو آپ کے صحابہؓ باتیں کرتے تھے، مگر بحث و تکرار نہیں کرتے تھے، جب آپ کے ساتھیوں میں کوئی اپنی بات کہتا تو دوسرے صحابہ خاموش ہوکر ان کی بات سنتے، یہاں تک کہ وہ اپنی بات مکمل کرلے۔

صحابہ کرامؓ جن باتوں پر ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے، جس بات پر صحابہؓ تعجب

کرتے آپ بھی حیرت کا اظہار فرماتے، اگر کوئی اجنبی آپ ﷺ کی مجلس میں آ کر جہالت اور سختی سے بات کرتا تو اس کی زبان درازی پر صبر کرتے جب کہ صحابہ اس نادان شخص کو سزا دینے پر آمادہ ہو جاتے، مگر آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے فرماتے، جب تم کسی ضرورت مند کو دیکھو کہ وہ تم سے سوال کر رہا ہے تو تم اس کی ضرورت پوری کر دو۔

رسول اللہ ﷺ اپنے سامنے اپنی تعریف کسی سے سننا پسند نہ کرتے تھے مگر یہ کہ کسی پر آپ نے احسان کیا اور وہ شکریہ ادا کرنے آیا ہو۔ آپ کسی کی بات درمیان میں کاٹتے نہیں تھے، الا یہ کہ وہ حد سے تجاوز کرنے لگے اس صورت میں آپ یا تو اسے روک دیتے یا کھڑے ہو جاتے۔[۱]

یہ تفصیل جو حدیث اور سیرت کی معتبر کتابوں میں رسول پاک ؐ کے اخلاق عالیہ اور شریفانہ سلوک کی ملتی ہے، رسول ﷺ کی عظمتوں کا پتہ دیتی ہے، اس اخلاق کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے، مجلس سے، سماج اور باہر کی دنیا سے ہے، اس کے مقابلہ میں حضور ﷺ کی ذاتی اور نجی زندگی کا معاملہ بھی ہے جو اسی طرح عظیم اور قابل تقلید ہے۔

بعض لوگ باہر کی زندگی میں جتنے مہذب نظر آتے ہیں گھریلو زندگی میں اتنے ہی کھردرے بن جاتے ہیں، مجلسوں میں جتنے باوقار ہیں خلوتوں میں اتنے ہی بے وقار ہیں۔ اپنے گھر والوں، خادموں اور ماتحتوں کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جو تہذیب و شرافت سے فروتر ہے، انسان کی شخصیت کو پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں کتنا مہذب اور شریف ہے، باہر کے لوگوں کو متاثر کرنا آسان ہے گھر والوں کو متاثر کرنا مشکل ہے، کیونکہ وہ اسے کھلی کتاب کی طرح دیکھتے ہیں۔ جب کہ باہر کے لوگ صرف ظاہری روپ کو دیکھتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی زندگی میں یہ تضاد نہیں ہے، کیوں کو جلوت ہو یا خلوت، مجلس ہو یا نجی زندگی دونوں جگہ وہ اپنے رب اور اپنے مالک کی نگاہ سے اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور دونوں جگہ ایماندارانہ اور مومنانہ زندگی گذارتے ہیں۔ یہی اسوہ حسنہ

---

[۱] شمائل ترمذی، باب اخلاق رسول اللہ ﷺ

اور رول ماڈل ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

خیر کم خیر کم لاھلہ و انا خیر کم لاھلی ۔ [1]

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی فیملی کے لیے بہتر ہو اور میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اپنی فیملی کے لئے بہتر ہوں''۔

رسول کریم ﷺ کے اس فرمان کی تصدیق ان کی ازاج مطہرات بھی کرتی ہیں چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

ماضرب رسول اللہ ﷺ خادما ولا امرأۃ قط. [2]

نبی ﷺ نے کبھی کسی خادم کو یا کسی خاتون کو نہیں مارا، یہ شہادت تو گھر کی ہے یعنی زوجہ محترمہ کی۔ ممکن ہے کہ اسے شوہر کی محبت میں دیا گیا بیان سمجھ لیا جائے، آیئے ذرا خادم کی رپورٹ بھی سن لیں۔

حضرت انس بن مالکؓ آپ ﷺ کی خدمت میں دس سال تک رہے، خادم پر ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات ہے وہ کہتے ہیں کہ کبھی رسول پاک ﷺ نے مجھے اُف تک نہیں کہا، کوئی کام نہیں کیا تو یہ نہیں کہا کہ تم نے کیوں نہیں کیا اور کوئی کام کیا تو یہ بھی نہیں کہا کہ ایسا کیوں کیا؟ میں نے دس سال آپ کی خدمت کی اور آپ جیسا حسن اخلاق کا مالک کسی کو نہیں دیکھا۔ [3]

رسول پاک ﷺ کی اندر اور باہر کی زندگی یکساں طور پر پاکیزہ اور روشن ہے، قرآن کے احکام کی مجسم تفسیر ہے اور انسانیت کے لیے مکمل نمونہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جب صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا: **کان خلقہ القرآن** [4] ان کا اخلاق قرآن تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسوۂ رسول ﷺ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ
[2] مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن خلقہ ﷺ
[3] ابوداؤد، کتاب الادب
[4] تفسیر ابن کثیر، سورہ القلم

ختم نبوت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ
وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا. (الاحزاب. ۴۰)

(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کا سلسلہ شروع کیا اور حضرت محمد ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ مسلمان ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی رسالت پر ایمان لائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ختم رسالت پر ایمان لائے، یعنی اس بات پر ایمان لائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں آپؐ کے اوپر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اب قیامت تک کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا، البتہ مجدد، مصلح وغیرہ ہوتے رہیں گے، محمد ﷺ کی رسالت کے ساتھ ہی دین مکمل ہو چکا ہے۔ محمد ﷺ پر دین کو مکمل کرنے کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً. (المائدۃ—۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین

کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔

تکمیل دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ تکمیل نبوت ہو، اگر نبوت کا سلسلہ جاری رہے تو دین کبھی مکمل نہیں ہوگا، کیونکہ اگلے نبی کی ضرورت خود ظاہر کردے گی کہ ابھی دین مکمل نہیں ہوا ہے، جبھی تو نبی کی آمد جاری ہے، اسی لیے اللہ نے دین کے مکمل ہونے کا اعلان کردیا ہے، آخری رسول محمد ﷺ نے سلسلہ نبوت پر مہر لگادی ہے اور نبوت کے سلسلہ کو ختم کردیا ہے۔

محمد ﷺ نے سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے:

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنهٗ واجملهٗ الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون بهٖ ویعجبون لهٗ ویقولون هل لا وضعت هذهٖ اللبنة فانا تلک اللبنة وانا خاتم النبیین[۱]

''میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص نے ایک عمارت بنائی، اور نہایت حسین وجمیل عمارت بنائی، لیکن اس کے ایک کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی، لوگ اس عمارت کی زیارت کرتے اور اس کی تحسین کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھدی گئی، تو میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں''

یہ خوبصورت اور برمحل مثال یہ بتاتی ہے کہ انبیاء علیہ السلام کے کاموں کی تکمیل محمد ﷺ کے ذریعہ ہوئی ہے، خود محمد ﷺ نے کوئی گوشہ نامکمل نہیں چھوڑا ہے جس کی تکمیل کے لیے اگلے نبی کی ضرورت ہو۔

قرآن کی آیت میں ''خاتم'' کا جو لفظ آیا ہے اس کے معنی مہر کے ہیں اور ختم

---

[۱] بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین
[۲] مسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین

کرنے والے کے، جب کوئی خط لکھتا ہے یا کوئی حاکم فرمان جاری کرتا ہے تو اپنے خط اور فرمان کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مہر لگا دیتا ہے، مہر فرمان جاری کرنے والے اور خط لکھنے والے کی پہچان بھی ہوتی ہے اور خط اور فرمان کے ختم ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو "خاتم النبیین" فرمایا ہے یعنی اللہ کی طرف سے آپ سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کا اعلان بھی ہیں اور اللہ کی طرف سے نبوت کے سلسلہ پر مہر لگانے کی پہچان بھی ہیں۔

محمد ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء کرام تشریف لائے ان میں سے کسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کا اعلان نہیں کیا اور نہ کسی نبی نے یہ دعوی کیا کہ میں آخری نبی ہوں۔ بلکہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی، سب نبیوں کے بعد اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تھے انہوں نے بھی محمد ﷺ کی نبوت کی بشارت دی، جس کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہے:

وَاِذْقَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىٓ اِسْرَائِيْلَ اِنِّى رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُصَدِّقاً لِمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَّاْتِى مِنْۢ بَعْدِ اسْمُهٗ اَحْمَدُ (الصف۔ ٦)

اور یاد کرو عیسیٰؑ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی ہے۔ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

مگر محمد ﷺ کے متعلق خود قرآن پاک نے بھی "خاتم النبیین" کہا اور خود آپ نے بھی اپنے آخری رسول ہونے کا اعلان فرمایا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔[1]

---

[1] ترمذی، ابواب الرؤیا، باب ان رویا المومن جزء من ستة واربعین جزءاً من النبوة

رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، میرے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آئے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کلما هلک نبیٌ خلفهٗ نبی وانه لانبی بعدی وسیکون خلفاء، فیکثرون. [۱]

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء علیہم السلام کرتے تھے، جب ایک نبی کی وفات ہوجاتی تو دوسرا نبی اس کی جگہ قیادت کرتا تھا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا البتہ میرے خلیفہ ہوں گے جو بہت ہوں گے۔

یہ حدیث صاف صاف بیان کرتی ہے کہ اللہ نے محمد ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجا ہے اب قیامت تک کسی نبی کے آنے کا امکان نہیں ہے بلکہ ایک روایت میں تو یہ بھی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا لو کان موسی حیا ما وسعه الا اتباعی [۲] اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو وہ بھی اپنی رسالت کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ میرا اتباع کرتے۔

آخری زمانہ میں مسیح دجال کا ظہور ہوگا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے مگر وہ اپنی نبوت کا دعویٰ نہیں کریں گے بلکہ امت محمدؐ میں شامل ہو کر دجال کا مقابلہ کریں گے۔ [۳]

دوسرے انبیاء پر رسول پاک ﷺ کی فضیلت کا اہم پہلو یہی ہے اللہ تعالیٰ نے ان تمام انبیاء کا خاتم آپ کو بنا کر بھیجا ہے۔

---

[۱] بخاری، کتاب المناقب

[۲] ترمذی، ابواب المناقب

[۳] بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ علیہ السلام

نبی علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

انا محمد وانا احمد وانا الماحی الذی یمحی بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی وانا العاقب والعاقب الذی لیس بعدهٗ نبیٌّ .[1]

میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں، میرے ذریعہ کفر کو مٹایا جائے گا، میں حاشر ہوں میرے بعد لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک تمام اہل ایمان کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جو شخص محمدؐ کے بعد بھی کسی نبی کا قائل ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے آنے کی بھی پیشین گوئی فرمائی ہے، چنانچہ حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے فرمایا:

انہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لانبی بعدی .[2]

میری امت میں تیس کذاب پیدا ہوں گے سب اپنے کو نبی ظاہر کریں گے جب کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

رسول پاک کی اس پیشین گوئی کے مطابق جھوٹے نبی آتے رہے اور اپنی نبوت کا دعوی کرتے رہے، ان کو جاہل اور بے دین ماننے والے بھی مل گئے، مگر امت نے ان کے جھوٹ اور فریب کو سمجھ لیا، خواہ وہ عرب کے اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب ہوں یا

---

[1] مسلم، کتاب الفضائل، باب فی اسماء رسول اللہ ﷺ

[2] ابوداؤد، کتاب الفتن

ہندوستان کے غلام احمد قادیانی ہوں، اللہ کے رسول محمد ﷺ سے محبت ان کے اتباع اور ان کی روشن تعلیم کا یہ اثر ہے جب کبھی نبوت کا کوئی دعویدار اٹھتا ہے امت پر اس کی جعل سازی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

کیونکہ رسول پاک نے فرمایا ہے:

انی ترکتکم علی شریعة بیضاء لیلها و نهارها سواءٌ [۱]

(اے لوگو! میں نے تم کو ایک روشن شریعت پر چھوڑا ہے، اس کی رات اور دن دونوں برابر ہیں۔

یعنی رات بھی دن ہی کی طرح روشن ہے، دین کے معاملہ میں کوئی شخص تم کو اندھیرے میں نہیں ڈالے گا، دھوکہ اور فریب نہ دے سکے گا، ہاں اگر کوئی خود ہی شریعت کی روشنی سے منہ موڑ لے تو اس کو تاریکی میں بھٹکنے اور گمراہ ہونے سے کون روک سکتا ہے؟

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کا ثبوت پیش کروں، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا جو شخص اس سے نبوت کا ثبوت مانگے گا وہ بھی اسلام سے خارج ہوگا، کیونکہ محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، یہ شخص جھوٹا ہے اس کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نبوت کے بعض جھوٹے دعویداروں نے نبوت کی تقسیم کی ہے، حقیقت میں نبوت کی کوئی تقسیم نہیں ہے، نبی ﷺ فرماتے ہیں:

لم یبق من النبوة الا المبشرات [۲]

نبوت ختم ہو چکی ہے، مبشرات یعنی سچے خواب باقی ہیں۔

محمد ﷺ کی نبوت کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کو سیرت پاک کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کامل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[۱] ابن ماجہ، مقدمہ

[۲] بخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات

اسوہ صحابہؓ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

مُحَمَّدُ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ تَرَاھُمْ رُکَّعاً سُجَّداً یَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَاناً سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ. ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرَاۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ، کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَغْفِرَۃً وَّاَجْراً عَظِیْماً. (الفتح. ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا کہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق وتائید کرنے کے ساتھ ان کے صحابہ کی تعریف وتوصیف بھی فرمائی ہے، اور خاص طور پران کی دوخوبیوں کا تذکرہ فرمایا ہے ایک تو ان کی مومنانہ اور برادرانہ شان کہ وہ دشمنان اسلام پر سخت اور محبان اسلام پر نرم ہیں، کافروں کے معاملہ میں قوی اور مومنوں کے معاملہ میں رحیم ہیں۔یعنی

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اور دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ رکوع اور سجدہ کی حالت میں یعنی نمازوں کا اہتمام کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اوران کی عبادت کے آثاران کے چہرہ سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے دل کا نوران کی پیشانی سے نمایاں ہوتا ہے۔انسان کا چہرہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے اس کے دل کی حالت اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتی ہے آدمی کے دل میں اگرغروروتکبر ہےتو وہ چہرہ سے ظاہر ہےاوراگرآدمی کے دل میں عجز و انکسار ہےتو وہ بھی چہرہ سے عیاں ہے، صحابہ کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا فضل اور رضوان تلاش کرتے ہیں یہ جذبہ ان کو اخلاص کی دولت سے مالا مال کرتا ہے، اور یہ دولت ایمان ان کے پرنور چہروں سے عیاں ہوتی ہے۔

حضرت امام مالک نے فرمایا کہ شام کے عیسائی جب ان صحابہ کو دیکھتے جنہوں نے ملک شام کو فتح کیا تھا تو کہتے بخدا یہ لوگ حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں سے بہتر ہیں، ایک جنگ کے موقع پر بادشاہ روم کے دربار میں ان کے ایک وزیر نے صحابہ کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی ”رہبان باللیل فرسان بالنہار“ وہ لوگ رات کے راہب تہجد گذار ہیں اوردن کے مجاہد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول ﷺ کی مثال کاشت کاری اور کھیتی سے دی ہے جیسے ایک زمین میں بیج سے پودا بنتا ہے، پودے میں شاخیں آتی ہیں، شاخوں میں بالیاں آتی ہیں اور پورا کھیت ہرا ابھرا ہوکر اپنے کاشتکار کی خوشی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح محمد ﷺ کی ایک شخصیت سے ایمان کا جو پودا اگا وہ صحابہ کرام کی شکل میں، مضبوط توانا پودوں اور ہری بھری کھیتی کی طرح لہلانے لگا، اللہ تعالیٰ کو ایمان کی یہ کھیتی بہت پسند آئی۔

اللہ نے حضرات صحابہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار جس تمثیل کے ذریعہ کیا ہے، اس کا بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مواعظ میں بھی ہے جو عہد نامہ جدید مرقس کی انجیل میں موجود ہے۔ صحابہ کرام سے خوش ہونے کا صاف صاف تذکرہ سورۃ الفتح کے اندر اس طرح کیا گیا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً. (الفتح . ۱۸)

اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مکہ کے قریب رسول اللہ ﷺ فروکش تھے، اور حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ کے سرداروں کے پاس بھیجا تھا یہ کہنے کے لیے کہ ہم لڑنے نہیں بلکہ عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں، عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے، اس لیے ہمیں عمرہ کرنے سے نہ روکا جائے، اس موقع پر اہل مکہ نے حضرت عثمانؓ کو روک لیا اور خبر یہ مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گیے، دوسری طرف رات میں کچھ کفار گھات لگا کر محمد ﷺ کو قتل کرنے آئے جو گرفتار ہوئے اس موقع پر حضور پاک نے حضرات صحابہ سے اللہ کی راہ میں لڑنے اپنی جان قربان کرنے کے لیے بیعت لی جو اسلامی تاریخ میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہے، حضرات صحابہ کی جانثاری، فداکاری کا جذبہ اللہ کو اتنا پسند آیا کہ ان سے خوش ہونے کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

جن لوگوں نے نبی پاک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انکی قدر کی، دل سے

ایمان لائے، ان کی مجلس کے ساتھی بنے، اپنی سیرت و کردار کو ان کی تعلیم سے منور کیا، اپنے گھر بار کو ان کے چراغ ہدایت سے روشن کیا، تنگی و بدحالی میں ان کا ساتھ دیا، جان و مال ان پر نچھاور کیا، اسلام کی آبیاری اپنے آنسوؤں اور خون جگر سے کی، ان کے مقام و مرتبہ کا کیا کہنا، ان کی عظمت و رفعت کا کیا کہنا، سچ مچ یہی لوگ تھے جن سے اسلام کا بول بالا ہوا اور اسی لیے اللہ نے ان سے اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار فرمایا۔

حضرات صحابہ گلستان نبوت کے وہ پھول تھے، جن کا رنگ تو الگ الگ تھا، جن کی شکلیں تو جدا جدا تھیں مگر ان کی خوشبو ایک تھی، وہ خوشبو ان کے ایمان وعمل اور کردار کی تھی، اور یہ خوشبو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحابیت کی تھی، چنانچہ اگر آپ غور کریں گے تو آپ پائیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اگر اجمال ہے تو سیرت صحابہ اس کی تفصیل ہے۔ جس صحابی میں بھی عظمت وعزت کا جو پہلو روشن ہوا ہے وہ رسول پاک کی صحبت کا اثر ہے، اور حضرات صحابہ کے کردار کی روشنی سے جو تاریخ اسلام منور ہے وہ دراصل نور محمدی کی جلوہ افشانی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ الفتح میں مختصراً محمد رسول اللہ فرمایا، پھر والذین معہ کے ذریعہ تفصیل سے کردار صحابہ پر روشنی ڈالی۔

عظمت صحابہؓ کی ہزاروں مثالیں کتب سیرت میں ملتی ہیں جو ہر عہد اور ہر ملک کے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ صرف ایک واقعہ سنیے، جہاد کا ایک موقع تھا، اس موقع پر جہاد کا سامان سواری اور ہتھیار وغیرہ جمع کرنے کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے زیادہ سے زیادہ رقم فراہم کرنے کی اپیل فرمائی، ہر صحابی کو جتنی توفیق ملی وہ لے کر رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا موقع آتا تو حضرت ابوبکر آگے رہتے، اس مرتبہ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ یہ موقع ہے کہ میں ان سے سبقت لے جاؤں گا، چنانچہ اپنا مال لے کر حضور کی خدمت میں پہونچے، حضورؐ نے پوچھا عمرؓ بتاؤ تم اللہ کی راہ میں کیا لے کر آئے اور گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے؟ حضرت عمرؓ نے

جواب دیا کہ میں نے اپنے سارے مال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصہ گھر والوں کے لیے چھوڑا اور دوسرا حصہ اللہ کی راہ میں لے کر حاضر ہوا۔ رسول پاک نے پھر حضرت ابوبکرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ابوبکرؓ تم بتاؤ کہ اللہ کی راہ میں کیا لے کر آئے اور اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، گھر میں جو کچھ تھا وہ سب اللہ کی راہ میں لے کر آ گیا اور گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو چھوڑا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آپ سے کہا کہ اللہ کی قسم کوئی حضرت ابوبکرؓ کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا۔

کردار کی یہ عظمت دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتی، دین سے دنیا کمانے کا کیا سوال، دین پر تن من دھن لٹا کر سکون محسوس کرتے تھے، اسی کردار نے دین کو پھیلایا، اور اسی کردار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو دوست اور ساتھی بنایا، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

> ''وہ لوگ جن کی پیروی کرنی چاہیے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، وہ لوگ اس امت کے افضل ترین لوگ تھے، ان کے دلوں میں اللہ کی اطاعت وفرماں برداری تھی، وہ دین کا گہرا علم رکھتے تھے، اور تکلف سے دور رہتے تھے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا تھا، مسلمانو! تم ان کا مقام پہچانو! ان کا اتباع کرو، اور ان کے اخلاق وسیرت کو مضبوطی سے پکڑو کیونکہ وہ لوگ صراط مستقیم اور اللہ کی بتائی ہوئی راہ ہدایت پر تھے'' [1]

رافضیوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سوائے چند کے سب صحابہ مرتد ہو گئے تھے، اسی لیے یہ لوگ حضرات صحابہ پر تبرا کرتے ہیں اور ان کو گالیاں دیتے ہیں، نعوذ باللہ جو لوگ منافق تھے ان کا پول خود قرآن نے کھول کر رکھ دیا اور جو لوگ مرتد ہوئے ان سے حضرت ابوبکرؓ نے خود جہاد کیا، یہ دونوں فرقے منافقین اور مرتدین کے ہرگز صحابی

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

نہیں، حضرات صحابہ کرامؓ ان سے بری ہیں۔ حضرات صحابہ وہ ہیں جن کا خاتمہ ایمان کی حالت میں ہوا اور ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں میں ہے، ان پاک نفوس صحابہ کو برا بھلا کہنا بدبختی اور بددینی کی سب سے بڑی دلیل ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لاتسبوا اصحابی فوالذی نفسی بیدہ لو ان احدکم انفق مثل احد ذهبا ماادرک مد احدهم ولا نصیفهٔ[۱]

میرے صحابہ کو گالیاں نہ دینا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان میں سے کسی ایک کے خرچ کردہ مد کے برابر بھی نہیں پہونچ سکتے۔

بعض صحابہؓ میں آگے چل کر باہم اختلاف بھی ہوا، بالخصوص خلافت کے مسئلہ پر جنگ بھی ہوئی، جنگ جمل اور جنگ صفین، عہد صحابہ کی ناخوشگوار یادیں ہیں، ان واقعات کی وجہ سے امت کے بہت سے لوگ طرفدار بن کر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کون حق پر تھا اور کون باطل پر تھا اس کا فیصلہ ہم آج کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان معاملات میں امت کو اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، وہ راستہ جس کی طرف امام مالک نے اشارہ فرمایا ہے اور یہ آیت تلاوت کی ہے:

تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. (البقرہ - ۱۴۱)

وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کی کمائی ان کے لیے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لیے ہے، تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسوہ صحابہؓ پر چلنے کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[۱] مسلم، کتاب الفضائل، باب تحریم سب الصحابة

پاکی اور صفائی

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید۔ اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّھَّرُوْا وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْداً طَیِّباً فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِنْہُ مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (المائدہ۔ ٦)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منھ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو، بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منھ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اسلام میں پاکی اور صفائی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ پاکی اور صفائی کو عبادت کی

شرط قرار دیا گیا ہے، بغیر پاکی کے نماز نہیں ہوتی۔ نماز ہی کیا کوئی بھی عبادت ناپاکی کی حالت میں نہیں ہو سکتی، نماز کے لیے پاک وصاف ہونا ضروری ہے، وضو کرنا بھی ضروری ہے، جب انسان پانچ وقت نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرے گا تو اس کے جسم کے ظاہری اعضا پاک وصاف رہیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ:

اذا توضا العبد المسلم او المومن فغسل وجههٗ خرج من وجهه کل خطيئة نظر اليها مع الماء او مع آخر قطر الماء فاذا غسل يديه خرج من يديه کل خطيئة بطشتها يداه مع الماء او مع آخر قطر الماء فاذا غسل رجليه خرجت کل خطيئة مشتها رجلاهٗ مع الماء او مع آخر قطر الماء حتى يخرج نقيا من الذنوب [1]

جب مومن یا مسلم بندہ وضو کرتا ہے اور چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرہ سے ہر وہ گناہ جسے اس نے نگاہ سے دیکھا ہے پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے، اور جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو جو گناہ اس نے ہاتھوں سے پکڑ کے کیا ہے وہ پانی کے ساتھ یا اس کے آخری قطرہ کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو جو گناہ پاؤں سے چل کر کیا ہے پانی کے ساتھ یا اس کے آخری قطرہ کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

عبادت کے لیے پاکی اور صفائی کا اہتمام کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس لیے دیا ہے کہ عبادت اندرونی پاکی ہے، دل ودماغ کی پاکی ہے، اس پاکی کو حاصل کرنے کے لیے جسم اور لباس کی پاکی بھی حاصل ہونی چاہیے، جس طرح پاکیزہ روح کے لیے پاکیزہ جسم ضروری ہے اسی طرح عبادت کے لیے طہارت لازم ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الطہارۃ، باب خروج الخطایا مع ماء الوضوء، ترمذی، ابواب الطہارۃ

نماز کا اہتمام دن رات میں پانچ مرتبہ کرنا فرض ہے اور پانچ مرتبہ پاکی اور صفائی کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت چاہتی ہے کہ بندہ ہر وقت اور ہمیشہ پاک وصاف رہے، گندگی اور ناپاکی اس پر اثر انداز نہ ہو، پاکی اور صفائی کا یہ مطالبہ صرف جسم تک محدود نہیں ہے بلکہ لباس اور جگہ کا پاک ہونا بھی ضروری ہے، اگر لباس ناپاک ہو تو نماز نہیں ہوگی، جگہ ناپاک ہو تب بھی نماز نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا ہے **یا ایھا المدثر . قم فانذر . وربک فکبر** ۔ (المدثر: ۳-۱) اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبر دار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ اسلام پاکی اور صفائی کی کتنی اہمیت اور ضرورت محسوس کرتا ہے، اگر مسلمان اس تعلیم کو اپنے عمل میں ڈھالے تو دنیا میں اس سے زیادہ پاک وصاف کون سی قوم ہو سکتی ہے، بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو پابندی سے غسل نہیں کرتے، ان کے بدن سے بدبو آتی ہے، وہ پابندی سے لباس نہیں بدلتے، ان کے لباس سے بدبو آتی ہے، لوگ ان کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے، فرشتے بھی ان کے قریب نہیں جاتے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک شخص مسجد میں آیا اس کے بدن زرد آلود تھے آپ نے فرمایا کہ کاش اس سے تم لوگ کہتے کہ اسے دھولیتا۔[۱]

یہ مسجدیں جہاں ہم نماز ادا کرتے ہیں ان کی پاکی اور صفائی بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے دو جلیل القدر نبیوں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو مسجد کو پاک وصاف رکھنے کا حکم دیا تھا۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ-۱۲۵)

میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ہمارے زمانہ میں لوگ مسجد کی صفائی کو شان کے خلاف سمجھتے ہیں، جن لوگوں

---

[۱] شمائل ترمذی، باب ماجاء فی خُلق رسول اللہ ﷺ

کو مسجد کی خدمت کے لیے مقرر کیا جاتا ہے وہ بھی غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں، مسجد کے وضو خانے اور طہارت خانے گندے اور بدبودار ہوتے ہیں، لیکن آپ ذرا ترقی یافتہ ممالک میں جائیں ان کے استنجا خانوں کو دیکھیں، آپ کو گندگی اور بدبو کا احساس نہیں ہوگا، ایک زمانہ تھا جب کہ یورپ کے عیسائی غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم سمجھتے تھے اور پاکی اور صفائی کا خیال نہیں رکھتے تھے، اس زمانہ میں مسلمان اندلس، افریقہ، مصر اور شام میں شاندار حمام یعنی غسل خانے اور طہارت خانے بنواتے تھے اور طہارت و نظافت کا اہتمام کرتے تھے، آج معاملہ الٹ گیا ہے، مسلمانوں کی جگہ اہل یورپ نے لے لی اور مسلمان پیچھے رہ گئے۔

بہت سے لوگ بیڑی سگریٹ پی کر مسجد میں آ جاتے ہیں، اچھی طرح منہ صاف نہیں کرتے، ان کے منہ سے بدبو آتی ہے، نمازی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں رسول پاک ﷺ نے پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کی بو سے فرشتوں کو اذیت ہوتی ہے، مگر آج لوگ بیڑی سگریٹ نہیں چھوڑتے، حالانکہ یہ صحت کے لیے بھی مضر ہے، کم از کم اتنا بھی نہیں کرتے کہ نماز سے پہلے بیڑی سگریٹ نہ پئیں یا اچھی طرح برش اور مسواک کر کے آئیں۔

مسواک کرنا، منہ صاف رکھنا صحت و صفائی کے نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے اور سنت رسول ﷺ بھی ہے، اکثر دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض صفائی میں غفلت کی وجہ سے ہوتے ہیں، رسول پاک نے دن میں پانچ مرتبہ مسواک کرنے کا حکم دیا ہے اگر ہم مسلمان اس پر عمل کریں تو دانتوں کے مرض سے بھی محفوظ رہیں گے اور سنت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل کریں گے، رسول پاک فرماتے ہیں:

"تسوّکوا فان السواک مطھرۃ للفم مرضات للرب ، ما
جاء نی جبریل الا اوصانی بالسواک حتی لقد خشیت
ان یفرض علیّ وعلی امتی[1]

[1] ابن ماجہ، ابواب الطہارۃ، السواک

مسواک کیا کرو، کیونکہ مسواک منہ کو پاک صاف کرتا ہے، اللہ کی
خوشنودی کا ذریعہ ہے جبریل امین ہمیشہ مجھے مسواک کرنے کی
تاکید کرتے یہاں تک کہ مجھے لگا کہ کہیں مسواک کرنے کو مجھ پر
اور میری امت پر فرض نہ کردیا جائے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے گھروں اور محلوں کا حال دیکھیے، ہماری عمارتوں میں مکڑی کے جالے ملیں گے، سامان گرد آلود اور بے ترتیب نظر آئیں گے، اور ہمارے محلوں میں غلاظت بکھری نظر آئے گی، گھر کی گندگی سڑک پر لاکر ڈالنے والے زیادہ ملیں گے، استعمال کیے ہوئے غلیظ چیتھڑے اور ٹکڑے بھی نظر آئیں گے، نالیاں گندی اور تعفن سے بھری ملیں گی، اکثر وبیشتر پڑوسی آپس میں کوڑا کرکٹ اور گندگی کے مسئلہ میں ایک دوسرے سے الجھتے ملیں گے، صفائی کی کمی صحت کو متاثر کرتی ہے، نتیجہ میں مسلم محلوں میں بیماریوں کی بھی کثرت ملے گی، مسلمانوں کی شہری اور شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاں کہیں رہیں جگہ کو پاک صاف رکھیں، گھر کی صفائی کریں، پاس پڑوس کی صفائی پر توجہ دیں، خود آگے بڑھ کر یہ کام کریں، کمیٹیاں بنائیں، میونسپلٹی سے مدد لیں۔ ہر آدمی یہ طے کرلے کہ وہ صفائی کے لیے ہفتہ میں ایک دن تھوڑا وقت نکالے گا، تو مسلم گھروں میں صحت وصفائی اور ایمان کے اثرات کا مظاہرہ ہوگا، اور مسلم معاشرہ اہل جنت کا معاشرہ ہوگا۔

خاص طور پر عید الاضحیٰ کے زمانہ میں قربانی کے جانور کا خون، ہڈیاں، فضلات جس طریقہ سے مسلم محلوں میں سڑتے اور تعفن پھیلاتے ہیں وہ صحت وصفائی کے سلسلہ میں برا تاثر پیش کرتے ہیں۔ فضلات کو دفن کرنا چاہیے، گندگی کو دھونا چاہیے اگر محلوں میں قربانی کے فضلات کو دفن کرنے کی گنجائش نہ ہو تو قربانی کا اہتمام باہر جاکر کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے

ان اللّٰہ تعالیٰ طیب یحب الطیب، نظیف یحب

النظافة ، كريم يحب الكرم جَوَادٌ يحب الجودَ فنظّفوا افنيتكم ولا تشبهوا باليهود ۔[1]

اللہ تعالیٰ پاک ہے پاکی کو پسند کرتا ہے، صاف ہے صفائی کو پسند کرتا ہے، شریف ہے شرافت کو پسند کرتا ہے، سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے تم لوگ اپنے آنگنوں کو صاف ستھرا رکھو اور یہودیوں کی مشابہت نہ کرو۔

اسلام کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف پاکی اور صفائی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ زینت اور خوبصورتی کی بھی تعلیم دیتا ہے، زیب وزینت پاکی اور صفائی سے بھی اونچی چیز ہے، ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی گھمنڈ اور تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، ایک شخص نے پوچھا کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں جوتے اچھے ہوں (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' ان الله جميل ويحب الجمال'' اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔[2]

یاد رکھیے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جن کا باطن یا ظاہر گندہ ہو بلکہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جن کا باطن اور ظاہر دونوں پاکیزہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْن (البقرہ۔۲۲۲)

اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے توبہ کریں اور پاکیزگی اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو پاک وصاف رہنے اور اپنے سماج کو پاکیزہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---

[1] ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی النظافۃ

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

نماز باجماعت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّلیْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْداً. وَمِنَ الَّلیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَاماً مَحْمُوْداً. (بنی اسرائیل-۷۹-۷۸)

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا راب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کرے اور اس کی مرضی کے مطابق دنیا کو آباد کرے، اس کی ہدایت کو تسلیم کرے اور اس کے حکم کو نافذ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ. (الذاریات-۵۶)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اگر انسان اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارے تو اس کی پوری زندگی عبادت ہے، یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا، سونا، جاگنا اور ذاتی وسماجی کام کرنا سب عبادت ہے، مگر عبادت کی کچھ خاص شکلیں بھی ہیں جن میں روزہ، نماز، حج، زکوۃ، جہاد

وغیرہ شامل ہیں، ان سب میں اہم عبادت نماز ہے، نماز برائیوں، بے حیائیوں سے بچاتی ہے۔ نماز اللہ سے ملاقات ہے، نماز سر افگندگی ہے، نماز خود سپردگی ہے اور نماز کامل بندگی ہے۔ انسان جب نماز ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ محبت اور مسرت سے اس کی عبادت کو دیکھتا ہے، فرشتوں کو گواہ رکھتا ہے اور بندے کی نماز کو شرف قبولیت عطا کرتا ہے، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

''میں نے نماز کو اپنے اور بندہ کے درمیان برابر تقسیم کرلیا ہے اور بندہ جو کچھ مانگتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں، جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی، جب بندہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی، جب بندہ کہتا ہے مالک یوم الدین تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری تمجید کی اور اپنا معاملہ میرے سپرد کردیا، جب بندہ کہتا ہے ایاک نعبد وایاک نستعین تو اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے، جب بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو مانگا ہے وہ اسے ملے گا''۔[1]

اللہ کا ذکر انسان کو تروتازہ رکھتا ہے اور اس کے دل کو مردہ ہونے سے بچاتا ہے، ذکر کی مختلف شکلیں ہیں اور مکمل شکل نماز ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے ''اقم الصلوۃ لذکری'' (طٰہٰ-۱۴) نماز قائم کرو میری یاد کے لیے۔

جب بندہ نماز پڑھتا ہے، تو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے اور ایسا ذکر جس میں صرف زبان نہیں بلکہ اعضاء و جوارح اور دل و دماغ سب مشغول ہوتے ہیں۔

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے نماز کو مومن کی معراج فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر نماز معراج میں فرض ہوئی تھی اور پچاس وقت کی نمازیں فرض ہوئی تھیں، پھر اللہ نے بندے کی سہولت کی خاطر تخفیف کی اور پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں، معراج میں رسول پاک کو اللہ تعالیٰ کا تقرب اور ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، جب مومن نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تو گویا وہ بھی اللہ سے شرف ملاقات حاصل کرتا ہے اور جب نماز میں قراءت اور تسبیح واذکار کرتا ہے تو گویا اپنے رب سے بات کرنے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ رسول پاک علیہ ﷺ فرماتے ہیں:

ان احدکم اذا صلی یناجی ربه[1]

جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔

نماز کی ایک ہیئت اور جسم ہے اور دوسری چیز نماز کی جان اور روح ہے۔ نماز کی روح خشوع اور خضوع ہے، تضرّع اور دل کی بے قراری ہے، کامیاب نماز وہی ہے جس میں خشیت ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (المومنون:۲-۱)

یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

جب انسان اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اسے اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے کا احساس ہونا چاہیے اور اس حضوری کی کیفیت سے اسے سرشار ہونا چاہیے، جس نماز میں خشیت نہ ہو وہ بظاہر نماز تو ہے مگر ایسی نماز جو روح سے خالی ہے، ایسی محنت جو سرور سے خالی ہے۔

نماز کی ہیئت اور شکل اس کی شرائط، ارکان، واجبات اور سنن ومستحبات ہیں جن سے نماز مرکب ہے، اگر ان ارکان میں سے کسی کو چھوڑا تو نماز نہیں ہوگی۔

---

[1] بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب المصلی یناجی ربه

واجبات میں سے کسی کو چھوڑا تو سجدہ سہو کرنا ہوگا۔ نماز کے ان ارکان وآداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک شخص مسجد نبوی میں حاضر ہوا، اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے، اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور حضور کی خدمت میں آ کر سلام کیا، حضور نے اس کے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی فرمایا: جاؤ پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ شخص گیا اور پھر اسی طرح نماز پڑھ کے حضور کے پاس آ گیا، آپ نے اسے پھر حکم دیا کہ جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس نے پھر ویسی ہی عجلت میں نماز ادا کی اور حاضر خدمت ہو گیا۔ تین یا چار مرتبہ نماز دہرانے کے بعد اس نے پوچھا اللہ کے رسول مجھے نماز کا طریقہ بتائیے، تو آپ نے فرمایا:

> ''اچھی طرح وضو کرو، قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو، پھر قرآن کی آیات پڑھو، پھر رکوع کرو اور اطمینان سے رکوع کرو، پھر سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو اور اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سر اٹھاؤ اور اطمینان سے بیٹھو، پھر اطمینان سے دوسرا سجدہ کرو، پھر سر اٹھاؤ اور بیٹھ جاؤ''[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص تعدیل ارکان نہ کرے یعنی نماز کے ہر عمل کو اطمینان اور سکون سے ادا نہ کرے اس کی نماز کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

فَاَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَّوْقُوْتاً. (النساء-۱۰۳)

نماز قائم کرو، بے شک نماز مومنوں پر اپنے مقررہ وقتوں میں فرض ہے۔

نماز قائم کرنے سے مراد دو باتوں کا اہتمام کرنا ہے، ایک تو نماز وقت پر پڑھنا، وقت سے پہلے نماز فرض نہیں ہوتی اور وقت گذر جانے کے بعد ادا نہیں ہوتی بلکہ قضا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرض نماز تنہا نہ پڑھنا بلکہ جماعت کے ساتھ ادا

---

[۱] بخاری، کتاب الاذان، باب امر النبیؐ الذی لایتم رکوعہ بالاعادۃ

کرنا، جو نماز تنہا پڑھ لی جاتی ہے اسے نماز قائم کرنا نہیں کہتے، نماز قائم اسی وقت ہوتی ہے جبکہ مسجد میں جا کر جماعت سے پڑھی جائے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اگر تم نے نمازیں اپنے گھروں میں پڑھ لیں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا تو تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا''۔[۱]

شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ فرض نمازیں مسجد میں ادا کی جائیں اور نفل اور تہجد کی نمازیں گھروں میں ادا کی جائیں، جو لوگ اس طرح نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحَاتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ-۲۷۷)

جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔

نماز رب العالمین سے ملاقات کا شرف ہے، اس سے اپنی فیملی اور اہل و عیال کو محروم نہ رکھنا چاہیے بلکہ ان کو نماز کی ترغیب اور تاکید کرنی چاہیے۔یہی جذبہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کی اس دعاء میں پوشیدہ تھا:

رَبِّ اجْعَلْنِی مُقِيْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِی رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ. (ابراہیم-۴۰)

اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگوں کو اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار میری دعا قبول کر۔

اور یہی حکم اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیا ہے:

وَامُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لاَ نَسْئَلُكَ رِزْقاً نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی. (طٰہٰ-۱۳۲)

---

[۱] مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ

اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔
ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے
ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

نماز کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل ہے، نماز مومن و کافر میں تمیز کرتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ. (الروم-۳۱)
نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں:

بین الکفر والایمان ترک الصلوۃ [1]
کفر وایمان کے درمیان ترک صلوۃ ہے۔

نماز پڑھنے کی عادت ڈالیے کیونکہ جو لوگ دنیا میں سجدہ کرنے سے روگردانی کرتے ہیں، قیامت کے دن وہ اگر اللہ کو سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کر پائیں گے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلاَ
یَسْتَطِیْعُوْنَ ہ خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ، وَقَدْ کَانُوْا
یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سَالِمُوْنَ. (القلم:۴۳-۴۲)
جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے
بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے، ان کی نگاہیں نیچی ہوں
گی، ذلت ان پر چھارہی ہوگی۔ یہ جب صحیح وسالم تھے اس وقت
انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)۔

اللہ تعالیٰ سارے مسلمانوں کو نماز باجماعت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[1] ترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی ترک الصلوٰۃ

نماز جمعہ کی فضیلت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یَـا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِن یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَـاسْـعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوالْبَیْعَ ذَالِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُـنْتُـمْ تَعْلَمُوْنَ. فَـاِذَا قُـضِیَـتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَـغُوْا مِنْ فَـضْـلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْراً لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (الجمعۃ:۱۰-۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔

یوں تو سارے ہی دن اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں، مگر جس طرح اللہ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے، اسی طرح جمعہ کے دن کو باقی ایام پر فضیلت عطا کی ہے، اسی لیے جمعہ کا دن سید الایام کہلاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی دن وہ جنت میں داخل کیے گئے، اسی دن وہ جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ کے دن برپا

ہوگی"۔ؒ اسی مفہوم کی ایک مفصل حدیث حضرت ابولبابہ بدریؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام دنوں کا سردار اور عظمت والا جمعہ کا دن ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عظمت یوم عید اور یوم اضحیٰ سے بھی بڑھ کر ہے، جمعہ کے دن کی پانچ خصوصیات ہیں: (۱) اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا (۲) اسی دن اللہ نے حضرت آدم کو زمین پر بھیجا، (۳) اسی دن حضرت آدم کی وفات ہوئی (۴) اس دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ اللہ سے جو کچھ مانگتا ہے اللہ اسے عطا کرتا ہے بشرطیکہ حرام چیز نہ مانگے، (۵) اور اسی دن قیامت برپا ہوگی، تمام مقرب فرشتے، آسمان، زمین، ہوا، پہاڑ اور سمندر جمعہ کے دن سے ڈرے ہوئے رہتے ہیں۔[۲]

جمعہ کے دن کی فضیلت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دن جمعہ کی نماز کا اہتمام ہوتا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خاص تاکید اور ہدایت فرمائی ہے، بلکہ قرآن پاک میں پوری ایک سورہ جمعہ کے نام سے موجود ہے۔ جمعہ کی نماز دوسری فرض نمازوں سے کئی اعتبار سے فضیلت کی حامل ہے، اول یہ کہ جمعہ کی نماز کے لیے خاص طور پر غسل کرنے اور اچھے لباس پہن کر آنے کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الغسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم. [۳]

جمعہ کے دن غسل کرنا ہر بالغ مسلمان پر واجب ہے۔

---

[۱] مسلم، کتاب الجمعہ، باب فضل یوم الجمعۃ

[۲] ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ، باب فی فضل الجمعۃ

[۳] مسلم، کتاب الجمعۃ

دوسرے یہ کہ جمعہ کی نماز فرض عین ہے، اگر چھوٹ جائے تو اس کی قضا نہیں ہو سکتی، کیونکہ جمعہ کی نماز کے لیے جماعت شرط ہے، تنہا نماز جمعہ ادا نہیں کی جائے گی۔

تیسرے یہ کہ جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ جمعہ ہوتا ہے، جو اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ دین کی تعلیم اور احکام کی تفہیم وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، اس کا سننا بھی واجب ہے۔

چوتھے یہ کہ جو شخص جمعہ کی نماز کا اہتمام کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے اگلے جمعہ تک کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کرتا ہے اور حسب استطاعت پاکیزگی حاصل کرتا ہے، تیل لگاتا ہے، خوشبو استعمال کرتا ہے، پھر مسجد روانہ ہوتا ہے اور دو بیٹھے ہوئے نمازیوں کو الگ نہیں کرتا، پھر اس کو جتنی توفیق ملتی ہے (سنت) نماز پڑھتا ہے، پھر خاموشی کے ساتھ امام کا خطبہ سنتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس جمعہ سے اگلے جمعہ تک کے لیے اس شخص کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔[1]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پانچوں نمازیں اور جمعہ کی نماز اگلے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک گناہوں کو ختم کرنے والا ہے، بشرطیکہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے'' [2]

اس کے برخلاف جو شخص جمعہ کی نماز کا اہتمام نہیں کرتا غفلت اور سستی برتتا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور جس شخص کے دل پر اللہ مہر لگا دے اس کی بدنصیبی کوئی دور نہیں کر سکتا، اس کی حالت منافقوں جیسی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول پاک ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الدہن للجمعۃ

[2] مسلم، کتاب الجمعۃ

لینتھین اقوام عن ودعھم الجمعات او لیختمن اللہ علی قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین ۱؎

لوگ جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز رہیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگادے گا پھر وہ غافلوں میں سے ہوجائیں گے۔

مسلمانوں کی اکثریت جمعہ کی نماز پڑھتی ہے، اگر سب لوگ دوسری پانچ وقت کی نمازوں کا بھی اہتمام کریں تو ان کی اسلامی شان نمایاں ہوگی۔ اللہ کی رحمت نازل ہوگی اور وہ اپنی دینی ذمہ داری پوری کرکے سرخرو ہوں گے۔ جو لوگ جمعہ کی نماز ادا کرنے آتے ہیں ان کو نماز کا اہتمام اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح رسول پاک اور صحابہ کرام نے کیا ہے، یعنی اپنے تمام کاروبار جمعہ کی اذان سے پہلے چھوڑ دیں، پاک صاف ہوکر مسجد میں اول وقت تشریف لائیں۔ سنت اور نفل کا اہتمام کریں اور صف بستہ ہوکر بیٹھیں، بعد میں آنے والے اسی ترتیب سے صف بندی کرکے بیٹھیں، حضرت ابوہریرۃ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن مسجد کے ہر دروازہ پر فرشتے ہوتے ہیں اور پہلے مسجد میں آنے والوں کے نام نوٹ کرتے ہیں۲؎ بہت سے لوگ بعد میں آتے ہیں اور گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، اسے ''تخطی رقاب'' کہا جاتا ہے رسول پاک نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے ایک شخص آیا اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھا، نبی ﷺ نے فرمایا بیٹھ جاؤ تم نے لوگوں کو تکلیف پہونچائی۔۳؎

بعض حضرات خطبہ کے دوران اپنے دونوں گھٹنے اٹھا کر بیٹھتے ہیں اسے ''احتباء'' کہا جاتا ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ بیٹھنے کا صحیح طریقہ وہ

۱؎ مسلم، کتاب الجمعۃ، باب التغلیظ فی ترک الجمعۃ ۲؎ ایضاً

۳؎ ابوداؤد، کتاب الجمعۃ، باب تخطی رقاب الناس

ہے جونماز میں بیٹھنے کا طریقہ ہے، بعض حضرات خطبہ کے دوران باتیں کرتے ہیں۔ رسول پاک نے اس سے بھی منع فرمایا ہے، نماز ادا کرنے کے آداب کا لحاظ رکھنا اور سنتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

نماز جمعہ کے ختم ہونے کے بعد چار رکعت سنت کا بھی اہتمام کرنا چاہیے، خواہ دو دو رکعت پڑھی جائیں یا اکٹھا چار رکعت ادا کی جائیں۔ جو لوگ نماز جمعہ ختم ہوتے ہی چلے جاتے ہیں اگر وہ مسجد میں سنت ادا نہ کرسکیں تو اپنے گھر جاکر ضرور ادا کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اذا صلى احدكم الجمعة فليصل بعدها اربعة" [1]

جب تم جمعہ کی نماز ادا کرلو تو اس کے بعد چار رکعت نماز پڑھو۔

جمعہ کا دن دعا کی قبولیت کا دن ہے، اس دن اعمال صالحہ کے ساتھ دعا کا اہتمام کرنا چاہیے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

ان في الجمعة لساعة لا يوافقها مسلم يسأل الله فيها الا اعطاه اياه. [2]

جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ بندہ مسلم اس وقت اللہ تعالیٰ سے جو بھی خیر کی دعا کرتا ہے اللہ اسے قبول کرلیتا ہے۔

دعا کے ساتھ اس دن نبی ﷺ پر درود بھیجنے کا بھی التزام کرنا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان من افضل ايامكم يوم الجمعة فاكثرو على من الصلوة فيه فان صلوتكم معروضة على. [3]

---

[1] مسلم، کتاب الجمعۃ، فصل فی استحباب اربع رکعات اوالرکعتین

[2] مسلم، کتاب الجمعۃ، باب فی الساعۃ التی یوم الجمعۃ

[3] ابوداؤد، کتاب الجمعۃ، باب فضل یوم الجمعۃ

تمھارے دنوں میں جمعہ کا دن بہترین ہے، اس دن تم مجھ پر
کثرت سے درود بھیجو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جمعہ کا دن گونا گوں فضائل اور محاسن کا حامل ہے، اسے تمام دنوں سے زیادہ اہمیت کے ساتھ گذارنا چاہیے، اس دن پاکیزگی ،نماز جمعہ، درود اور اعمال خیر کا اہتمام کرنا چاہیے، یہ دن ایسا ہے کہ اس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی، دوسری قومیں ہفتہ میں ایک دن چھٹی تو مناتی ہیں، مگر اس طرح عبادت کا، مذہبی اجتماعیت کا اور پاکیزگی کا اہتمام نہیں کرتیں، اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ سے زیادہ اس دن کے دینی تقاضے ادا کرنے کی توفیق دے۔(آمین)

گھمنڈ اور تکبر

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَلاَ تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلاَ تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحاً
اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ . (لقمان– ۱۸)

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

کبر و غرور اور گھمنڈ ایسی برائی ہے کہ آدمی کو ذلیل و خوار کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند عمل انسانوں کا غرور اور گھمنڈ ہے، اللہ تعالیٰ متکبر انسان کے غرور کو خاک میں ملا دیتا ہے اور اس کا سر نیچا کر دیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ جناب نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ:

یقول اللہ عزو جل العز ازاری، والکبریاء ردائی،
فمن نازعنی فی واحد منهما فقد عذبته.[۱]

غلبہ میرا ازار اور تکبر میری چادر ہے جو شخص ان دونوں میں سے کسی کے بارے میں مجھ سے تنازع کرتا ہے میں اسے عذاب دوں گا۔

نبی ﷺ نے پچھلی قوموں میں سے ایک شخص کا قصہ بیان فرمایا کہ وہ ایک قیمتی لباس پہن کر نفس پسندی میں مبتلا ہو گیا، سر مٹکاتا ہوا غرور سے چل رہا تھا۔ اللہ

---

[۱] مسند احمد ۲/ ۳۴۸

تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی جا رہا ہے۔ ۱

تکبر کرنے والا انسان پہلے خود پسندی میں مبتلا ہوتا ہے، اپنے آپ کو اونچی چیز سمجھنے لگتا ہے، پھر دوسروں کو حقیر اور گھٹیا سمجھتا ہے، تکبر کی یہی دونوں علامتیں ہیں۔ یہ دونوں باتیں جس شخص میں پیدا ہو جائیں وہ اپنی بربادی کا سامان خود کرنے لگتا ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوعؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

لا یزال الرجل یذھب بنفسہ حتی یکتب فی الجبارین فیصبہ ما اصابھم. ۲

انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا نام گھمنڈ کرنے والوں میں لکھا جاتا ہے پھر وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، جس کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر" ۳

وہ شخص جنت میں نہ جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر و گھمنڈ ہوگا۔

ایک شخص نے پوچھا کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں، کیا یہ بھی گھمنڈ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ جمیل ویحب الجمال الکبر بطر الحق وغمط الناس. ۴

اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، تکبر حق سے رو گردانی اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔

جب انسان غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو نیچی نظر سے دیکھتا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، ان کی برائی کرتا ہے، ان کا مذاق اڑاتا ہے، ان

---

۱ مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم التبختر فی المشی مع اعجابہ بثیابہ
۲ ترمذی، کتاب البر، باب ماجاء فی الکبر
۳ مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر
۴ مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر

کی توہین کرتا ہے اور پھر یہاں سے ظلم و زیادتی، دست درازی اور مردم آزاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے غرور و تکبر صرف ایک برائی نہیں بلکہ متعدد برائیوں کو جنم دیتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی وجہ سے مومنوں کو ایک دوسرے کا مذاق اڑانے سے روکا ہے کہ یہ تکبر کی بھی علامت ہے اور مردم آزاری بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسىٰ اَنْ يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلاَ نِسَاءٌ مِّنْ نِسَاءٍ عَسىٰ اَنْ يَّكُنْ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلاَ تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلاَ تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (الحجرات-۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

حضرت عیاض ابن حمارؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰہ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یفخر احدٌ علی احدٍ ولا یبغی احدٌ علی احدٍ[1]

اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں

---

[1] مسلم، کتاب الجنۃ، باب الصفات التی یعرف بہا فی الدنیا اھل الجنۃ واھل النار

تک کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر فخر وغرور نہ کرے اور نہ کوئی شخص
کسی دوسرے پر زیادتی اور دست درازی کرے۔

انسان بہت سے اسباب اور وجوہ کے تحت غرور میں مبتلا ہوتا ہے، کبھی انسان کو حسب ونسب اور خاندان وبرادری کا غرور ہوتا ہے، کبھی اسے قد وقامت اور حسن وجوانی کا غرور ہوتا ہے، کبھی اسے مال ودولت کا غرور ہوتا ہے اور کبھی عہدہ و اقتدار کا غرور ہوتا ہے، کبھی اسے عقل وفہم اور علم کا غرور ہوتا ہے اور کبھی اسے اپنی عبادت اور زہد وتقویٰ کا غرور ہوتا ہے، غرور جس وجہ سے بھی ہو اور جس شکل میں بھی ہو شیطانی عمل ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کا ذریعہ ہے۔

انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی کی خاصیت عاجزی اور انکساری ہے، انسان کا دشمن شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور اس کی خاصیت غرور وتکبر کا مظاہرہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کا پتلہ بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی تو ابلیس کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرے، مگر ابلیس غرور کے مارے اکڑ گیا، آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، اللہ کے حکم سے روگردانی کی، اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل وخوار کر کے نکال دیا، قرآن میں ہے۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (الاعراف:۱۱-۱۳)

پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا

تھا؟ بولا، میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔ فرمایا، ''اچھا، تو یہاں سے نیچے اُتر، تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے، جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔

شیطان آدم کو سجدہ نہ کرنے اور کبر وغرور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے رحمت خداوندی سے دور ہوا اور دھتکار کر نکالا گیا تو وہ انسان کا ازلی دشمن بن گیا، وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی مغرور اور گھمنڈی ہو کر اللہ کی رحمت سے دور ہو جائے، چنانچہ جب کوئی شخص تکبر کرتا ہے تو وہ ابلیس لعین کا اتباع کرتا ہے اور اس کو خوش کرتا ہے، اس لیے جو انجام ابلیس کا ہوا وہی انجام اس کے نقش قدم پر چلنے والے مغرور و متکبر انسان کا بھی ہوتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت اور جہنم میں مباحثہ ہوا، جہنم نے کہا کہ میرے اندر بڑے بڑے ظالم اور متکبر و مغرور لوگ ہیں، جنت نے جواب دیا کہ میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ نے جنت و جہنم کے مباحثہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے جنت تو میری رحمت ہے میں جسے چاہتا ہوں تیرے ذریعہ اپنی رحمت سے نوازتا ہوں اور اے جہنم تو میرا غضب ہے تیرے ذریعہ جسے چاہتا ہوں عذاب دیتا ہوں اور تم دونوں کا پیٹ بھرنا میرے اوپر ہے۔[1]

جنت امن وسکون اور رحمت وسلامتی کی جگہ ہے، اس کے حق دار وہی لوگ ہیں جن میں عاجزی، فروتنی، انکساری، تواضع اور خاکساری ہے۔ گھمنڈی، مغرور اور متکبر لوگوں کے لیے مناسب جگہ جنت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا

---

[1] مسلم، کتاب التوبۃ، باب جہنم اعاذنا اللہ منہا

فِی الْاَرْضِ وَلاَ فَسَاداً وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔(القصص-۸۳)
آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کردیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے۔

انسان دنیا میں فخر وغرور اور گھمنڈ اس لیے کرتا ہے کہ اسے بڑا سمجھا جائے، دوسروں سے وہ ممتاز ہو، یہ احساس آدمی کو غرور میں مبتلا کرتا ہے، اوراس کا اظہار وہ مختلف طریقہ سے کرتا ہے، کبھی وہ زمین پر اکڑ کے چلتا ہے، کبھی اپنے کپڑے زمین پر لٹکا کر چلتا ہے، کبھی گردن ٹیڑھی کرتا ہے اور سیدھے منہ بات نہیں کرتا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ بلندی تکبر سے نہیں تواضع سے حاصل ہوتی ہے، تکبر سے تو ذلت اور خواری نصیب ہوتی ہے۔اگر کسی شخص کو پہاڑ کے اوپر چڑھنا ہو تو اسے جھک کر چڑھنا ہوگا، جبھی وہ بلندی تک پہنچ سکے گا۔اگر وہ اکڑ کے چڑھنے کی کوشش کرے گا تو اوپر جانے کے بجائے زمین پر گر جائے گا، یہی حکمت رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں ہے۔آپ نے فرمایا:

ما تواضع احدٌ للّٰہ الا رفعه الله.[۱]
جب کوئی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ اسے سر بلند کردیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم، عقل، جسمانی صحت، دولت، منصب اور حیثیت سے نوازا ہے ان کو چاہیے کہ اللہ کی ان نعمتوں کا شکر تواضع کے ذریعہ کریں، کیونکہ درخت جب پھل دار ہوتا ہے تو اس کی شاخیں جھک جاتی ہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو کبر وغرور سے محفوظ رکھے اور عاجزی وانکساری کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

---

[۱] مسلم، کتاب البر والصلة والآدب، باب استحباب العفو والتواضع

توبہ اور استغفار

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. (الزمر:۵۴-۵۳)

اے نبی کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے، پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمھیں مدد نہ مل سکے۔

ہر قسم کے گناہ گاروں، خطا کاروں، اور مجرموں کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت وخوشخبری کا اعلان ان آیات میں کیا گیا ہے، کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جس کی توبہ نہ ہو اور کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کی معافی نہ ہو، شرط صرف صدق دل کے ساتھ توبہ اور استغفار ہے، ایک شخص زندگی بھر کفر وشرک میں مبتلا رہتا ہے، دن رات اللہ کی نافرمانی اور بغاوت میں گذارتا ہے اور آخر عمر میں اسے کفر وشرک سے توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور وہ کفر سے توبہ کر کے دائرہ اسلام میں آ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے

سارے گناہ معاف کر کے اپنے دامن رحمت میں پناہ دے دیتا ہے۔

اسی طرح کسی مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، خواہ وہ گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اگر وہ صدق دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، گناہ کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس سے بندہ توبہ کرے اور اللہ کے یہاں اس کی معافی نہ ہو، اللہ کی مغفرت کا سمندر انسانوں کے گناہوں سے بہت زیادہ وسیع ہے۔

نبی ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک پیشہ ور مجرم کا واقعہ بیان فرمایا کہ اس شخص نے ننانوے لوگوں کا قتل کیا تھا، پھر اسے اپنے جرم پر شرمندگی ہوئی، اس نے بنی اسرائیل کے ایک عابد وزاہد سے پوچھا کہ وہ ننانوے قتل کا مجرم ہے۔ کیا اللہ کے یہاں اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ اس عابد نے کہا کہ تیری توبہ قبول نہیں ہوسکتی، اس شخص نے مایوس ہوکر اس عابد کو بھی قتل کر دیا اور سو مقتولوں کی تعداد پوری کر دی، پھر اس کے ضمیر نے جھنجھوڑا اور وہ توبہ کرنے کے لیے ایک عالم کے پاس پہونچا اور پوچھا کہ اس نے پورے ایک سو انسانوں کو قتل کیا ہے، کیا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ اس عالم نے جواب دیا کہ تیرے اور تیری توبہ کے درمیان کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی بشرطیکہ تم توبہ کرنے کے ساتھ، یہ بستی اور ماحول چھوڑ دو جس میں تم مجرمانہ اقدام کرتے رہے ہو اور وہاں چلے جاؤ جہاں اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔

چنانچہ اس شخص نے توبہ کی اور بستی چھوڑ کر اس علاقہ کی طرف چلا جہاں یہ مجرمانہ ماحول نہیں تھا، راستہ میں اس کی موت کا وقت آ گیا، رحمت اور عذاب کے دو فرشتے وہاں آئے اور باہم مباحثہ کرنے لگے، عذاب کے فرشتہ نے کہا یہ شخص خونخوار مجرم تھا میں اسے دوزخ میں لے جاؤں گا، رحمت کے فرشتہ نے کہا، یہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے عبادت کی سرزمین میں آ چکا تھا، میں اسے جنت میں لے جاؤں گا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم دیکھو کہ اس نے کتنا راستہ طے کر لیا تھا، جب فرشتوں نے دیکھا تو وہ آدھا راستہ طے کر چکا تھا اور بالشت بھر اس

سرزمین میں آگے جاچکا تھا جہاں اسے ہجرت کرنی تھی، چنانچہ رحمت کے فرشتے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ ۱

بندہ اپنے اوپر خود ہی توبہ کا دروازہ بند کرلیتا ہے اللہ کبھی اپنی مغفرت اور رحمت کا دروازہ بندنہیں کرتا، وہ کہتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ (البقرہ۔۲۲۲)

اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جوتوبہ کریں اور پاکیزگی اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ بندوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خطا کریں تو توبہ کریں۔ انسان خطا و نسیان کا عادی ہے، اس سے انجانے میں غلطی ہوتی ہے، وہ جان بوجھ کر بھی خطا کا ارتکاب کرتا ہے، اسے چاہیے کہ اللہ سے توبہ کرے، اس سے گڑگڑا کر معافی مانگے اور گناہوں سے پاک زندگی گذارنے کا عہد کرے۔ بلکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ:

> والذی نفسی بیدہٖ لو لم تذنبوا لذھب اللّٰہ بکم ولجاء بقومٍ یذنبون فیستغفرون اللّٰہ تعالیٰ فیغفرلھم. ۲
>
> اللہ کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم سے گناہ سرزد نہ ہوتو اللہ تم کو اٹھالے گا اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے پھر اللہ سے توبہ واستغفار کریں گے اور اللہ ان کی مغفرت کرے گا۔

ذنوب اور معاصی میں فرق ہے ذنوب چھوٹے گناہوں کو کہا جاتا ہے اور معاصی دیدہ ودانستہ نافرمانی یعنی بڑے گناہ کو کہا جاتا ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم سے خطا ہوتی ہے تو ہونے دو مگر تم توبہ اور استغفار کرتے رہو، یہ مطلب نہیں کہ تم کبیرہ

---

۱ مسلم، کتاب التوبۃ، باب قبول توبۃ القاتل وان کثر قتلہ

۲ مسلم، کتاب التوبۃ، باب سقوط الذنوب بالاستغفار

گناہوں کا ارتکاب کرو یہ سوچ کر کہ توبہ کرلیں گے، مثلاً زنا کاری، ڈاکہ زنی، چوری، قتل، سودخوری، وغیرہ یہ سمجھ کر کرنے لگو کہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ کیا ہے ہم توبہ کرلیں گے۔ یہ خطا کاری نہیں بلکہ ڈھٹائی ہے اور گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے، اس سے بچنے کی قرآن وحدیث میں بڑی تاکید کی گئی ہے، توبہ کی قبولیت کے لیے چند بنیادی تعلیمات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ انسان کو اپنے گناہ پر ندامت اور شرمندگی ہو، وہ اپنے گناہ پر اصرار نہ کرے، اپنے گناہ کا تصور کر کے احساس جرم اس کو ستائے، جب تک اپنے گناہ پر انسان کو شرمندگی اور ندامت نہ ہو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوْا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (آل عمران . ۱۳۵)

اور ان کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کرسکتا ہو، اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ توبہ اسی گناہ کی قبول ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان میں کی گئی ہو، جس میں کسی انسان کا حق مارا نہ گیا ہو، اگر کسی انسان کا حق مارا ہے، تو توبہ کی شرط یہ ہے کہ پہلے اس انسان کا حق ادا کیا جائے اور اس سے معافی مانگی جائے، مثلاً کسی کی چوری کی ہے، ڈاکہ ڈالا ہے تو پہلے چوری اور لوٹ کا مال اس کے مالک کو لوٹائے۔ یا کسی کو قتل کیا ہے تو پہلے اس کے وارث کو دیت یا قصاص ادا کرے یا وارث اسے معاف کردے، کسی کی زمین جائداد پر قبضہ کیا ہے تو پہلے اسے مالک کو لوٹائے تبھی توبہ

قبول ہوسکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیوان اللہ کے یہاں تین طرح کے ہونگے۔ ایک دیوان حقوق العباد کا ہوگا۔ جب تک بندہ معاف نہیں کرے گا اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔

تیسرے یہ کہ توبہ صدق دل سے کی جائے، دل میں اپنے کیے ہوئے گناہ سے نفرت ہو اور پختہ ارادہ ہو کہ آئندہ اس گناہ کا ارتکاب نہیں کریں گے، اسی کو قرآن نے ''توبۃ النصوح'' کہا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْآ اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحاً عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (التحريم . ۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کردے اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل فرمادے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

چوتھے یہ کہ انسان اپنے گناہ سے توبہ کرنے کے ساتھ اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کرے۔ یعنی اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ اس نے واقعی توبہ کی ہے اور اب وہ توبہ کے تقاضے پورے کررہا ہے، مثلاً جس گناہ میں وہ مبتلا ہوا تھا اب اس کے قریب جانے سے بھی گریز کررہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوبارہ اسی گناہ میں مبتلا ہوجائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْم (الانعام . ۵۴)

اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو وہ اسے معاف کردیتا ہے۔

سورہ الفرقان میں چند بڑے گناہوں اور ان کی سزا کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَاُوْلٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ وَّکَانَ اللّٰہُ غَفُوْراً رَّحِیْمَا.

(الفرقان . ۷۰)

اِلاّ یہ کہ توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔

گناہ سے توبہ کرنے کے بعد عمل صالح کرنا، ایک پاکیزہ زندگی گذارنے کا اعلان اور اظہار ہے، اس طرح توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔ امجد حیدر آبادی نے کہا ہے:

جب اپنی خطاؤں پر میں شرماتا ہوں — اک خاص سرور قلب میں پاتا ہوں
توبہ کرتا ہوں جب گنہ سے امجد — پہلے سے زیادہ پاک ہوجاتا ہوں

توبہ کرنے سے انسان پاک بھی ہوتا ہے اور اللہ اس کے رزق میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

”من لزم الاستغفار جعل اللہ لہٗ من کل ضیق مخرجا، ومن کل ھم فرجا، ورزقه من حیث لایحتسب“[۱]

جس شخص نے استغفار کا التزام کیا اللہ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ نکالے گا، ہر غم سے نجات دے گا، اور اس طرح اسے رزق دے گا کہ اسے گمان بھی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ واستغفار کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---

[۱] سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستغفار

عمل صالح

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَّلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

(النحل . ۹۷)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ایمان کے بعد جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ عمل صالح ہے، ایمان کی مثال بنیاد کی ہے اور عمل صالح کی مثال عمارت کی، جس طرح بنیاد کے بغیر کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی اسی طرح ایمان کے بغیر عمل صالح کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف بنیاد کافی نہیں ہوتی مثلاً سردی وگرمی اور بارش سے بچاؤ کے لیے، اپنی جان ومال کی چوروں اور اچکوں سے حفاظت کے لیے اور آرام و آسائش کے لیے عمارت کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح دنیا میں پاکیزہ زندگی گذارنے کے لیے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنت حاصل کرنے کے لیے عمل صالح بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عمل صالح کے لیے پیدا کیا ہے اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ
عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (الملک . ۲)

جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے
کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی
ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔

عمل صالح ہر وہ نیک عمل ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق مومن انجام دیتا ہے، خواہ وہ فرائض ہوں جیسے روزہ نماز، حج زکوٰۃ جہاد وغیرہ، یا معاملات سے متعلق ہو مثلاً سود نہ کھانا، دھوکہ نہ دینا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، یا معاشرت سے متعلق ہو جیسے والدین، میاں بیوی اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنا، یا اخلاقیات سے متعلق ہو جیسے سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، مہمان نوازی کرنا، پاکدامن رہنا، یا خدمت خلق سے ہو جیسے محتاجوں کی مدد کرنا، مریضوں کی خدمت کرنا، مدرسہ، مسجد، سرائے، پل، اور ہسپتال وغیرہ بنانا یعنی ہر وہ کام کرنا جس سے دنیا اور آخرت میں فائدہ ہو بشرطیکہ وہ ایمان اور شریعت کے مطابق کیا گیا ہو عمل صالح ہے، یہ عمل صالح مومن کی زندگی کا حاصل ہے اور اس کی پہچان ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومن کے عمل کو عمل صالح اور کافر کے عمل کو عمل فساد سے تعبیر کیا ہے، مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اصلاح اور بناؤ کے عمل میں لگا رہتا ہے اور کافر کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی اور بگاڑ کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ مومن کی سرگرمیاں بھلائی خیر اور نیکی کے لیے ہوتی ہیں اور کافر کی سرگرمیاں گناہ اور فتنہ و فساد پر مبنی ہوتی ہیں۔ جس طرح ان دونوں کی زندگیاں الگ الگ سرگرمیوں میں گزرتی ہیں اسی طرح ان کا انجام بھی الگ الگ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ

كَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ
وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَايَحْكُمُوْنَ (الجاثیه . ۲۱)

کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے
ہیں کہ ہم انھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں
کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟
بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔

جو لوگ عمل صالح کرتے ہیں اگر ان سے لغزشیں ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور ان کے عمل کی وجہ سے ان کی لغزشوں کو معاف کرتا ہے، ان کی پاکیزگی کو برقرار رکھتا ہے اور ان کی عزت کو داغدار ہونے سے بچاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِى كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (العنکبوت . ۷)

اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی
برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین
اعمال کی جزا دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مومنوں کو عمل صالح کا پورا پورا بدلہ بھی دیتا ہے، اپنی طرف سے ان کا اعزاز واکرام بھی کرتا ہے اور جنت میں بہترین ٹھکانہ بھی انہی کو عطا کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَانُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ
اَحْسَنَ عَمَلاً (الکهف . ۳۰)

وہ لوگ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار
لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

عمل صالح کو اپنی زندگی کا اصول اور دستور بنانے والے لوگ ہی دراصل ملک اور سماج کے بہترین لوگ ہوتے ہیں، ان کو سماج کا مکھن کہا جاسکتا ہے، یہی لوگ معاشرہ کی تعمیر وترقی کا ذریعہ ہوتے ہیں، جن لوگوں کی زندگی عمل صالح سے خالی ہوتی ہے وہ معاشرے پر بوجھ ہوتے ہیں، اس کی تباہی وتنزلی کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایمان وعمل سے خالی لوگوں کو شَرُّ الْبَرِيَّة یعنی بدترین انسان قرار دیا ہے اوراس کے مقابلہ ایمان وعمل صالح سے آراستہ لوگوں کو خَيْرُ الْبَرِيَّة یعنی بہترین انسان قرار دیا ہے۔ بہترین انسان ہی بہترین ٹھکانہ یعنی جنت کا حق دار ہے، قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِکَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ . جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَداً رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (البینه . ۸–۷)

جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے یہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔

صرف آخرت کی کامیابی اور جنت کی حصولیابی کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط نہیں ہے بلکہ دنیا میں بھی باعزت مقام ومرتبہ حاصل کرنے کے لیے حکومت اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کی شرط لگائی ہے، اللہ کی طرف سے حکومت انہی بندوں کو عطا ہوتی ہے جو ایمان وعمل صالح سے مزین ہوتے

ہیں۔ فاسق وفاجر، مفسد اور ظالم و بد باطن لوگ اگر حکومت پر قابض ہو بھی جائیں تو اللہ کی مدد ان کو حاصل نہیں ہوتی اور نہ ان کی حکومت کو استحکام اور دوام حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوالصّٰلِحٰتِ
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ
وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ
بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْناً یَعْبُدُوْنَنِی لَایُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئاً وَمَنْ
کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُوْلٰئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور۔۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

جب تک مسلمان اپنی سوچ، مثبت، تعمیری اور پاکیزہ نہیں بنائیں گے وہ اپنی موجودہ پستی سے نکل نہیں سکیں گے، خوف وہراس کی نفسیات تبدیل نہ ہوسکے گی، دشمنوں کا رعب ان کے دلوں میں جمارہے گا اور وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے رہیں گے، ترقی کرنے کے لیے پاکیزہ فکر، پاکیزہ عمل، اصلاح اور تعمیر کی سوچ ضروری ہے، یہ صفت مسلمانوں کے چند افراد میں پایا جانا کافی نہیں بلکہ امت کو بحیثیت امت یہ صفت اختیار کرنا ضروری ہے اور جب یہ امت ایمان کی بنیاد پر عمل صالح کی تعمیر

کرے گی تو اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوگا، وہ زمین میں اسے دوبارہ عظمت واقتدار عطا کرے گا جس طرح ہمارے آقا محمد ﷺ اور ان کے پاک صحابہ کو عطا کیا تھا۔

آج ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہمارے دلوں میں حقیقی ایمان کی روشنی کم ہوگئی ہے، عمل سے ہم غافل ہوگئے ہیں، عمل صالح ہمارے پاس نہیں ہے، دنیا پرستی نے ہمیں دین فروشی تک پہونچادیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بے وقعت اور بے وزن محسوس کرتے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جو اخلاقی طاقت اور جرات ہمارے اندر ہونی چاہیے وہ باقی نہیں ہے، شاید ایسے ہی حالات کی پیشین گوئی اور رہنمائی کرتے ہوئے جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا۔

بادروا بالاعمال فتناً كقطع الليل المظلم يصبح الرجل مومنا ويمسى كافرا اويمسى مومنا ويصبح كافرا يبيع دينهٔ بعرض من الدنيا[۱]

اعمال صالحہ میں سبقت کرو، عنقریب اندھیری رات کی طرح فتنہ اٹھے گا، صبح میں انسان مومن ہوگا، شام کو کافر ہوگا اور شام کو مومن ہوگا صبح کو کافر ہوگا، اپنے دین کو دنیا کے سامان کے عوض بیچ ڈالے گا۔ ایمان فروشی کا مظاہرہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اس فتنہ سے بچائے، دنیا پرستی اور دین فروشی سے محفوظ رکھے اور ایمان و عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

۱؎ مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی المبادرۃ بالأعمال

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران. ۱۱۰)

دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیر امت بنایا ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی خیر خواہی کرے اور ان کا بھلا چاہے،اس خیر خواہی کی شکل یہ بتائی گئی کہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے،معروف ہر وہ نیک کام ہے جس کا تقاضا انسان کی فطرت کرتی ہے،خواہ وہ انسانوں سے تعلق رکھتا ہو مثلاً تعلیم وتہذیب، صلہ رحمی،غربا پروری،یتیموں سے سلوک محبت،سخاوت اور فیاضی،شرم وحیا،عاجزی اور پاکیزگی وغیرہ یا اللہ سے تعلق رکھتا ہو جیسے ایمان ویقین،روزہ،نماز حج زکوٰۃ جہاد اور ذکر وتلاوت وغیرہ،اس کے مقابلہ میں منکر ہر وہ برا کام ہے جسے انسان کی عقل سلیم برا سمجھتی ہو اور جسے اللہ رب العزت نے برا کہا ہو،مثلاً بے حیائی اور بدکاری،کنجوسی اور بخل،تکبر، جہالت،ناپاکی،جھگڑا لڑائی،فرائض سے غفلت،فتنہ فساد وغیرہ۔

معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کی ذمہ داری بحیثیت امت سارے مسلمانوں پر ہے،اور یہ ایسا فریضہ ہے جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی،لیکن پوری

امت اس کام کو انجام نہ دے سکے تو مسلمانوں میں ایسے گروہ کا پایا جانا ضروری ہے جو اس کام کو بجالائے، گویا معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کے لیے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں کسی نہ کسی ایک گروہ کا اٹھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران-۱۰۴)

تم میں تو کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

مسلمانوں سے پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کی ذمہ داری اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو دی گئی تھی مگر انھوں نے اس فریضہ کو ادا کرنے میں کوتاہی برتی، اور اس کوتاہی کی سزا پائی، وہ قوم خود ہی برائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا ہوگئی اور ان میں جو تھوڑے لوگ ان برائیوں سے محفوظ تھے انھوں نے خطا کاروں کو روکنے ٹوکنے اور ان کی اصلاح کرنے کا کام چھوڑ دیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر غضب نازل کیا، ارشاد ہوا:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدہ-۷۹-۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انھوں نے

ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا،
برا طرز عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بنی اسرائیل میں خرابی اس طرح پیدا ہوئی کہ ان کا آدمی جب دوسرے خطا کار سے ملتا تھا تو کہتا تھا کہ اے بندہ خدا، اللہ سے ڈرو اور جو برائی کر رہے ہو اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے، پھر اگلے دن اس سے ملتا تھا اور وہ بدستور اپنے غلط کاموں میں لگا رہتا تو وہ اس کو منع کرنے کے بجائے، اس کا ساتھی اور اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن جاتا، جب ان لوگوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض کی وجہ سے بعض پر مہر لگادی۔[۱]

بنی اسرائیل کے بعد انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ امت مسلمہ کو سونپا گیا، ان کو منصب امامت پر فائز کیا گیا اور ان کو خیر امت کا لقب دیا گیا تاکہ وہ انسانوں کو معروف کے کاموں کی ترغیب دیں اور برے کاموں سے روکیں، یعنی دنیا میں بھلائی کو رواج دیں اور برائی کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کا مقام اس طرح بیان کیا:

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً (البقرہ ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ
تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

جس طرح کوئی حکومت کسی شہر میں قانون اور امن قائم کرنے کے لیے اپنا آفیسر مقرر کرتی ہے، پھر وہاں جرم و فساد اور بد امنی ہو تو مجرموں کو تو سزا دی جاتی ہے اس کے ساتھ اس آفیسر سے بھی باز پرس کیا جاتا ہے، اس کا ٹرانسفر ہوتا ہے یا اسے معطل کیا جاتا ہے، اسی طرح جب معاشرہ میں برائیوں کا بول بالا ہوگا تو خطا کاروں

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنھی

اور مجرموں سے اللہ مواخذہ کرے گا، مگر ساتھ ہی مسلمانوں سے بھی جواب طلب ہوگا کہ برائیوں سے روکنے اور بھلائی کو پھیلانے کی ذمہ داری تمہیں سونپی گئی تھی، تم نے اپنی ذمہ داری سے غفلت کیسے برتی؟ تمہارے سامنے برائیاں ہورہی تھیں، اللہ کے بندے ستائے جارہے تھے، اللہ کا حکم پامال ہورہا تھا مگر تم نے ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی، حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والذی نفسی بیدہٖ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر اولیوشکن اللّٰہ ان یبعث علیکم عقابا منہٗ ثم تدعونہٗ فلا یستجیب لکم۔[1]

اللہ کی قسم تم لوگ ضرور معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، ورنہ خطرہ ہے کہ اللہ تم پر عذاب نازل کردے تم اس سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ ہو۔

جب کسی سماج میں برائی اور بدکاری کا رواج ہوتا ہے تو برائی کرنے والوں کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود تو برائی میں مبتلا نہیں ہوتے مگر برائی سے روکتے بھی نہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ سے مطلب ہے دوسروں سے کیا لینا دینا، آج کل مغربی تعلیم کی وجہ سے اپنے آپ میں سمٹ کر رہنے کا جو رجحان پیدا ہوا ہے اس کی وجہ سے یہ خیال عام ہوتا جارہا ہے کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھو، دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت کرنا بالکل ٹھیک نہیں ہے لیکن برائیوں سے روکنا تو انسانی اور مذہبی فریضہ ہے ورنہ برائیوں کا وبال سب کو لے ڈوبے گا، خطاکار اور پارسا دونوں تباہ ہوں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو آگاہ کیا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الانفال، ۲۵)

اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھیں

---

[1] ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو اور
جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

رسول پاک علیہ وسلم ﷺ نے اس بات کو ایک تمثیل کے ذریعہ بیان فرمایا ہے، جس کی روایت حضرت نعمان ابن بشیرؓ نے کی ہے، آپ نے فرمایا:

''جو اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے اور جو خلاف ورزی کرتا ہے اس کی مثال اس گروہ کی ہے جس نے ایک کشتی سفر کرنے کے لیے لی، بعض کو اوپر کی منزل ملی اور بعض کو نیچے کی منزل ملی، جو لوگ نیچے کی منزل میں تھے ان کو پانی لینے کے لیے اوپر جانا پڑتا تھا، وہ کہنے لگے، اگر ہم کشتی میں سوراخ کرلیں تو یہیں سے پانی مل جائے گا، ہم کو اوپر جانے کی ضرورت نہ پڑے گی اور اوپر والوں کو تکلیف نہ دینی پڑے گی، اگر اوپر والے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں کہ وہ جو چاہیں کریں تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے اور اگر وہ لوگ نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں اور کشتی میں سوراخ کرنے سے روک دیں تو سب کے سب سلامت رہیں گے'' [۱]

بہت سے دیندار لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں کو صرف معروف کا حکم دینا چاہیے منکر سے روکنا نہیں چاہیے، یعنی ہم لوگوں کو نماز و روزہ حج زکوٰۃ صدقات خیرات وغیرہ کی تلقین تو کریں، مگر شراب نوشی، زنا کاری، سود خوری، ظلم و زیادتی اور جھگڑا فساد سے نہ روکیں، کیونکہ جب ہم دوسروں کو ان کی برائیوں پر ٹوکیں گے تو وہ ہمیں پریشان کریں گے اور تکلیف پہونچائیں گے۔

یہ سوچنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کے خلاف ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے بھی خلاف ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کا دین میں یکساں مقام ہے بلکہ برائیوں کے ماحول میں نہی عن المنکر کا فریضہ زیادہ اہم ہے، اس کی وجہ سے پریشانیاں آسکتی ہیں، ان کو برداشت کرنا انبیاء کی سنت اور صحابۂ کرامؓ کا اسوہ ہے اور یہ بڑے مرتبہ کی بات ہے۔ قرآن پاک میں نصیحت ہے:

---

[۱] ترمذی، ابواب الفتن، باب منہ

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ
عَلٰى مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (لقمان۔۱۷)

بیٹا نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی
پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

رسول پاک ﷺ نے جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید فرمائی ہے اسی طرح اس کو انجام دینے کا طریقہ بھی بتایا ہے، اگر آدمی اسے دھیان میں نہ رکھے تو ایک برائی کو ختم کرنے کے لیے وہ اس سے بڑی برائی کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن جائے گا، اور تشدد و تباہ کاری معاشرہ میں پھیل جائے گی۔ آپ نے فرمایا:

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہ
فان لم یستطع فبقلبہ و ذٰلک اضعف الایمان [1]

تم میں سے جو شخص کوئی برا کام ہوتے ہوئے دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، جس کے اندر اس کی طاقت نہ ہو وہ اسے اپنی زبان سے برا کہے اور جس کے اندر اتنی بھی طاقت نہ ہو وہ اسے دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

بہت سی برائیاں ملکی قانون میں بھی جرم ہوتی ہیں، ایسی برائیوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، بہت سی برائیاں سماج کے لیے خطرناک ہوتی ہیں ان کے خلاف رائے عامہ ہموار کیا جاسکتا ہے، اور اس کے خلاف پبلک سپورٹ حاصل کی جاسکتی ہے۔ بہت سی برائیاں دینی لحاظ سے نقصان دہ ہیں، ان کو ختم کرنے کے لیے دعوت و تبلیغ، افہام و تفہیم سے کام لیا جاسکتا ہے، یہ ساری چیزیں حکمت سے تعلق رکھتی ہیں، امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں معروف و منکر کا علم ہو اور ہم برائی کو ختم کرنے کی حکمت عملی سے بھی واقف ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو برائیوں سے بچنے نیکیوں پر عمل کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کی توفیق دے (آمین)

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان

اخلاق کی عظمت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

نٓ. وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ. مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ. وَاِنَّ لَکَ لَاَجْراً غَیْرَ مَمْنُوْنٍ. وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم)

ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

انسان کے پاس سب سے بڑی دولت ایمان کی دولت ہے اور سب سے بڑی قوت اخلاق کی قوت ہے۔ ایمان انسان کے دل اور دماغ کو منور کرتا ہے اور اخلاق انسان کے وجود اور شخصیت کو سنوارتا ہے، ایمان اندر کی روشنی ہے اور اخلاق باہر کی روشنی ہے ایمان کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب انسان کا اخلاق اچھا ہو، بداخلاق انسان کی شخصیت ہی داغدار نہیں ہوتی ہے بلکہ ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا[۱] کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔

عبادت اہم چیز ہے، مگر اس کا تعلق صرف اللہ سے ہے، جب کہ اخلاق کا تعلق اللہ سے بھی ہے اور انسانوں سے بھی ہے، اسی لیے اسلام میں اخلاق کو عبادت پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔ حضرت ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مامن

---

۱ ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ

شیٌ یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق[۱] قیامت کے دن مومن بندے کے میزان عمل میں کوئی چیز اچھے اخلاق سے زیادہ باوزن نہیں ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ وہ کونسی چیز ہے جو زیادہ تر لوگوں کو جنت میں لے جائے گی؟ تو آپ نے فرمایا "تقوی اللہ وحسن الخلق" یعنی اللہ کا تقویٰ اور عمدہ اخلاق، سائل نے پوچھا وہ کونسی چیز ہے جو زیادہ تر لوگوں کو جہنم میں لے جائے گی تو آپؐ نے فرمایا "الفم والفرج" یعنی منہ اور شرمگاہ۔[۲]

منہ سے انسان بدگوئی، بدکلامی، لڑائی جھگڑا، غیبت، بہتان اور حرام خوری کرتا ہے اور شرمگاہ سے انسان بدکاری و بے حیائی کرتا ہے تو جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ جب خدا سے ڈرتا ہے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا دل اور شخصیت دونوں منور ہوتا ہے اور وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ایک انسان ہمیشہ روزہ رکھتا ہے اور ہمیشہ نوافل کا اہتمام کرتا ہے، دوسرا شخص جو فرائض پر عمل کرتا ہے مگر اس طرح روزہ اور نوافل کا اہتمام نہیں کرتا البتہ اچھے اخلاق کا حامل ہے تو اللہ تعالیٰ اس اخلاق مند کو عابد و زاہد شخص کا مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

ان المومن لیدرک بحسن خلقه درجة الصائم القائم[۳]

مؤمن اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے تہجد گذار روزہ دار کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔

دینداری کا معیار یہ ہے کہ انسان کتنا اخلاق مند ہے، اللہ کے یہاں عبادت کی کمی معاف ہو جائے گی مگر بداخلاقی پر سزا ملے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور برے اخلاق کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے یہاں بداخلاقی

---

[۱] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ما جاء فی حسن الخلق

[۲] ایضاً

[۳] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی حسن الخلق

سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے، اچھا اخلاق گناہ کو اس طرح پگھلا دیتا ہے جس طرح دھوپ برف کو پگھلا دیتی ہے، اور بد اخلاقی عمل کو اس طرح فاسد کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے“۔ [۱]

اچھے اخلاق کا حامل انسان اللہ کی رحمت سے قریب ہوتا ہے اور بد اخلاق انسان اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کو وہ مومن بندے محبوب ہیں جو اچھے اخلاق کے حامل ہیں، رسول پاکؐ نے تو وعدہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اچھے اخلاق والوں کو میں اپنے پاس بٹھاؤنگا، اور بد اخلاق شخص کو رسول پاک اپنے آپ سے دور فرمائیں گے، جس انسان کی بد اخلاقی سے دوسرے انسان دور ہو جائیں اسے یہ سزا تو ملنی ہی چاہیے کہ رسول پاک بھی اس کو اپنی صحبت سے محروم فرما دیں، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

ان من احبکم الیّ واقربکم منی مجلساً یوم القیٰمة احاسنکم اخلاقا. وان ابغضکم الی وابعدکم منی یوم القیٰمة الثرثارون والمشدقون والمتفیھقون [۲]

تم میں سب سے زیادہ محبوب میرے نزدیک اور قیامت کے دن میری مجلس میں تم میں سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں، اور تم میں سب سے زیادہ ناپسند اور قیامت کے دن میری مجلس میں سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہیں جو سخت گو اور متکبر ہیں۔

اچھے اخلاق کے بہت سے طریقے اور علامتیں ہیں، اسی طرح بد اخلاقی کے بہت سے طریقے اور علامتیں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ (۱) لوگوں سے خوش خلقی، خندہ پیشانی اور بشاشت سے ملنا اچھا اخلاق ہے اور لوگوں سے سیدھے منہ بات نہ کرنا، ان سے ترش روئی اور بدتمیزی سے پیش آنا بہت بڑی بد اخلاقی ہے، قرآن

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، سورۃ لقمان، آیت ۱۹

[۲] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی حسن العھد

پاک میں اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وَلاَ تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاس (لقمان۔۱۹) لوگوں سے اپنا چہرہ نہ ٹیڑھا کرو۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لاتحقرن من المعروف شیئا ولو ان تلقی اخاک بوجه طلق[1]

کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ تم اپنے بھائی سے مسکرا کر ملو۔

مسکرا کر ملنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور اچھے اخلاق کی علامت ہے۔

انسان دوسرے انسانوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے، ان کو اپنا ہم نوا اور گرویدہ بنانا چاہتا ہے، اور اس کے لیے مال ودولت خرچ کرتا ہے، مال ودولت سے انسان اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ عمدہ اخلاق سے ہوتا ہے، اچھے اخلاق کے ذریعہ لوگوں کا دل جیتنے کا نکتہ سمجھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انکم لاتسعون الناس باموالکم ولکن یسعهم منکم بسط وجوه و حسن خلق.[2]

تم لوگوں کو اپنے مال کے ذریعہ متاثر نہیں کرسکتے لیکن ان کو مسکراتے چہرے اور حسن اخلاق سے متاثر کرسکتے ہو۔

(۲) اچھے اخلاق کی دوسری علامت غصہ پر قابو رکھنا اور اسے پی جانا ہے غصہ کو پی جانا، لوگوں کو معاف کرنا اعلی اخلاق ہے اور بے جا غصہ کرنا، دوسرے پر اپنی سختی کا اثر جھاڑنا بڑی بداخلاقی ہے، قرآن پاک میں ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران . ۱۳۴)

جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کردیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

---

[1] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ والأدب، باب استحباب طلاقۃ الوجہ عند اللقاء

[2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ لقمان، آیت ۱۹

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص غصہ اتارنے پر قادر ہے پھر بھی غصہ کو پی جائے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے بلا کر حور عین سے نوازے گا۔[۱]

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی آپ مجھ کو نصیحت فرمایئے آپ نے فرمایا غصہ نہ کرو، اس نے پھر درخواست کی آپ نے فرمایا غصہ نہ کرو۔[۲]

(۳) اچھے اخلاق کی تیسری علامت یہ ہے کہ انسان بحث و تکرار اور جھگڑا لڑائی سے گریز کرے، بد اخلاق انسان بات بات پر لڑے گا اور اخلاق مند انسان لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> "انا زعیم ببیت فی ربض الجنة لمن ترک المراء وان کان محقا. وبیتٍ فی وسط الجنة لمن ترک الکذب وان کان مازحا وبیتٍ فی اعلی الجنة لمن حسن خلقهٗ. [۳]
>
> میں اس شخص کے لیے جنت کی کیاریوں میں ایک گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو لڑنا جھگڑنا چھوڑ دے اگرچہ وہ حق پر ہو، اور اس شخص کے لیے وسط جنت میں ایک گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو جھوٹ بولنا چھوڑ دے اگرچہ مذاق ہی میں کیوں نہ ہو اور اس شخص کے لیے جنت کے اعلیٰ حصہ میں ایک گھر کی ضمانت دیتا ہوں جس کے اخلاق عمدہ ہوں۔

(۴) اچھے اخلاق کی چوتھی علامت یہ ہے کہ انسان میں شرم وحیا اور پاکدامنی ہو، وہ برائی بے حیائی اور بدکاری سے دور رہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب من کظم غیظاً
[۲] بخاری، کتاب الایمان
[۳] ابوداؤد، کتاب الأدب

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف۔ ۳۳)

اے نبیؐ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اس نے فرمائی ہے)۔

حضرت عبداللہ عمرو بن العاص رسول کریمؐ سے روایت کرتے ہیں:

لم یکن فاحشا ولا متفحشا وقال قال رسول اللّٰہ ﷺ ان من خیارکم احاسنکم اخلاقا۔ [۱]

رسول اللہ ﷺ بے حیا اور بدگو نہ تھے بلکہ فرماتے تھے تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ انسان ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اخلاقی سلسلہ میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا نمونہ خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جن کا اخلاق قرآن کریم کی اخلاقی تعلیمات کی زندہ اور متحرک تفسیر ہے اور جن کو قرآن نے اخلاق عظیم کا حامل قرار دیا ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ **ماانتقم رسول اللّٰہ ﷺ لنفسہ** [۲] رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے معاملہ میں بدلہ نہیں لیا۔ اور خادم حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک حضور کی خدمت کی مگر کبھی آپ نے اف تک نہیں کہا۔

اخلاق کا یہ اعلیٰ معیار مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے انسانوں کے لیے نمونہ ہے، اسے اختیار کر کے ہی انسان مہذب اور شریف بن سکتا ہے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اعلیٰ اخلاقی صفات سے آراستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---

[۱] مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرۃ حیائہ
[۲] مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدتہ ﷺ للاثام

سلام کی فضیلت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
الکریم اما بعد: قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید.
اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.
وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيباً (النساء:۸۶)
''اور جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ
کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح لوٹا و اللہ ہر چیز کا حساب
لینے والا ہے۔''

دنیا کے ہر مذہب اور تہذیب میں لوگوں کے لئے آپسی ملاقات کے وقت اظہار تعلق کرنے کے لیے سلام کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ رائج ہے۔

ان سارے طریقوں میں سب سے اچھا طریقہ اسلام نے سکھایا ہے۔ جب تم کسی انسان سے ملو تو بات چیت کرنے سے پہلے اسے سلام کرو۔

یعنی کہو ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' سلام کرنے کا یہ طریقہ نہایت جامع، خوبصورت اور بابرکت ہے۔ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنٰی میں سے ایک ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سلام کرتا ہے تو گویا اسے دعا دیتا ہے کہ اللہ تم کو سارے غم والم سے دور رکھے اور تمام تکلیفوں سے سلامتی عطا کرے۔ اپنی رحمت سے نوازے اور اپنی برکتیں تم پر نچھاور کرے۔

جس شخص کو سلام کیا جا رہا ہے وہ اگر اجنبی ہے تو اس کے لیے سلام کا یہ

طریقہ انس و محبت اور ربط و تعلق کے اظہار کی ابتدا ہے۔ اور اگر اس سے تعلق کشیدہ ہے، تو سلام ترک تعلق کی تلخی میں کمی کرتا ہے اور دلوں میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ باہم ملنے اور دوریاں کم کرنے کا راستہ نکالتا ہے۔ جو شخص اپنے سامنے والے بھائی کو رنج و غم سے سلامتی کی دعا دے رہا ہے وہ گویا یہ اظہار کر رہا ہے کہ میں تم کو کسی طرح کی تکلیف نہیں پہونچاؤں گا اور اس پر وہ اللہ کا حوالہ دے رہا ہے۔

جس شخص سے تعلق اور شناسائی ہے یا قرابت اور رشتہ داری ہے، سلام کا یہ طریقہ اس سے تعلق و رشتہ داری میں اضافہ کرتا ہے اور اسے مضبوط کرتا ہے۔ جواب دینے والا جب سلام کا جواب دیتا ہے تو وہ گویا اس دوطرفہ تعلق اور محبت کو مستحکم بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ جب کوئی تم کو سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دو، یا کم از کم اتنا ہی لوٹا دو۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، جب کہ سلام کرنا سنت ہے، رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان اولی الناس بالله تعالی من بدئهم بالسّلام"[۱]۔

(اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے)۔

حضرت ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

"میں تم کو ایک ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائے گی۔ وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو"[۲]۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول پاک ﷺ کے پاس آیا اور سوال کیا کہ کونسا اسلام بہتر ہے؟ رسول پاکؐ نے جواب میں فرمایا:

"تطعم الطعام و تقرء السلام علی من عرفت و من لم

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من بدء بالسلام

[۲] سنن ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی افشاء السلام

تعرف"۱

(لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر شخص کو سلام کرو خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔)

سلام کرنا صرف ایک سماجی ادب نہیں ہے بلکہ دینی اور روحانی عمل بھی ہے، سلام کرنے پر اللہ تعالیٰ اجر عطا کرتا ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا السلام علیکم۔ نبی ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ دس نیکیاں اسے مل گئیں۔ پھر دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ نبی ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ بیس نیکیاں اسے مل گئیں۔ پھر تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ نبی ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اسے تیس نیکیاں مل گئیں۲۔

سلام کرنے کی اہمیت وفضیلت اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی نیکیوں کا ثمرہ تھا کہ صحابہ کرامؓ سلام کرنے میں سبقت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سلام کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابی طلحہؓ روایت کرتے ہیں کہ طفیل بن ابی ابن کعبؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس صبح سویرے جاتے تھے اور ان کے ساتھ بازار چلے جاتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بازار میں جس کسی کے پاس سے گذرتے تھے اسے سلام کرتے تھے۔ خواہ وہ بیوپاری ہو، کباڑی ہو یا مسکین۔ طفیلؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بازار چلنے کو کہا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے۔ آپ نہ تو خرید و فروخت کرتے ہیں نہ کسی سامان کا بھاؤ معلوم کرتے ہیں اور نہ بازار میں کہیں بیٹھتے ہیں۔ آپ یہیں بیٹھ کر باتیں کیجئے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: "اے ابوبطن! ہم تو سلام ہی کرنے کے لیے بازار

---

۱ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب افشاء السلام

۲ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب کیف السلام؛ سنن ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماذکر فی فضل السلام

جاتے ہیں اور جو کوئی ملتا ہے، ہم اسے سلام کرتے ہیں[۱]۔

سلام کرنے کا حکم تو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے کہ خواہ وہ بڑا یا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل۔ مگر سلام کرنے کا طریقہ بھی رسول پاک ﷺ نے مومنوں کو سکھایا ہے، اور وہ یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ باہر سے آنے والا مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے، کم لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں، سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے[۲]۔ رسول کریم ﷺ نے یوں تو سلام کرنے کا ایک عام اصول مقرر فرمادیا کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے اور یہ بالکل فطری تعلیم ہے، مگر خود رسول اللہ ﷺ کی شان عالی یہ تھی کہ آپ چھوٹوں کو سلام کرتے تھے۔ انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کو سلام کیا[۳]۔

ملاقات کے فوراً بعد سلام کرنا چاہئے اور بات چیت بعد میں کرنی چاہئے، رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "السلام قبل الکلام"[۴] (بات سے پہلے سلام کرو)۔

سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دینا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے۔ اور اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو جواب دینے والا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے، ان تین کلمات سے زیادہ مسنون نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا السلام علیکم یا رسول اللہ۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ، آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ ﷺ نے جواب میں صرف "وعلیک" ارشاد فرمایا۔ اس شخص نے عرض

۱۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، جامع السلام

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب من اولی بالسلام

۳۔ ایضاً

۴۔ سنن ترمذی، ابواب الاستیذان، باب السلام قبل الکلام

کیا کہ یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھ سے پہلے فلاں اور فلاں کے سلام کے جواب میں آپ نے کئی دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے صرف وعلیک فرمایا، آپ نے جواب دیا کہ تم نے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے"[۱]۔

اگر کسی دوسرے کے گھر جانا ہو تو اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اہل خانہ کو سلام کرو۔ اگر سلام کا جواب نہ ملے تو دوبارہ سلام کرو پھر جواب نہ ملے تو سہ بارہ سلام کرو۔ اگر تیسری بار بھی جواب نہ ملے تو واپس آجاو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذاسلم احدکم ثلاثا فلم یجب فلیرجع"[۲]

(جب تم میں سے کسی نے تین مرتبہ سلام کیا اور سلام کا جواب نہیں ملا تو اسے لوٹ جانا چاہیے)۔

انسان اپنے گھر میں بھی داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرنا چاہیے، اگر گھر میں کوئی نہ ہو تب بھی سلام کر کے داخل ہونا چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتاً فَسَلِّمُوا عَلَى أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" (النور،۶۱)

(جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لوگے۔)

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، سورۃ النساء، آیت ۸۶

[۲] مسند احمد، ۳۹۴/۴

حضرت ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو سے سلام کرے۔ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی شجر، کوئی دیوار یا کوئی پتھر حائل ہوجائے اور پھر ملاقات ہو تب بھی سلام کرے[۱]۔

سلام مردوں کو بھی کرنا چاہیے اور عورتوں کو بھی کرنا چاہیے۔

حضرت اسماء بنت یزیدؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم عورتوں کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے ہم کو سلام کیا[۲]۔

جب کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر کسی نے سلام کر دیا تو اس نمازی کو جواب نہیں دینا چاہیے ورنہ اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ اسی طرح کوئی شخص استنجا کر رہا ہو تو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی غیر مسلم سلام کرے تو جواب میں وعلیکم کہہ دینا چاہیے۔

سلام کے آداب میں یہ ہے کہ جب کسی مجلس میں جائیں تو سلام کریں اور جب مجلس برخواست ہو تب بھی سلام کر کے رخصت ہوں، چنانچہ حضرت ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تم میں سے کوئی شخص کسی مجلس میں پہونچے تو سلام کرے۔ اور جب مجلس سے اٹھے تو سلام کرے''[۳]۔

اگر کسی مجلس میں مسلم اور غیر مسلم سب لوگ شامل ہوں تو سب کو سلام کرنا چاہیے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں تشریف لائے، اس مجلس میں مسلمان اور یہودی سبھی شامل تھے تو آپؐ نے سب کو سلام کیا[۴]۔ اللہ ہم سب کو کثرت سے سلام کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الرجل یفارق الرجل ثم یلقاہ

[۲] ایضاً، باب فی السلام علی النساء

[۳] ایضاً، باب فی السلام اذا اقام من المجلس

[۴] سنن ترمذی، ابواب الاستیذان، باب فی السلام علی مجلس فیہ المسلمون وغیرہم

صبر وشکر

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ. (البقرہ . ۱۵۵-۵۷)

اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔

قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ. (ابراھیم-۷)

اگر شکر گذار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران

نعمت کروگے تو میری سزا بہت سخت ہے۔

ابو یحییٰ صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عجبا لامر المومن انّ امرَہ کلۂ لۂ خیر ولیس ذٰلک لاحدٍ الا للمومن ان اصابتۂ سرّاءُ شکر فکان خیرا لۂ وان اصابتۂ ضرّاء صبر فکان خیرالۂ "[1]

مومن کا معاملہ کتنا عجیب ہے کہ اس کے سارے معاملات اس کے لیے باعث خیر ہیں۔ اور یہ سعادت مومن کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے، اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس پر وہ شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہے، اور اسے تکلیف پہونچتی ہے اور اس پر وہ صبر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہے"

آزمائش اور تکلیف کو برداشت کرنے، گلہ شکوہ نہ کرنے اور اللہ پر توکل کرنے کو صبر کہتے ہیں، اور اللہ کی عطا کردہ نعمت پر اللہ کا احسان مند ہونے اور اس کی حمد وثنا کرنے کو شکر کہتے ہیں، صبر وشکر دونوں مومن کی شان اور اس کی پہچان ہے۔

رنج وراحت خوشی اور غم انسانی زندگی کے ساتھ لگے رہتے ہیں، کبھی انسان پر خوش حالی اور خوش بختی کا وقت آتا ہے اور کبھی انسان پر تنگ دستی اور مصیبت کا وقت آتا ہے، یہ دونوں حالتیں اللہ کی طرف سے ہیں، اس لیے مومن کو تعلیم دی گئی ہے کہ مصیبت پر صبر کریں اور راحت پر شکر بجالائیں۔

رنج وغم ابتلاء وتکلیف انسان کے گنہگار ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، یہ ہر انسان پر آتی ہے، ولیوں اور نبیوں پر بھی آتی ہے بلکہ جو اللہ کا جتنا مقرب بندہ ہوتا ہے اس پر اتنی ہی آزمائش آتی ہے، جلیل القدر

---

[1] مسلم، کتاب الزھد، باب فی احادیث متفرقۃ

رسولوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شاید ہی کوئی رسول ہو جس پر آزمائش نہ آئی ہو، آزمائش کی شکل الگ رہی ہے، چاہے وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام ہوں یا حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہوں، چاہے وہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام ہوں یا حضرت ایوب علیہ السلام ہوں، خود حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج و غم کے بار بار حالات آئے، مگر ان سارے نبیوں نے گلہ شکوہ اور کمزوری اور عجلت کا اظہار کرنے کے بجائے صبر سے کام لیا اور اللہ سے مدد مانگی، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا تھا جب وہ ایک نبی کا (یعنی اپنا) واقعہ بیان کر رہے تھے ان کی قوم نے ان کو مار مار کے لہولہان کر دیا تھا، وہ اپنے چہرہ سے خون پوچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے **اللھم اغفر لقومی انھم لایعلمون** (اے اللہ میری قوم کو معاف کر دے یہ نادان ہے۔[1]

> ''حضرت سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، اے اللہ کے رسول! سب سے زیادہ سخت آزمائش میں کون مبتلا ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا انبیاء علیہما السلام۔ ان کے بعد بالترتیب نیک لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ انسان اپنے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے اگر اس کے دین میں کمی ہے تو آزمائش میں بھی اسی اعتبار سے کمی ہوتی ہے، مومن کے پاس آزمائش آتی ہی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس حالت میں چھوڑتی ہے کہ وہ زمین میں چلتا پھرتا ہے اور اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا''[2]

صبر کرنے والا کبھی ناکام و نامراد نہیں ہوتا اگرچہ بظاہر اسے نقصان ہو، صبر کا

---

[1] بخاری، کتاب الانبیاء، باب حدیث الغار

[2] ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی الصبر علی البلاء

صلہ بہتر انجام کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور اگر دنیا میں نہ ہو تو یقیناً آخرت میں وہ محروم نہیں رہتا کیونکہ صبر کرنے والا اپنے رب سے قریب ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اولوالعزم رسولوں کے جیسا صبر کریں، **فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُوْلُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ** (الاحقاف-۳۵)

اس طرح صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔

جب انسان اس طرح صبر کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بے حساب اجر بھی دیا جاتا ہے، یعنی اللہ کے یہاں اجر کا معاملہ مومن بندہ کے صبر کے مطابق ہوتا ہے، ارشاد ہے: **اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ** (الزمر۔۱۰)

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

مصیبت اور آزمائش کبھی تو مال کی ہوتی ہے، تجارت میں خسارہ ہو جاتا ہے، کھیتی برباد ہو جاتی ہے، مال لٹ جاتا ہے، ملازمت ختم ہو جاتی ہے، کبھی جان کی ہوتی ہے ماں باپ، میاں بیوی، آل واولاد اور عزیز ترین کا انتقال ہو جاتا ہے، بظاہر انسانی سہارا ختم ہو جاتا ہے اور کبھی جسمانی ہوتی ہے۔ انسان بیمار ہو جاتا ہے، مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کبھی دینی ہوتی ہے، انسان کو دین وایمان پر قائم رہنے اور فرائض اسلام پر عمل کرنے کی وجہ سے ستایا جاتا ہے، گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے ان تمام شکلوں میں صبر ہی مومن کو جینے کا حوصلہ اور سلیقہ سکھاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا **مایزال البلاء بالمومن والمومنة فی نفسه وولده وماله حتی یلقی الله وما علیه خطیئة**[1] جب کسی مومن مرد وعورت پر اس کی جان، اولاد اور مال کے بارے میں آزمائش آتی ہے تو وہ اللہ کے پاس اس حال میں جاتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

صبر کا مطلب، بزدلی اور تن آسانی نہیں، ہتھیار ڈال دینے اور ظلم پر ظلم سہنے کا

---

[1] ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی الصبر علی البلاء

نام بھی صبر نہیں اور نہ صبر اپنے موقف اور اپنے ایمان سے پیچھے ہٹ جانے کا نام ہے، بلکہ صبر نام ہے اپنے دین و ایمان اور اپنے موقف پر چٹان کی طرح جمے رہنے اور حالات کی سختی کا مقابلہ کرنے کا، یہ مقابلہ کبھی حکمت سے ہوتا ہے، کبھی طریقہ کار بدلنے سے ہوتا ہے اور کبھی نظر انداز کرنے اور ٹالنے سے ہوتا ہے اور کبھی شر کو خیر کے ذریعہ دفع کرنے سے ہوتا ہے، ان ساری مشکلوں میں اصل مدد اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی مومن بندہ کی مشکلات کو دور کرتا ہے، وہی تدبیر اور حکمت سمجھاتا ہے وہی راہ دکھاتا ہے اور وہی غیب سے اپنے بندے کی راہ یابی کا انتظام کرتا ہے، اور اس طرح کرتا ہے کہ مومن کو گمان تک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىْءٍ قَدْرًا. (الطلاق-۳)

اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔

بہت سے لوگ تکلیف و مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ موت وحیات کا مالک رنج وراحت کا بھی مالک ہے، جس نے زندگی دی ہے اسی نے مصیبت بھی رکھی ہے اور وہی اس مصیبت سے نجات بھی دے سکتا ہے۔ چنانچہ راحت کی دعا کرنے کے بجائے موت کی تمنا کرنا ہرگز مومن کی شان نہیں ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تم لوگوں میں سے کسی کو مصیبت اور تکلیف پہونچے تو اس کی وجہ سے

موت کی تمنا نہ کرو، اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو یہ کہو کہ اے اللہ! جب تک جینا میرے لیے باعث خیر ہو اس وقت تک زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے دنیا سے اٹھا لے"[۱]

آزمائش پر صبر کرنا سنت رسول ﷺ ہے مگر آزمائش کو دعوت دینا اور اپنے صبر کو آزمانا خلاف سنت ہے، انسان آزمائش پر اللہ سے مدد مانگے اور صبر کرے آزمائش کو دعوت نہ دے ورنہ اللہ کی مدد نہیں آئے گی، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی روایت کرتے ہیں کہ بعض غزوہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

"اے لوگو! دشمن سے مقابلہ کرنے کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت کی دعا مانگو اور جب تمہارا دشمنوں سے مقابلہ ہو تو صبر کرو، اور جان لو کہ جنت تلوار کی چھاؤں میں ہے۔[۲]

اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کو حکم ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران—۲۰۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

امجد کی رباعی ہے:

دل کی ہر اک خلش نکل جاتی ہے — آتی ہے اگر بلا تو ٹل جاتی ہے
سختی سے حوادث کے نہ گھبرا امجد — یہ برف کوئی دم میں پگھل جاتی ہے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر و شکر توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[۱] بخاری، کتاب المرضیٰ، باب نھی تمنی المریض الموت

[۲] بخاری، کتاب الجھاد، باب لاتمنو القاء العدو

صداقت وحق گوئی

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبۃ . ۱۱۹)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سچائی نیکی کی راہ دکھاتی ہے، اور نیکی جنت کی راہ دکھاتی ہے، انسان سچ بولتا ہے تو اللہ کے نزدیک وہ سچا لکھا جاتا ہے، اور جھوٹ برائی کی راہ دکھاتی ہے اور برائی جہنم کی راہ دکھاتی ہے، انسان جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹا لکھا جاتا ہے“ [۱]

سچ بولنا اعلیٰ انسانی صفت ہے اور اخلاق کی سب سے بڑی پہچان ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں انسانوں کی سب سے اچھی صفت سچ بولنا ہے اور سب سے بری صفت جھوٹ بولنا ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیا بھیجے وہ سچے تھے، جھوٹا انسان نبی تو کیا ولی اور بزرگ بھی نہیں ہوسکتا اور نہ اچھا انسان ہوسکتا ہے، جو شخص جھوٹ بولتا ہے وہ فاسق وفاجر قرار پاتا ہے، نہ اس کی عبادت مقبول ہے نہ اس کی گواہی مقبول ہے، عبادت بھی سچے انسان کی مقبول ہے اور گواہی بھی سچے انسان ہی کی مقبول ہے، جھوٹ نفاق کی علامت ہے کیونکہ منافق جھوٹا ہوتا ہے، نبی علیہ السلام ﷺ نے فرمایا ہے:

آیۃ المنافق ثلاث اذا حدّث کذب، اذا وعد اخلف ،

---

[۱] بخاری، کتاب الادب، باب اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین

اذا ائتمن خان۔[1]

منافق کی تین علامتیں ہیں اول یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو امانت میں خیانت کرے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی طرف سے چھ باتوں کی ضمانت دو تو میں تم کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں (۱) جب بولو تو سچی بات بولو (۲) جب امانت تمہارے پاس رکھی جائے تو اسے ادا کرو (۳) جب وعدہ کرو تو پورا کرو (۴) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو (۵) اپنی نگاہیں نیچی رکھو (۶) اور اپنے ہاتھوں کو دوسروں کو تکلیف پہونچانے سے روکو۔[2]

رسول پاک ﷺ نے عرب کے معاشرہ میں سب سے پہلے جو بنیادی تعلیم لوگوں کو دی تھی اس میں سچائی بھی تھی، چنانچہ ہرقل کے دربار میں جب ابوسفیان پہونچے اور ابھی تک وہ مشرک اور دشمن اسلام ہی تھے تو روم کے بادشاہ ہرقل نے ان سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے بارے میں پوچھا تو ابوسفیانؓ نے جواب دیا "وہ کہتے ہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، باپ دادا کے رسم و رواج کو چھوڑ دو، وہ ہمیں نماز قائم کرنے کا حکم دیتے ہیں، سچ بولنے اور پاکدامن رہنے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہیں"۔[3]

رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر جو لوگ ایمان لائے یعنی صحابہ کرام وہ عقیدہ کے پکے اور باتوں کے سچے تھے، وہ جان تو دے سکتے تھے مگر جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، مومن کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کو جھوٹ سے پاک رکھے، علامہ اقبال کہتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب علامۃ المنافق

[2] مسند احمد، ۳۲۳/۵

[3] بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو   ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

انسان کو سچا کہلانے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے، وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے تو لوگ اسے سچا سمجھتے ہیں، مگر جھوٹا بننے کے لیے ایک مرتبہ کا جھوٹ بولنا کافی ہے، ایک مرتبہ جھوٹ بولنا عمر بھر سچ بولنے کی روایت کو غلط کر دیتا ہے۔

لوگ عام طور پر کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے یا کسی نقصان سے بچنے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں، جھوت بولنے سے جو تھوڑی سی منفعت دنیا میں حاصل ہوتی ہے وہ آخرت میں بڑے خسارہ کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، بہت سے کاروباری لوگ سامان بیچنے میں بلاتکلف جھوٹ بولتے ہیں، قیمت بتانے اور سامان کی کوالٹی بتانے میں جھوٹ بولتے ہیں، ایسے کاروباری لوگوں کو بظاہر جو بھی فائدہ ہو اللہ کے نزدیک وہ گھاٹے کا سودا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بیچنے اور خریدنے والے کو معاملہ کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں، اگر وہ دونوں سچ بولتے ہیں اور سامان کی اصلیت واضح کرتے ہیں تو ان کے لین دین میں برکت ہوتی ہے اور اگر وہ سامان کا عیب چھپاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں تو ان کے کاروبار کی برکت ختم کر دی جاتی ہے"۔[1]

اس کے برخلاف جو لوگ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ لین دین کرتے ہیں ان کے کاروبار میں برکت دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کو انبیاء اور شہیدوں کا اجر بھی عطا کرتا ہے، جیسا کہ رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں:

التاجر الصدوق الامین مع النبیّن والصدیقین والشهداء.[2]

---

[1] ترمذی، ابواب البیوع، باب البیعان بالخیار مالم یتفرقا

[2] ترمذی، ابوب البیوع، باب ماجاء فی التغلیظ فی الکذب والزور

سچا ایمان دار تاجر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

سچ بولنے کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو ایسے لوگوں کے سامنے اور ایسے موقع پر سچ بولنا پڑے جب کہ سچ بولنے کے نتیجہ میں تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ہو پھر بھی سچ بولنے سے گریز نہیں کرے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ان افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر .[1]

ظالم حکمراں کے سامنے سچ بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

جھوٹ بولنا جتنا بڑا گناہ ہے اس سے بڑا گناہ جھوٹی قسم کھانا ہے، جھوٹی قسم کھانے والا دوہرا گناہ کرتا ہے ایک تو جھوٹ بولتا ہے دوسرے اپنے جھوٹ کو سچ ظاہر کرنے کے لیے اللہ پاک کے نام کا استحصال کرتا ہے، لہٰذا اس کو سزا بھی دوگنی دی جائے گی، اللہ کے نام پر جھوٹ بولنا کافروں کا شیوہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ (النحل . ۱۰۵)

جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔

جو شخص جھوٹی قسم کھاتا ہے اسے توبہ کرنا چاہیے اور کفارہ کے بطور دس فقیروں کو کھانا کھلانا چاہیے۔

جھوٹ کی بدترین قسم جھوٹی گواہی ہے اور اس کا گناہ بھی بہت ہی بڑا ہے، جھوٹی گواہی دینے والا محض ایک جھوٹ بولنے کا ہی گناہ نہیں کرتا بلکہ دوسرے انسان کا حق پامال کرتا ہے جو سنگین قسم کا جرم ہے، اسی لیے اس کا گناہ بھی بہت بڑا ہے، نبی ﷺ نے ''اکبر کبائر'' یعنی سب گناہوں سے بڑے گناہ میں اس کا شمار کیا ہے حضرت ابی بکرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ

"کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑے گناہوں کی اطلاع نہ دوں،
ہم نے عرض کیا جی ہاں اے اللہ کے رسول! تو آپ نے فرمایا:
اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق
کسی کا قتل کرنا، راوی کہتے ہیں کہ آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے
سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا ہاں سنو! جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی
گواہی، آپ اس جملہ کو بار بار دہراتے رہے، ہم نے جی میں کہا
کاش آپؐ خاموش ہو جاتے"۔[۱]

آج کل عدالتوں میں پیشہ ور گواہ پیسہ دے کر حاصل کیے جاتے ہیں، یہ بدترین گناہ ہے، جھوٹ کی ایک اور گھناؤنی شکل کسی پر جھوٹا الزام لگانا ہے، جسے تہمت یا اتہام کہا جاتا ہے، تہمت لگانے والا اپنے جھوٹ سے دوسرے پاک دامن انسان کی کردار کشی کرتا ہے، اس کی شخصیت کو داغدار کرتا ہے اور اس کو سماج میں رسوا اور بے وقار کرتا ہے اس لیے وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ سزا کا مستحق ہے، چنانچہ جو لوگ کسی پاک دامن مرد یا عورت پر بدکاری کا الزام بلا ثبوت کے لگائیں، شریعت نے ان کے لیے اسی ۸۰ کوڑے کی سزا مقرر کی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً
وَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (النور . ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے
کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول
نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔

---

[۱] مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر واکبرہ

جھوٹ بولنا اگرچہ برا ہے، مگر انسانوں کے بگڑتے ہوئے تعلقات کو درست کرنے کے لیے اگر کوئی جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے مواخذہ نہیں کرے گا، کیونکہ انسانوں کے مابین فساد کا پیدا ہونا جھوٹ سے زیادہ نقصان دہ ہے اور اگر ان میں صلح کرائی جا سکتی ہو تو ضرور کرنی چاہیے یہ بڑی نیکی ہے اور معاشرہ کے امن و استحکام کے لیے ضروری ہے، اسی وجہ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لیس بکذّب من اصلح بین الناس فینمی خیرا، او یقول خیرا۔[1]

وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح جوئی کرتا ہے اور بھلائی کے لیے چغلی کھاتا ہے۔ یا بھلائی کی بات کہتا ہے۔

یعنی یہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ لوگوں کو سچائی کی راہ پر لگانے کا حیلہ اور تدبیر ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں سچائی کی اور سچے لوگوں کے ساتھ رہنے کی توفیق دے آمین۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس

نمائش اور ریا کاری

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَايَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ (البقرہ . ۲۶۴)

اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں۔

نام و نمود، دکھاوا، نمائش اور ریا کاری اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، انسان اگر بے عمل ہو تو اس کے باعمل ہونے کی امید کی جا سکتی ہے، اسے عمل کی توفیق مل سکتی

ہے، وہ اتنا برا نہیں جتنا کہ وہ شخص جو عمل تو کرتا ہے مگر اللہ کی خوشنودی کی خاطر نہیں بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتا ہے، ایسے شخص کا عمل خود اس کے لیے وبال جان ہے اس کا عمل ایسے وقت میں کچھ کام نہ آئے گا جب اسے عمل کے اجر کی اپنی نجات کے لیے شدید ضرورت ہوگی، ریا کار انسان سمجھتا ہے کہ اس کی جھولی میں نیک عمل کا سکہ موجود ہے جس سے وہ جنت کا پروانہ حاصل کر لے گا مگر قیامت میں جب اس کا نامہ اعمال کھولا جائے گا تو اس کی ریا کاری کی وجہ سے اس کا سارا عمل برباد ہو چکا ہوگا اور وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے تین آدمیوں کا حساب و کتاب ہوگا، پہلا وہ شخص جو جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا، اسے اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور پوچھے گا کہ بتاؤ تم نے ان نعمتوں کو پا کر کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا، اللہ تعالیٰ کہے گا تو غلط کہتا ہے تو نے جنگ اس لیے کی تھی کہ تجھے بہادر کہا جائے چنانچہ لوگوں نے تجھے بہادر کہا، پھر اللہ کے حکم سے فرشتے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اسے جہنم میں لے جائیں گے۔

دوسرا شخص جس نے علم حاصل کیا اور علم کو پھیلایا اور قرآن پڑھا اسے لایا جائے گا، اللہ اسے بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور پوچھے گا کہ تم نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور علم کا درس دیا اور تیرے لیے قرآن پڑھا، اللہ کہے گا تو غلط کہتا ہے تو نے علم اس لیے حاصل کیا کہ لوگ تجھے عالم کہیں، اور قرآن اس لیے پڑھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں، چنانچہ تجھے عالم و قاری کہا جا چکا، پھر اللہ کے حکم سے فرشتے اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے۔

تیسرا شخص وہ مال دار ہوگا جس کو اللہ نے خوب مال و دولت سے نوازا ہوگا،

اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اپنی نعمتیں گنوائے گا اور وہ بھی اعتراف کرے گا، اللہ پوچھے گا کہ بتاؤ پھر تم نے کیا عمل کیا؟ وہ جواب دے گا کہ میں نے ایسا کوئی راستہ نہیں چھوڑا جس میں تو نے مال خرچ کرنا پسند کیا ہو اور میں نے بے دریغ مال خرچ نہ کیا ہو، اللہ کہے گا تو بھی غلط کہتا ہے، تو نے اپنی دولت اس لیے خرچ کی کہ تجھے لوگ سخی اور داتا کہیں، چنانچہ لوگوں نے یہ کہا، پھر اللہ حکم دے گا اور اسے بھی منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[۱]

غور کیجیے کہ شہید کا کتنا بڑا مقام ہے، وہ شخص جو اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کردے اس سے زیادہ کون مرتبہ والا ہوسکتا ہے؟ مگر ریاکاری خون شہادت کو بھی رائیگاں کردیتی ہے، عالم سوسائٹی کو روشن کرتا ہے مگر ریاکاری عالم کو خود تاریکی میں مبتلا کردیتی ہے، سخاوت اور فیاضی کتنی بڑی عبادت ہے؟ اپنا مال دوسرے پر خرچ کرنا بڑے حوصلہ کی بات ہے، مگر ریاکاری سخاوت اور فیاضی کو بھی خاک میں ملادیتی ہے انسان مال خرچ بھی کرتا ہے مگر ثواب بھی نہیں پاتا اس کی کتنی خوبصورت مثال اس آیت میں دی گئی ہے جس کی تلاوت کی گئی ہے۔

ریاکار کا عمل اسی طرح قبولیت سے محروم رہتا ہے جس طرح مشرک کا عمل ناقابل قبول ہوتا ہے، شرک اور ریا میں ایک تعلق یہ ہے کہ مشرک عقیدہ کے اعتبار سے اپنے کام میں اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتا ہے، اور ریاکار اپنے عمل سے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے، عقیدہ اگرچہ دونوں کا مختلف ہوتا ہے مگر رویہ اور عمل دونوں کا ایک ہوتا ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”انا اغنی الشرکاء عن الشرک من عمل عملا اشرک فیه معی غیری ترکتهٗ وشرکهٗ۔[۲]

---

[۱] مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار

[۲] مسلم، کتاب الزھد، باب تحریم الریاء

میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں ،جس نے کوئی عمل
کیا اور اس عمل میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا میں اس کو
اس کے شریک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں ، یعنی جو حال مشرک کا
ہوگا وہی اس کا بھی۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت میں شرک سے ڈرتا ہوں ،صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہو جائے گی؟ آپ نے فرمایا ہاں ،مگر وہ لوگ چاند وسورج پتھر اور بتوں کی پوجا نہیں کریں گے لیکن اعمال دکھاوے کے لیے کریں گے۔[1]

جو کام اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جانا چاہیے اگر انسان اس کو اپنی شہرت ، نام ونمود اور ستائش کے لیے کرنے لگے تو اخلاص کہاں باقی رہا، اس پر ثواب کیسے ملے گا ، اور ثواب تو کیا ملتا الٹا عذاب کا موجب ہوگا ، کیونکہ ریا کاری نے عمل کی حقیقت اور اس کے حسن وخوبی کو ملیامیٹ کر دیا۔

ریا کاری کا عمل نفاق سے بھی ملتا ہے،منافق اس کو کہتے ہیں کہ جس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور کہتا کچھ اور ہے، اسی طرح ریا کار کرتا کچھ ہے اور اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے،منافق بھی بنیادی طور پر ریا کار ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا
اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ
اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (النساء . ۱۴۲)

منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت
اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔جب یہ نماز کے لیے
اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے

---

[1] مسند احمد ۴/۱۲۴

ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

ریا کاری یہ بھی ہے کہ آدمی کسی کے سامنے کچھ اور کہے اور اس کے پیچھے کچھ اور کہے، منہ پر تعریف کرے اور بعد میں برائی کرے، یہ ریا کاری بھی ہے اور منافقت بھی، کچھ لوگ صحابی رسول حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے، ہم لوگ اپنے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے سامنے ان کے جیسی باتیں کرتے ہیں جب اس کے پاس سے واپس آتے ہیں تو اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، یہ سن کر حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا: **كنا نعدهذا نفاقا** [1] رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم اسے بھی نفاق ہی شمار کرتے تھے۔

ریا کار کا بنیادی جذبہ یہ ہے کہ اس کے کام کی شہرت ہو، نمائش ہو اور لوگ اس کی تعریف کریں۔ چنانچہ وہ جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو داد طلب نگاہوں سے لوگوں کو دیکھتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کو اپنے لیے سند سمجھتا ہے، یہی جذبہ ریا کاری کی بنیاد ہے جب تک انسان کے اندر سے یہ جذبہ ختم نہ ہو وہ ریا کاری سے بچ نہیں سکتا۔

موجودہ زمانہ میں نام و نمود، شہرت اور تعریف طلب کام کرنے کا ایک عام ماحول پایا جاتا ہے، کم لوگ ہیں جو نمود و نمائش کے جذبہ سے پاک ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ایسے بھی ہیں جو کوئی نیک عمل بھی نہیں کرتے دوسروں کے کام کو چالاکی سے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں اور پھر اس پر داد و تحسین اور آفرین طلب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن پاک میں ہے **وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَالَمْ يَفْعَلُوْا** (آل عمران۔۱۸۸)

وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف اس کام پر ہو جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے۔

بہت سے لوگ سخاوت اور فیاضی بھی نہیں کرتے محض اپنی دولت اور شان و شوکت کی نمائش کرتے ہیں۔ ایسے سارے ریا کار اپنے عمل کو خود اپنے ہاتھوں سے

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب ما یکرہ من ثناء السلطان واذا خرج

برباد کرتے ہیں۔ بظاہر ان کا عمل بہت خوشنما اور قابل تعریف لگتا ہے، سجا بنا کر وہ اپنے عمل کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اندر سے جل چکا ہوتا ہے۔ بقول شاعر

منظر سیاہ پوش نہ پیکر جلا ہوا　　　ہر شخص اپنی ذات کے اندر جلا ہوا

اگر آدمی اللہ کے لیے اچھے عمل کرے، اخلاق و کردار سے آراستہ ہو، فیاضی اور غربا پروری کرے خدمت خلق اور فلاح عام کے کام انجام دے، اور لوگ اس کی تعریف و توصیف کریں تو یہ ریا کاری نہیں ہے بلکہ اس کے مخلصانہ عمل کا دنیا میں اعتراف ہے، آخرت میں بھی اس کا اجر مقرر ہے جو کبھی ضائع نہ ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ انسان خیر کا کوئی کام کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں کیا یہ بھی ریا ہے؟ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: **تلک عاجل بشری المومن.** یہ دنیا میں مومن کے لیے خوش خبری ہے۔[۱]

ریا کاری لوگوں کی تعریف نہیں ہے بلکہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے، اس جذبہ کو دل سے نکالنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نمود و نمائش اور ریا کاری سے بچنے کی توفیق دے، (آمین)

---

[۱] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری

کنجوسی اور بخل

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی . وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی . فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی. وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی. وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی. وَمَا یُغْنِی عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی. (اللیل . ۱۱-۵)

جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

ایاکم و الشح فانما هلک من کان قبلکم بالشح[۱]

بخل سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ بخل کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

اسلام نے بخالت اور کنجوسی کی بڑی مذمت کی ہے، بخیل انسان اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق خرچ نہیں کرتا، اپنی ذات اپنے اہل وعیال اور حق والوں کو اپنے مال سے فیض نہیں پہونچاتا، سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور دوزخ کی راہ اپناتا ہے، جبکہ سخی انسان مال کو اپنے اور اپنے اہل خانہ کے علاوہ اللہ کے نادار بندوں پر خرچ کرتا ہے اور اپنی سخاوت اور فیاضی کے ذریعہ جنت کا پروانہ حاصل کر لیتا ہے، دنیا میں سخی اور بخیل انسان کے رویہ میں جو فرق دکھائی دیتا ہے

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب فی الشح

قیامت میں یہ فرق جنت وجہنم کی شکل میں سامنے آئے گا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سخی اللہ تعالیٰ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، جہنم سے دور ہے، اور بخیل اللہ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جہنم سے قریب ہے، جاہل سخی اللہ کو عبادت گذار بخیل سے زیادہ پسند ہے" [1]

نبی پاک علیہ ﷺ نے ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

یا ابن آدم انک ان تبذل الفضل خیر لک . وان تمسکہٗ شرٌ لک ولا تلام علی کفاف وابدأ بمن تعول، والید العلیاخیر من الید السفلیٰ . [2]

اے آدم کی اولاد! تم مال خرچ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم اسے روک کر رکھو تو یہ تمہارے لیے بُرا ہے، تجھے کفایت شعاری پر ملامت نہیں ہے، خرچ کا آغاز ان لوگوں سے کرو جو تمہارے زیر کفالت ہیں، اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے)

بخیل دنیا میں بدنام اور رسوا ہوتا ہے، کوئی اس کی عزت اور توقیر نہیں کرتا، مال دار ہو کر بھی مفلس اور نادار کی زندگی گذارتا ہے، کشادگی دل اور سکون قلب سے محروم رہتا ہے اور روحانی مسرت اسے نصیب نہیں ہوتی، ہمیشہ اسے اپنی دولت کے گھٹنے، چوری ہونے اور لوٹے جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے، بخیل انسان کو اگر پوری دنیا کی دولت بھی مل جائے تب بھی وہ اپنی کنجوسی کی فطرت کی وجہ سے خرچ کرنے سے گریز کرے گا کہ دولت کم نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کے دل کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا. (بنی اسرائیل۔۱۰۰)

اے نبیؐ، ان سے کہو اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی السخاء
[2] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلیٰ

ضرور ان کو روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔

بخیل آخرت میں بھی رحمت الٰہی سے محروم رہے گا، اپنے مال کے بوجھ کے نیچے دبا رہے گا اور جنت تک پہونچنا اس کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ اسی مال کے ذریعہ اسے عبرتناک سزا دی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ . يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ . هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ. (التوبہ: ۳۴-۳۵)

دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

”جو صاحب دولت و ثروت اپنی دولت کا حق ادا نہیں کرتا اس کی دولت قیامت کے دن ”شجاع اقرع“ یعنی اژدھا بن کر منہ کھولے ہوئے اس کے سامنے آئے گی اور کہے گی کہ میں وہی دولت ہوں جو تو نے دنیا میں چھپائی تھی اور اسے نگل جائے گی۔[1]

سخی انسان دنیا میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، لوگ اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ آخرت میں بھی اس کا استقبال شاہانہ طریقہ سے کیا جائے گا اور بے حساب اجر و ثواب سے نوازا جائے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ۔۲۷۴)
جولوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

سخاوت اور فیاضی انسان کی عظمت کا ذریعہ ہے، اس کے مال وثروت میں اضافہ کا بھی ذریعہ ہے، انسان جب اللہ کے بندوں پر مال خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحمت کا خزانہ اس سخی بندہ پر کھول دیتا ہے۔ اس کے مال میں برکت ہوتی رہتی ہے۔ اگر کبھی مال میں کمی ہو بھی جائے تو اس کا دل غنی رہتا ہے، اور روحانی مسرت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ. ۲۶۱)
جولوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔

ہر انسان دولت وثرت اور خوشحالی کی تمنا کرتا ہے، اس کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے، اللہ سے دعا کرتا ہے، یہ تمنا بری نہیں ہے، لیکن اصل چیز مال و دولت نہیں بلکہ دل کی مالداری ہے، آدمی دولت رکھ کر بھی نادار رہتا ہے اور دل اگر غنی ہو تو فقر کے ساتھ بھی انسان دولت مند ہے، اسی کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الغنی غنی النفس۔[۱] اصل مالداری تو دل کی مالداری ہے۔

ایسا انسان جس کا دل غنی نہیں ہوتا اس میں خرچ کرنے کا جذبہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ دولت کو سمیٹ کر رکھتا ہے یہاں تک کہ جس اللہ نے اس کو دولت عطا کی تھی اس کا بھی حق ادا نہیں کرتا، یعنی صدقہ وزکوٰۃ نکالنے سے بھی جی چراتا ہے۔

---

[۱] بخاری، کتاب الرقاق، باب الغنیٰ عن النفس۔ مسلم، کتاب الزکوۃ

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ثعلبہ بن حاطب نام کا ایک شخص تھا وہ بظاہر مسلمان تھا اور حضور کے پاس آیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول میرے لیے دولت اور مالداری کی دعا کر دیجیے آپ نے فرمایا تھوڑا جس کا شکر ادا ہو، اس زیادہ سے اچھا ہے جو اپنی استطاعت سے زیادہ ہو، وہ نہیں مانا، اس کے اصرار پر رسول پاکؐ نے اس کے مال میں برکت کی دعا فرمائی، دعا کا اثر یہ ہوا کہ اس کی بھیڑ بکریوں میں اتنا اضافہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں اس کے جانوروں کے رہنے کے لیے گنجائش نہ رہی، تب وہ ان کو لے کر جنگل میں چلا گیا، ظہر اور عصر کے علاوہ باقی جماعت سے محروم ہو گیا اور آخر میں جمعہ کی نماز سے بھی محروم ہو گیا۔

جب صدقہ کی آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے قبیلہ جہینہ اور قبیلہ سلیم کے دو آدمیوں کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں نمائندے ثعلبہ بن حاطب کے پاس پہونچے اور فرمان رسولؐ دکھا کر صدقہ طلب کیا تو اس نے کہا واہ یہ تو کافروں سے وصول کیا جانے والا جزیہ جیسا ہے۔ خیر جاؤ پھر آنا، دوسرا شخص سلیمہ جس کے پاس رسول پاکؐ نے بھیجا تھا، اسے معلوم ہوا کہ صدقہ لینے آئے ہیں تو وہ خود سے آگے بڑھا اور اپنا بہترین جانور پیش کر دیا، صدقہ کا جانور لے کر جب عامل صدقہ دوبارہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس آئے تو اس نے پھر ٹال دیا۔ جب یہ دونوں نمائندے واپس گئے تو رسول پاک نے ان کو دیکھتے ہی ثعلبہ پر افسوس کیا اور سلیمی کے لیے برکت کی دعا فرمائی، ان دونوں نے پھر تفصیلی حالات بیان کیے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ. فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ. فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ. (التوبۃ:۷۵-۷۸)

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح

بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند
کر دیا تو وہ بخل پر اُتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں
اس کی پرواتک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ
سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ
بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھادیا جو اس کے
حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

ثعلبہ کو جب یہ معلوم ہوا تو رسول پاکؐ کے پاس حاضر ہوا اور صدقہ قبول کرنے کی گذارش کی۔ رسول پاکؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا صدقہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر وہ اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا اور واپس اپنی بھیڑ بکریوں میں چلا گیا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا، ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آیا، آخری مرتبہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حاضر ہوا اور صدقہ قبول کرنے کے لیے خوشامد کرنے لگا۔ ان سب خلفاء نے اس کا صدقہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، وہ ناکام واپس گیا اور اسی نفاق کی حالت میں مال و دولت چھوڑ کر مر گیا۔

یہ عبرتناک واقعہ ہم مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ اصل دولت نہیں ہے بلکہ فضل خداوندی ہے، جب اللہ کسی کو مال و دولت دے تو اسے انفاق اور خیرات کی توفیق بھی دے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نصیحت فرمائی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا
خَيْرًا لِاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ. (التغابن . ١٦)

جہاں تک تمہارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور
اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو
اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بخل سے محفوظ رکھے اور خیرات کی توفیق دے (آمین)

امانت داری

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعاً بَصِیْراً (النساء. ۵۸)

مسلمانو، اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

انسانی صفات اور خصوصیات میں بہترین صفت امانت داری ہے، یہ خوبی ہر انسان میں پائی جانی چاہیے، اسلام اس انسانی صفت کی قدر اور تحسین کرتا ہے اور اسے روحانی اور اخلاقی سند عطا کرتا ہے، جس انسان میں امانت داری ہے وہ اعلیٰ انسان ہے اور جس انسان میں امانت داری نہیں وہ اچھا انسان نہیں اچھا مسلمان ہونا تو بڑی بات ہے۔ وہ شخص یہودی ہوسکتا ہے منافق ہوسکتا ہے مگر سچا مومن نہیں ہوسکتا، قرآن وحدیث میں یہودیوں اور منافقوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ امانت دار نہیں ہوتے یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْھُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖ اِلَیْکَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِماً. (آل عمران. ۷۵)

اوران میں کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں
بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر
سوار ہو جاؤ۔

منافقوں کے متعلق رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ منافقوں کی چار علامتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب ان کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی پہچان نبوت سے پہلے مکہ کے سماج میں ایک ایماندار انسان کی تھی اور لوگ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے، نبوت ملنے کے بعد تو گویا آپ نے امانت داری کو ایمان کی اصل اور جڑ بنا کر پیش کیا اور آپ نے فرمایا **لاایمان لمن لا امانة له**[2] اس کے پاس ایمان نہیں جس کو امانت کا پاس نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی امانت داری کا مثالی ثبوت پیش کیا، یہاں تک کہ اپنی جان کے دشمنوں کو بھی اپنی امانت داری کی برکتوں سے محروم نہیں رکھا۔ ہجرت مدینہ سے پہلے کی رات میں جب مکہ کے مختلف قبیلہ کے لوگ ننگی تلواریں لے کر آپ ﷺ کے گھر کو گھیرے ہوئے تھے کہ جیسے ہی آپ ﷺ گھر سے نکلیں سب لوگ اپنی تلواروں سے آپ پر حملہ کر دیں، اس وقت بھی قاتلوں کی جماعت کے بہت سے لوگوں کی امانتیں رسول پاکؐ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، مگر رسول پاک نے وہ امانتیں حضرت علیؓ کے حوالہ کیں اور فرمایا صبح ہو کر ان کے مالکوں کو یہ امانت سونپ دینا۔ دشمنوں کی امانت ادا کر کے آپ ہجرت کے لیے روانہ ہو گیے۔

دنیا میں دشمنوں کے ساتھ ہر سلوک روا رکھا جاتا ہے، اور ان کی امانتوں کو ہضم کیا جاتا ہے، ایسے میں رسول پاک کا یہ کردار ایسا روشن نمونہ ہے جیسے اندھیری رات میں

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق
[2] مسند احمد ۳/۱۳۵

روشن چراغ، یہی نہیں جب فتح مکہ کے موقع پر رسول پاک اپنے اصحاب کے ساتھ خانہ کعبہ میں سجدہ شکر بجالانے کے لیے داخل ہوئے تو شیبی خاندان کے کلید بردار عثمان بن ابی طلحہ نے حضورؐ کو چابی دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت علی نے ان سے چابی چھین کر خانہ کعبہ کا دروازہ کھول دیا، رسول پاک نے خانہ کعبہ کو بتوں کی گندگی سے پاک کیا، سجدہ شکر بجالائے اور باہر نکل کر اللہ رب العزۃ کی حمد وثنا کی، اس موقع پر آپ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ ابن عباس نے درخواست کی کہ خانہ کعبہ کی چابی مجھے عطا کر دی جائے، حضور کو یہ اختیار تھا کہ جسے چاہیں آپ چابی عطا فرما دیں، مگر آپ نے اسے امانت کے خلاف سمجھا اور یہ کہہ کر چابی عثمان بن ابی طلحہ کے حوالہ کر دی کہ "آج کے بعد یہ چابی تمہارے پاس رہے گی اور اسے تم سے جو چھینے گا وہ ظالم ہوگا"۔[۱]

اسلام کی امانت داری کا اس سے بڑا ثبوت نہیں مل سکتا کہ اس واقعہ کو چودہ صدیاں گذر چکی ہیں ان صدیوں میں ہزاروں بادشاہ اور حکمراں بدل گئے۔ مگر کسی نے بھی اس خاندان سے چابی چھیننے کی کوشش نہیں کی، اور آج تک خانہ کعبہ کی چابی شیبی خاندان کے دسترس میں ہے۔

رسول پاک ﷺ نے مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

أد الامانة الی من ائتمنک ولا تخن من خانک. [۲]

جس نے تمہارے پاس امانت رکھی ہے اس کی امانت ادا کرو اور جس نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے، اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

امانت داری کی یہ اعلیٰ تعلیم مسلمانوں کی مذہبی روایت بن گئی۔ رسول پاک ﷺ نے امانت داری کی جو عملی تعلیم دی وہ صحابہ کرام کے گوشت اور خون میں سرایت کر گئی، اور ان کی پہچان بن گئی، یہاں تک کہ غلاموں، اور چرواہوں میں بھی امانت

۱۔ تفسیر ابن کثیر، النساء۔ ۵۸

۲۔ ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی النھی للمسلم ان یدفع الی الذی الخمر یبیعھا له

داری ان کی زندگی کا جزو بن گئی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ مدینہ کے باہر جنگل میں گئے، ایک غلام بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا، کھانے کا وقت ہو گیا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ناشتہ دان کھولا اور غلام کو کھانے کی دعوت دی، اس نے کہا میں روزہ رکھے ہوا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آزمانے کے لیے اس سے کہا کہ ایک بکری میرے ہاتھ بیچ دو، قیمت بھی دوں گا اور بکری ذبح کر کے گوشت بھی دوں گا اس سے افطار کر لینا، اس نے کہا بکریاں میری نہیں ہیں، میرے مالک کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری کو بھیڑیا لے گیا، غلام نے کہا یہ جواب میں اپنے مالک کو دیدوں گا مگر اپنے خدا کو کیا جواب دوں گا، غلام کا جواب سن کر حضرت عبد اللہ بن عمر بہت خوش ہوئے۔ اس کے مالک کے پاس گئے اور غلام کی قیمت ادا کر کے اسے آزاد کر دیا، غلام کی امانت داری آزادی کا ذریعہ بن گئی، مسلمان کی امانت داری اسے عذاب جہنم سے نجات دلانے کا ذریعہ بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تاکید فرمائی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَخُوْنُوْا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمَانَاتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (الانفال۔ ۲۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو۔

مسلمانوں کی تاریخ میں امانت داری کے اعلیٰ نمونے ہر دور میں ملتے رہے ہیں اور عام لوگوں کے لیے سبق آموزی اور اثر پذیری کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں، حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید حضرت عبداللہ ابن مبارک جو علم وفقہ زہد وتقوی اور جہاد فی سبیل اللہ میں مشہور تھے، ان کے والد قبیلہ ہمدان کے ایک تاجر کے غلام تھے، اور اس کے باغ کی رکھوالی کرتے تھے، ایک دن مالک باغ کی سیر کو آیا اور غلام کو

میٹھا انار توڑ کر لانے کا حکم دیا، غلام نے انار توڑ کر پیش کر دیا، مالک نے چکھا تو انار کھٹا نکلا، اس نے دوسرا انار توڑنے کا حکم دیا، غلام نے دوسرا انار توڑ کر پیش کر دیا، مگر وہ بھی کھٹا ثابت ہوا، مالک نے تیسری مرتبہ انار توڑ کر لانے کا حکم دیا، غلام نے تیسرا انار توڑ کر پیش کر دیا وہ بھی کھٹا نکلا، مالک کو غصہ آ گیا اور کہا تمہیں کھٹے اور میٹھے انار کی تمیز نہیں ہے؟ غلام نے جواب دیا جی ہاں مجھے میٹھے انار کا پتہ نہیں ہے کیونکہ میں نے باغ کا کوئی انار چکھا نہیں ہے، آپ نے مجھے باغ کی رکھوالی کا حکم دیا تھا، پھل کھانے کو نہیں کہا تھا، یہ سن کر باغ کا مالک حیرت زدہ رہ گیا گھر آیا اور مبارک کو آزاد کر کے اپنی دختر سے شادی کر دی، انہی کے بطن سے عظیم المرتبت حضرت عبداللہ ابن مبارک پیدا ہوئے۔

امانت داری کا یہ روشن نمونہ آج بھی مسلمانوں میں مل جاتا ہے، خواجہ حسن نظامی نے بیان کیا کہ ایک انگریز لندن سے دہلی گھومنے کے لیے آیا، برٹش حکومت کا زمانہ تھا، وہ انگریز دہلی کی جامع مسجد بھی دیکھنے گیا، وہاں سیڑھیوں پر فقیر بیٹھے بھیک مانگ رہے تھے، انگریز نے جیب سے پرس نکالا اور ایک سکہ ایک فقیر کو دے کر پرس جیب میں رکھنے لگا، پرس نیچے گر گیا اور انگریز مسجد میں چلا گیا، وہ مسجد دیکھ کر دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ فقیر کی پرس پر نظر پڑی تو اس نے اٹھالیا اور احتیاط سے اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ کئی سالوں کے بعد وہ انگریز دوبارہ دہلی آیا اور پھر جامع مسجد کی سیر کو گیا، سیڑھی چڑھتے ہوئے اس فقیر نے اسے دیکھا اور پہچان لیا۔ بولا کئی سال پہلے آپ یہاں آئے تھے اور مجھے بھیک دی تھی، انگریز بولا آیا تو تھا مگر یہ یاد نہیں کہ تم کو بھیک دی تھی، فقیر بولا کہ آپ کا اس وقت پرس گر گیا تھا، انگریز بولا ہاں اتنا یاد ہے کہ میرا پرس کہیں کھو گیا تھا، فقیر نے اپنی جھولی سے وہ پرس نکالا اور انگریز کے حوالے کرتے ہوئے بولا یہ آپ ہی کا پرس ہے، کھول کر دیکھ لیجیے، آپ کا روپیہ کم تو نہیں ہے۔

انگریز فقیر کی امانت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، وہ بولا اتنے سالوں تک تم نے اس

پرس کی حفاظت کیوں کی، اس میں جو روپیہ تھا اسے استعمال کیوں نہیں کیا؟ فقیر نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فقیر نے کہا، قیامت میں آپ کے نبی حضرت عیسی علیہ السلام کی میرے نبی حضرت محمد ﷺ سے جب ملاقات ہوگی تو آپ کے نبی میرے نبی سے یہ شکایت کریں گے کہ آپ کے امتی نے میرے امتی کا پرس رکھ لیا تھا تو میرے نبی شرمندہ ہوں گے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے کام سے میرے نبی کو شرمندگی ہو۔

انگریز نے خوش ہوکر پرس کی پوری رقم فقیر کے حوالہ کردی اور دیر تک سوچتا رہا کہ اسلام کے فقیروں کی امانت داری کا یہ حال ہے تو امیروں کی امانت داری کیا ہوگی۔

غیر مسلموں کو پہلے یقین تھا کہ میاں ایماندار ہوتا ہے، مگر اب نوجوان نسل میں اس امانت داری کا احساس کم ہو رہا ہے، یہ ایمان کا چراغ ہے اسے گل نہ ہونے دیجیے اور اپنی ملت کو شرمندہ نہ کیجیے، کیونکہ جب امانت داری ختم ہوگی تو قیامت قریب ہوگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اذ ضُیّعت الامانة فانتظر الساعة [۱]

جب امانت ضائع ہونے لگے تو قیامت کا انتظار کرو،

مسلمان اگر امانت داری کو اپنی پہچان بنالیں تو رزق کے تمام دروازے ان پر کھلے ہوئے ہیں، غیر مسلم تاجروں، دوکانداروں، صنعت کاروں، کمپنیوں کو ایماندار ملازم کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ضرورت مسلمان اپنی ایمانداری سے پوری کر سکتے ہیں۔ ایمانداری مسلمانوں کی دینی شناخت بھی ہے اور معاشی ضرورت بھی، اللہ تعالیٰ سارے مسلمانوں کو امانت داری کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---

۱ بخاری، کتاب العلم، باب من سئل علما وهو مشتغل فی حدیثه

شراب اور جوا

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ. (المائدہ:۹۱-۹۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے خمر اور میسر یعنی شراب اور جوا کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ خمر کے معنی ڈھانکنے کے ہیں۔ شراب انسان کی عقل وشعور کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس لیے اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے، صرف شراب ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو شریعت میں حرام ہے۔ مثلاً تاڑی، یعنی کچی شراب، الکحل، اور نشہ آور گولیاں

وغیرہ ان سب کا استعمال ممنوع ہے، رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **کل مسکر حرام**.[۱] ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

عرب کے لوگ جن اخلاقی خرابیوں میں مبتلا تھے ان میں ایک بری عادت شراب نوشی تھی۔ شراب کے بغیر ان کو چین نہ آتا تھا جیسے کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہو، شراب نوشی کے ساتھ لڑائی جھگڑے، گالم گلوج، بے حیائی اور بدکاری بھی جڑی ہوئی تھی اور یہ نشہ آور چیزوں کے ساتھ آج بھی لگی ہوئی ہے، اس لیے شراب کو ام الخبائث یعنی گناہوں کی جڑ کہا گیا ہے۔

اسلام نے رفتہ رفتہ شراب نوشی کی لعنت کو ختم کر دیا اور نومسلم معاشرہ کی عقل وضمیر کو پاکیزہ بنا دیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ شراب تین مرتبہ میں حرام کی گئی، جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوا کی آمدنی کھاتے تھے، لوگوں نے حضور پاکؐ سے شراب اور جوا کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرہ-۲۱۹)

پوچھتے ہیں: شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگوں نے کہا کہ شراب اور جوا کو حرام نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں گناہ بھی ہے اور فائدہ بھی ہے۔ چنانچہ لوگ اب بھی شراب پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک صحابی مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور وہ شراب پیے ہوئے تھے اس لیے ان کی قراءت

---

۱ مسلم، کتاب الاشربۃ، باب بیان ان کل مسکر خمر وان کل خمر حرام

گڑبڑ ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاَ تَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (النساء-۴۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

چنانچہ لوگ اب بھی شراب پیتے رہے، البتہ نماز کے وقت نہ پیتے، بعض لوگ نماز میں اس حالت میں آتے کہ ان پر نشہ کا اثر ہوتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے شراب کو مکمل حرام کرتے ہوئے یہ آیت نازل کی۔ اے ایمان والو شراب جوا، پانسہ اور بتوں کے نام کا تیر ناپاک اور شیطانی اعمال ہیں تم ان سے پرہیز کرو۔ تو لوگوں نے اعلان کیا کہ ہم شراب نوشی سے باز آئے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے یک دم شراب نوشی چھوڑ دی، شراب نالیوں اور گڈھوں میں بہادی گئی، یہاں تک کہ شراب کے مٹکے، پیمانے اور جام وسبوسب توڑ ڈالے گئے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کا وہ تاریخی مظاہرہ ہوا کہ اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ نافع بن کیسان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ان کے والد شراب کی تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ملک شام سے بہترین شراب تجارت کے لیے لے کر آئے اور رسول اللہ ﷺ کو ایک اچھی شراب یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ پاکیزہ شراب ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے کیسان اللہ نے شراب حرام کردی ہے، تو انھوں نے پوچھا پھر میں اسے بیچ دوں؟ تو آپ نے فرمایا اس کی قیمت بھی حرام ہے تو حضرت کیسان نے شراب کے مٹکے بہادیے۔ [۱]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے اور اسے ہوش، عقل، شعور،

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، المائدہ-۹۱

تمیز، بصیرت اور قوت فیصلہ جیسی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے، یہ اس کے اشرف المخلوق ہونے کی علامت ہے اور اسی عقل وشعور کی دولت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے اسلامی احکام کا مکلّف بنایا ہے ورنہ پاگل اور دیوانے پر شریعت کوئی حکم لاگو نہیں کرتی، کیونکہ اس کے پاس عقل ہی نہیں ہے، جب انسان شراب نوشی کرتا ہے اور نشہ آور چیزیں استعمال کرتا ہے تو اس کے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں رہتے، عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کی عطا کردہ عظیم نعمت کو اپنی گندی حرکت سے ذلیل اور پست کر دیتا ہے۔

پھر شیطان اسی نشہ خوری کے ذریعہ لوگوں کو باہم لڑاتا ہے، گالم گلوچ کرنا ایک دوسرے کی عزت وآبرو سے کھیلنا، بلکہ ایک دوسرے پر حملہ کرنا، بلکہ قتل تک کی واردات بھی شراب نوشی کی وجہ سے صادر ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت وشرافت کو محفوظ کرنے اور انسانی عقل وشعور کو بیدار رکھنے کے لیے نشہ آور چیزوں کے استعمال پر پابندی لگائی ہے، نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

من شرب الخمر في الدنيا لم يشربها في الآخرة الا ان يتوب [1]

جو شخص دنیا میں شراب پیے گا وہ آخرت میں شراب طہور سے
محروم رہے گا، الا یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ شراب اگر اتنی مقدار میں پی جائے کہ عقل و ہوش ختم ہو جائے تو حرام ہے، لیکن اگر تھوڑی مقدار میں پی جائے جس سے سرور آئے نشہ نہ آئے اور شرابی عقل وہوش میں رہے تو کیا حرج ہے؟ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو صرف حرام نہیں کیا ہے بلکہ اسے ناپاک بھی قرار دیا ہے یعنی شراب کم ہو یا زیادہ ہر صورت میں ناپاک ہے اور ہر حالت میں حرام ہے۔ اسی لیے فقہاء اسلام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ "ما كثيره حرام فقليله حرام" جس کی

[1] مسلم، کتاب الاشربۃ

زیادہ مقدار حرام ہے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ اس کی مثال پیشاب جیسی ہے، اس کا زیادہ پینا یا کم پینا ہر حالت میں حرام ہے اسی طرح شراب بھی ہے۔

بعض لوگ شراب کے طبی اور جسمانی فائدے بھی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں بھی تو اس کے نفع کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن ایسا سمجھنا غلط ہے کیونکہ قرآن نے شراب اور جوا کے طبی فوائد نہیں بتائے بلکہ اس رواج کی طرف اشارہ کیا ہے جو عربوں میں رائج تھا کہ عرب شراب نوشی اور جوا کی محفل لگاتے اور ہار جیت اونٹوں پر ہوتی، جیتنے والا اونٹوں کو ذبح کرتا اور ان کا گوشت، کباب وغیرہ سے لطف اندوز ہوتا، جوا اور شراب و کباب کی یہ محفلیں جس جگہ منعقد ہوتیں وہاں غریب، مسکین اور محتاج لوگ بھی جمع ہو جاتے اور جوئے باز کچھ گوشت خود استعمال کرتے اور باقی تماشہ بین محتاجوں کو بانٹ دیتے۔ شراب اور جوا کی مجلسوں سے غریبوں کو جو فائدہ ہوتا تھا قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر اس کو بھی بالآخر اسلام نے ختم کر دیا، کیونکہ نیکی کو گناہ کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔

جوا ہر وہ کھیل ہے جس میں ہار جیت کی بازی لگتی ہو جیسے شطرنج، چوسر، تاش، مرغ بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی، لاٹری وغیرہ ساری چیزیں جن میں پیسہ کمایا اور گنوایا جاتا ہو سب جوا کی شکلیں ہیں اور اسلام نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ اللہ نے انسانوں کو حلال رزق کھانے کا حکم دیا ہے جس میں انسان اپنی عقل، صلاحیت اور محنت سے پیسہ حاصل کرتا ہے، اس میں انسان کی صحت، بچوں کا مستقبل اور خاندان کی عزت سب برقرار رہتی ہے، اس کے برخلاف انسان جب جوا کھیلتا ہے تو دوہرے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، جب وہ اپنی دولت جوے میں ہارتا ہے تو اپنی آمدنی کو حرام کام کے لیے استعمال کرنے کا گنہگار ہوتا ہے اور جب جوے میں وہ مال جیت کر آتا ہے تو حرام ذریعہ سے مال کمانے کا مرتکب ہوتا ہے، یعنی ہر حالت میں وہ گنہگار ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے میں جوے کی نئی نئی شکلیں نکل گئی ہیں، لاٹری کے علاوہ تجارت میں بھی جوے بازی کے راستے کھل گئے ہیں، بڑے بڑے ہوٹلوں میں جوے کے مراکز بن گئے جن کو کیسینو اور دوسرے خوبصورت نام دیے گئے ہیں۔ ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ جوے کی پرانی اور نئی تمام شکلوں سے پرہیز کرے اور اپنے آپ کو حرام کمائی سے محفوظ رکھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح شراب کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے اسی طرح جوا کو بھی ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو جوا کی اتنی سنگین مثال دی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''جو شخص جوا کھیلتا ہے پھر وہ اٹھتا ہے اور نماز پڑھتا ہے وہ ایسا ہے جیسے ایک شخص پیپ اور خنزیر کے خون سے ہاتھ اور منھ دھوتا ہے اور نماز پڑھنے لگتا ہے'' [۱]

شراب اور جوا کی لعنت سے اپنے معاشرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً عوامی بیداری کے پروگرام کریں اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مہم چلائیں۔ اپنے معاشرہ کو نشہ خوری اور حرام خوری سے بچانا بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو شراب اور جوا کی لعنت سے بچائے۔ (آمین)

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، المائدۃ، آیت ۹۰

حلال روزی کمانا فرض ہے

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

وَلاَ تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰـهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوْا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْماً. (النسا-۳۲)

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اللہ جو خالق اور مالک اور رازق ہے، اس نے ہر جاندار کی رزق رسانی کا انتظام کیا ہے، انسان کو بھی روزی وہی دیتا ہے، رزق میں کمی اور اضافہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے، مگر اس نے انسان کو رزق حاصل کرنے کے لیے محنت ومشقت اور دوڑ دھوپ کا بھی حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین پر آباد کیا ہے اور اس کی ضرورت کی ہر چیز زمین سے وابستہ کردی ہے، انسان یہاں جتنی محنت کرے گا اتنا ہی اسے مال اور سامان رزق مہیا ہوگا۔ غلہ، اناج، پھل، پھول، معدنیات، سونا چاندی، سب کچھ زمین سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے زراعت،

تجارت، ملازمت، اجرت، صنعت، حرفت وغیرہ کا سہارا لینا ضروری ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِی مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْر. (الملک۔۱۵)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کے سینہ پر اور کھاؤ خدا کا رزق اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی معرفت اور عبادت فرض کی ہے اسی طرح اس نے اس پر حلال روزی کمانا بھی فرض قرار دیا ہے، چنانچہ نماز جمعہ کی فرضیت کو ادا کرنے کے بعد کسب معاش میں لگ جانے کا حکم اس طرح دیا ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْراً لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (الجمعہ۔۱۰)

پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔

رزق حاصل کرنے کے لیے ہر انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے اور کرنی چاہیے، اللہ نے اپنے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کو بھی حلال روزی کمانے کا حکم دیا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ. (المومنون۔۵۱)

اے پیغمبرو، کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح، تم جو کچھ بھی کرتے ہو، میں اس کو خوب جانتا ہوں۔

چنانچہ تمام انبیاء کرام دین کی دعوت کا کام انجام دیتے اور لوگوں سے اس

کام پر کوئی اجرت اور چندہ وصول نہیں کرتے بلکہ خود اپنی محنت ومشقت سے رزق حاصل کرتے۔ حدیث کی کتابوں میں انبیاء کے مختلف پیشوں اور محنتوں کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت مقدام بن معدیکرب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما اکل احد طعاما ما قط خیرا من ان یاکل من عمل یدیه وان نبی الله داؤد کان یاکل من عمل یدیه[۱]

کوئی شخص اپنے ہاتھوں کی کمائی سے بہتر کوئی روزی نہیں کھاتا اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کما کر کھاتے تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی تجارت کرتے تھے اور اپنی روزی آپ کماتے تھے، نبوت سے پہلے آپ کے تجارتی سفر پر جایا کرتے تھے۔ یہ سب کو معلوم ہے، نبوت کے بعد بھی آپ تجارت کے لیے خود تو سفر نہیں کرتے تھے مگر تجارت میں حصہ لیتے تھے، اگر آپ چاہتے تو مسلمانوں کی زکوۃ وصدقات قبول کر سکتے تھے اور لوگ اپنی زکوۃ صدقات آپ کے پاس لا کر ڈھیر لگا دیتے، مگر آپ نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے خاندان کے ہر فرد پر زکوۃ وصدقات کا مال لینے پر پابندی عائد کر لی تھی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو حلال روزی کمانے کا حکم دیا تھا اسی طرح عام بندوں کو بھی حلال روزی کمانے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ (المائدہ-۸۸)

جو کچھ حلال وطیب رزق سے اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوامؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[۱] بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ

لان یاخذ احدکم حبلہ فیاتی بحزمۃ حطب علی ظھرہ فیبیعھا فیکُفَّ اللہ بھا وجھہٗ خیر لہ من ان یسأل الناس اعطوہ اومنعوہ[۱]

تم میں سے کوئی شخص کلہاڑی سے لکڑی کاٹ کر گٹھر اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لائے اور اسے فروخت کرے، اس کے ذریعہ اللہ اس کے چہرہ کی حفاظت کرے یہ اس کے لیے بہتر ہے اس سے کہ وہ لوگوں سے مانگے اور لوگ اسے دیں یا منع کردیں۔

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک انصاری حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی محتاجی کی شکایت کرنے لگے آپؐ نے پوچھا کہ تمہارے گھر میں کیا ہے، انھوں نے کہا کہ ایک کمبل ہے جسے ہم اوڑھتے ہیں اور بچھاتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپﷺ نے فرمایا جاؤ دونوں چیزیں لے کر آؤ، وہ صحابیؓ جب کمبل اور پیالہ لے کر آئے تو آپ نے حاضرین مجلس سے فرمایا کون اسے خریدے گا؟ ایک صحابیؓ نے ایک درہم میں خریدنے کی پیش کش کی تو آپ نے فرمایا دو یا تین درہم میں کون خریدے گا؟ ایک دوسرے صحابی نے دو درہم میں اسے خریدلیا، رسول پاک نے وہ دو درہم اس انصاری کے حوالہ کردیا اور فرمایا کہ ایک درہم میں کھانے کا سامان خرید کر گھر والوں کو دو اور دوسرے درہم کی ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ، صحابیؓ نے حکم کی تعمیل کی، ایک درہم میں کھانے کا سامان خریدا اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر حضورﷺ کے پاس لائے آپ نے اپنے دست مبارک سے اس میں ہتھہ لگادیا اور فرمایا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور اسے فروخت کرو پھر پندرہ دنوں کے بعد میرے پاس آؤ۔ وہ صحابیؓ گئے اور لکڑیاں کاٹ کر بیچنے لگے جب پندرہ دنوں بعد واپس آئے تو وہ دس درہم کما چکے تھے، آپ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا اس طرح کما کر کھانا تمھارے لیے

---

۱ بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسألۃ

بہتر ہے اس سے کہ تم لوگوں سے مانگتے پھرو اور قیامت کے دن تمہارا چہرہ داغدار ہو۔[۱]

مکہ سے ہجرت کر کے جو لوگ مدینہ آئے ان میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر مہاجر کو کسی انصاری کا بھائی بنا کر ان کے حوالہ کر دیا تھا تاکہ وہ ان کے قیام و طعام میں مدد کریں، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو حضرت سعد بن ربیعؓ کا بھائی بنایا اور انھوں نے کمال اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا باغ آدھا بانٹ کر حضرت عبد الرحمٰن کو پیش کر دیا مگر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے ان کا مال شکریہ کے ساتھ ان کو واپس کر دیا اور کہا کہ آپ مجھے بازار دکھا دیجیے، چنانچہ وہ بازار گئے اور وہاں گھی اور چمڑے کی خرید و فروخت کرنے لگے، مفت مال قبول کرنے پر تجارت کرنے کو اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کو ترجیح دی، رفتہ رفتہ ان کا کاروبار بڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ مدینہ کے بڑے تاجروں میں ان کا شمار ہونے لگا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جہاد کے موقع پر ہزاروں دینار اور قحط وغیرہ کے موقع پر سینکڑوں لدے ہوئے اونٹ اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے لگے، یہ برکت اس تجارت کی تھی جسے انھوں نے اختیار کیا تھا۔

اسلام نے ہاتھ سے کمانے کی ہمت افزائی کی ہے اور ہاتھ پھیلانے کی ممانعت کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما یزال الرجل یسأل الناس حتی یأتی یوم القیٰمة
ولیس فی وجهه مزغة لحم.[۲]

تم میں سے جو کوئی مانگنے کی عادت ڈالتا ہے وہ قیامت کے دن
اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوگا۔

نبی پاک ﷺ نے قبیصہ بن المخارقؓ سے فرمایا کہ ہاتھ پھیلانا تین آدمیوں کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے:

ایک وہ آدمی جو کسی ضمانت یا قرض میں مبتلا ہو اس کے لیے مانگنا اس وقت

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب ماتجوز فیہ المسالۃ
[۲] بخاری، کتاب الزکوۃ، باب من سأل الناس تکثرا

تک جائز ہے جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ ہو جائے۔

دوسرا وہ آدمی جو کسی آفت میں مبتلا ہو اور اس کا مال برباد ہو گیا ہو اس کے لیے اس وقت مانگنا جائز ہے جب تک کہ اس کی حالت بحال نہ ہو جائے۔

تیسرا وہ آدمی جس کے گھر میں فاقہ ہو اور تین لوگ یہ کہہ دیں کہ اس کے یہاں فاقہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے مانگنا حرام ہے۔[1]

جس طرح اسلام نے ہاتھ پھیلانے کی ممانعت کی ہے اسی طرح غلط طریقہ سے مال کمانے کو حرام قرار دیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (البقرہ-۱۸۸)

اور تم ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔

باطل طریقے سے مال کھانے کا مطلب ناجائز اور حرام آمدنی ہے، مثلاً چوری اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ مال کمانا، سود اور جوا کے ذریعہ مال کمانا، دھوکہ دہی اور ملاوٹ کے ذریعہ مال کمانا، ناپ تول میں کمی کرنا، غبن اور رشوت کے ذریعہ مال کمانا، خیانت اور بدعہدی کے ذریعہ مال کمانا، بدکاری اور شراب فروشی کے ذریعہ اور حرام مال کی تجارت کے ذریعہ مال کمانا وغیرہ ایسی تمام آمدنی کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ایسی کمائی میں نہ تو خیر و برکت ہے اور نہ ہی ایسے شخص کی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ ایسا شخص جنت میں جانے کا حق دار ہے، مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیکار نہ بیٹھے، رزق حاصل کرنے کا حلال ذریعہ تلاش کرے، کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، پیشہ چاہے کم تر ہو یا برتر، بشرطیکہ وہ حلال ہو اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے، یہ خود ایک عبادت ہے۔ شرم کی بات تو یہ ہے کہ انسان حرام طریقہ سے مال کمائے اور اس سے اپنی اور اپنی اولاد کی پرورش کرے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حلال رزق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری عبادت کو قبول فرمائے۔ (آمین)

---

[1] مسلم، کتاب الزکوۃ، باب من تحل لہ المسئلۃ

صحت اللہ کی نعمت ہے

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اَلَمْ نَجْعَلْ لَہٗ عَیْنَیْنِ وَلِسَاناً وَّشَفَتَیْنِ وَھَدَیْنَاہُ النَّجْدَیْنِ (البلد:۸-۱۰)

کیا ہم نے اسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کیے اور خیر و شر دونوں راستوں کی رہنمائی نہیں کی؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف**[۱] طاقت ور مومن بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

عام انسانوں کے لیے صحت کا مسئلہ محض ذاتی اور سماجی مسئلہ ہوسکتا ہے مگر ایک مسلمان کے لیے تو صحت کا مسئلہ صرف اس کی ذات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے مذہب اور دین و ایمان سے جڑا ہوا ہے۔ کیونکہ صحت مند مسلمان ہی مکمل عبادت کرسکتا ہے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرسکتا ہے اور صحت مند روح صحت مند جسم کے اندر رہ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں بہترین نعمتیں جسم و جان اور اعضائے بدن کی ہیں۔ جسمانی صحت وہ نعمت ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، یہ وہ دولت ہے جس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، رسول پاک ﷺ نے فرمایا: **الصحۃ لمن اتق اللہ خیر من الغنی**[۲] اللہ کے متقی بندوں کے لیے صحت مالداری سے بہتر ہے۔

---

[۱] مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان لہ

[۲] ابن ماجہ، کتاب التجارات

رسول پاک ﷺ نے صحت کی قدر کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کی امت کو تعلیم دی، آپ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو (۱) اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے (۲) اپنی صحت کو بیماری سے پہلے (۳) اپنی مال داری کو ناداری سے پہلے (۴) اپنی فرصت کو مشغولیت سے پہلے (۵) اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔[1]

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے اپنی ہر نعمت کے بارے میں سوال کرے گا اور جسمانی نعمت کے بارے میں تو خاص طور پر سوال کرے گا۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (التکاثر-۸)

''اور ضرور تم سے قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

صحة الابدان و الاسماع و الابصار

''اس سے مراد جسمانی صحت اور آنکھوں اور کانوں کی صحت ہے''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جو تفسیر فرمائی ہے وہ قرآن ہی کی ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُوْلٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً (بنی اسرائیل-۳۶)

''بے شک کان اور آنکھ اور قلب ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا''

ان نعمتوں کے دو تقاضے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے ان کو بیماری و آزاری سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کی جائے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] مشکوۃ المصابیح، کتاب الرقاق

جس مقصد کے لیے جسمانی صحت ونعمت دی ہے اسی کے مطابق استعمال کیا جائے اور غلط کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نعمتان مغبون فیھا کثیر من الناس الصحة و الفراغ۔ ۱

''دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے سلسلہ میں اکثر لوگ دھوکے میں مبتلا رہتے ہیں ایک صحت دوسرے فرصت''

یعنی اکثر لوگ صحت وفرصت کا پورا خیال نہیں رکھتے، ان کے تقاضے پورا نہیں کرتے اور جب ان پر زوال آتا ہے تو کف افسوس ملتے ہیں۔ نبی ﷺ نے تاکید فرمائی کہ تمہای جان کا تمہارے اوپر حق ہے، تمہارے جسم کا تمارے اوپر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تمہارے اوپر حق ہے تو ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ ۲

جسم و جان کا حق آدمی اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب کہ اس کے سلسلہ میں وہ فکر مند اور حساس ہو، اسے معلوم ہو کہ کن چیزوں سے صحت خراب ہوتی ہے اور اگر صحت خراب ہو جائے تو کیوں کر تندرستی بحال کی جاسکتی ہے، پھر ان تدابیر پر عمل بھی کرے۔ غربت وافلاس اور بے روزگاری جتنی بیماری نہیں لاتی اس سے زیادہ بیماری لاپرواہی، بے شعوری، بری عادتیں، گندگی اور احتیاطی تدابیر سے غفلت لے کر آتی ہے، نشہ آور اشیا کا استعمال نہ صرف ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو گھن لگاتا ہے بلکہ ہماری جسمانی اور اعصابی قوتوں پر بھی مضر اثرات مرتب کرتا ہے، کینسر کے امکان میں اضافہ کرتا ہے، بری عادت میں مبتلا ہونے سے انسان رحمت خداوندی کو ہی دور نہیں کرتا بلکہ روحانی مسرتوں کو بھی دور کر دیتا ہے۔

اگر انسان احتیاطی تدابیر اختیار کرلے، صحت وصفائی کے اصولوں کو زندگی میں وہی مقام دے جو اپنی ضروریات زندگی کو دیتا ہے تو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہ

---

۱ بخاری، کتاب الرقاق، باب لاعیش الاعیش الآخرة

۲ بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم

سکتا ہے۔ غذاؤں کا مناسب اہتمام محنت وراحت کا مناسب نظام اور مفید ومضر اشیاء کا عرفان انسانی صحت کو یقینی بناتا ہے۔ ہمارے عہد میں موذی بیماریوں سے بچنے کی جو تدابیر موجود ہیں ان سے غفلت برتنا اپنے جسم و جان کی نعمت کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔

مثال کے طور پر ایڈز کی بیماری کی ایک بڑی وجہ جنسی تسکین کے لیے ناجائز طریقوں کو اختیار کرنا ہے۔ اگر انسان قدرت کے مقرر کردہ جنسی قوانین کی پابندی کرے تو ایڈز جیسی خطرناک بیماری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یرقان کی جدید شکل جسے ہیپاٹائٹس بی کہا جاتا ہے، اگر پہلے سے ہی اس کے ٹیکے لگا لیے جائیں تو اس موذی بیماری سے حفاظت ممکن ہے، پولیو کی خوراک اگر ۵ سال کی عمر سے پہلے بچوں کو پلا دی جائے تو پولیو جیسی اپاہج کر دینے والی بیماری سے تحفظ فراہم ہوسکتا ہے۔ انزاپٹکس یا دماغی بخار کا انجکشن قبل از وقت لگا ہے تو اس اعصاب شکن بیماری سے دور رہنا ممکن ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی مہلک بیماریاں ہیں جن سے تحفظ کی تدابیر، دواؤں، انجکشن اور ٹیکوں کی شکل میں کی جاتی ہیں۔ میڈیکل سائنس کی روز افزوں ترقی نے انسانوں کو بیماریوں سے بچنے اور مقابلہ کرنے کا پورا حوصلہ فراہم کیا ہے، بڑی محرومی اور اللہ کی نعمت کی ناقدری ہوگی کہ ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اگر ہماری غفلت بے حسی کے سبب کوئی بچہ معذور اور اپاہج ہوگیا، کوئی جسم اپنی توانائی اور طاقت کھو بیٹھا تو نہ صرف اس کی زندگی عذاب بن جائے گی بلکہ وہ دوسروں پر بوجھ بن جائے گا۔

محنت ومقابلہ کے اس زمانے میں جہاں ہر شخص کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے محنت ومشقت کی راہ اپنانی ہے وہاں دوسروں پر بوجھ بن جانا قابل تشویش ہے۔ اسلام نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ لوگ دوسرے پر بوجھ بنیں، اسلام ایسے افراد کو پسند کرتا ہے جو ہمت وحوصلہ اور محنت ومقابلہ کو رفیق سفر بنائیں۔ وہ محتاج رہنے کے بجائے

مختار بنیں، دست نگر رہنے کے بجائے دست گیر ثابت ہوں۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

الید العلیا خیر من الید السفلیٰ۔[1]

''اوپر کا ہاتھ (دینے والا) نیچے کے ساتھ سے بہتر ہے''

حضرت شقیق بلخی مشہور بزرگ گزرے ہیں، ایک مرتبہ تجارتی سفر پر نکلے، سفر سے پہلے اپنے دوست حضرت ابراہیم بن ادہم سے ملنے گئے، ان کو اپنے تجارتی سفر کی اطلاع دی اور اجازت لی، مگر خلاف توقع بہت جلد سفر سے لوٹ آئے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے حیرت سے اتنی جلدی لوٹ آنے کا سبب پوچھا تو حضرت شقیق بلخی نے کہا کہ میں نے سفر میں آرام کرنے کے لیے ایک ویران جگہ میں پڑاؤ ڈالا تو دیکھا کہ ایک معذور پرندہ وہاں بیٹھا ہے، خیال ہوا کہ اس معذور پرندہ کا گزر کیسے ہوتا ہوگا۔ اتنے میں ایک دوسرا پرندہ اپنی چونچ میں خوراک لے کر آیا اور معذور پرندہ کو کھلا کر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا اللہ تعالیٰ ویرانے میں معذور پرندہ کو رزق بھیج سکتا ہے تو مجھے شہر شہر بھٹکنے کی ضرورت کیا ہے، یہ سوچ کر میں راستہ سے لوٹ آیا، اس پر حضرت ابراہیم بن ادہم نے فرمایا افسوس کہ تم نے معذور پرندہ بننا قبول کیا اور تم نے یہ نہ پسند کیا کہ تم اس پرندہ کی طرح بنو جو اپنا رزق بھی حاصل کرتا ہے اور دوسروں کا بھی پیٹ پالتا ہے۔ تم بھول گئے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

مسلمان اگر اسلام کی اس روح کو دھیان میں رکھیں تو کبھی بیماری و آزاری، بے کاری اور دست نگری کو قریب نہ آنے دیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

الا وان من النعم سعة المال و افضل من سعة المال صحة البدن و افضل من صحة البدن تقوی القلب۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسألۃ

[2] نہج البلاغۃ، المختار من حکم

یاد رکھو کہ مال کی کشادگی نعمت ہے اور کشادگی مال سے افضل
جسمانی صحت ہے اور جسمانی صحت سے افضل دل کا تقویٰ ہے۔

مسلمان طاقت ور اور امراض سے پاک ہوگا تو یہ اسلام کی قوت میں اضافہ کرے گا اور اگر مسلمان کمزور رہوگا تو اس کی کمزوری اسلام کی طرف منسوب کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے سامنے عرب کے ایک مشہور پہلوان رکانہ نے یہ شرط رکھی کہ آپ مجھ سے کشتی لڑیں اور جیت جائیں تو میں آپ کا کلمہ پڑھ لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے رکانہ کی یہ دعوت قبول کرلی، مقابلہ ہوا اور آپؐ جیت گئے، یہ جیت اگرچہ جسم وطاقت کی تھی مگر یہ اسلام کی جیت بن گئی کیوں کہ رکانہ نے اسلام قبول کرلیا۔ آج کے مسلمانوں کو بھی اسی جسماجی صحت اور طاقت وتوانائی کی ضرورت ہے۔ کاش ہر مسلمان اپنے عقیدہ وعمل کی حفاظت کے ساتھ اپنے وقت اور صحت کی حفاظت کو قومی ایجنڈے میں شامل کرلے اور اس بات کو یقینی بنالے کہ مسلمانوں کا معاشرہ صحت مند معاشرہ ہو، روحانی، اخلاقی، تعلیمی اور جسمانی صحت مندی کا معاشرہ، معذوروں، کمزوروں، محتاجوں اور بے زراوں کا معاشرہ نہیں۔ تبھی یہ معاشرہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوگا۔ نظیر اکبر آبادی کا شعر ہے:

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اللہ تعالیٰ سبھی مسلمانوں کو صحت اور نعمت سے سرفراز کرے۔ (آمین)

زبان کی حفاظت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ. اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْناً.
(بنی اسرائیل-۵۳)

اور اے محمد! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہتر ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو ان کے درمیان پھوٹ ڈالتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو زبان کا استعمال سلیقہ سے کرنے اور اچھی بات کرنے کی تاکید کریں، کیونکہ شیطان انسانوں کے درمیان جو لڑائی جھگڑے کراتا ہے وہ انسان کی زبان ہی کو ذریعہ بناتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے کر انسانوں کو ایک انتہائی اہم اور ضروری سماجی اور اخلاقی مسئلہ کی طرف متوجہ کیا ہے، جس سے عموماً آج کا انسان غافل ہے، انسانی تعلقات کے بننے بگڑنے اور انسان کی شخصیت کا وقار قائم ہونے اور ختم ہونے میں سب سے بڑا دخل انسان کی زبان کا ہے، اگر انسان کی زبان موقع بے موقع چلتی رہے، حق و ناحق کی تمیز کے بغیر استعمال ہو، دوسروں کو سخت وست کہنے اور طنز و تعریض کرنے میں استعمال ہو، گالم گلوج اور فتنہ و فساد میں استعمال ہو تو اس سے بری کوئی چیز نہیں، اس سے بہتر تو وہ گونگا ہے جس کی زبان بند ہے، کم از کم دوسرے لوگ تو اس کے زبان کی برائی سے

محفوظ ہیں۔ اسی لیے نبی پاک ﷺ نے مسلمان ہونے کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور دوسرے لوگوں کو اپنی زبان سے تکلیف نہ دے۔ آپ نے فرمایا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده. ۱

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی برائی سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

زبان کا غلط استعمال کرنے والا مومن نہیں ہوتا، اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی ۲

مومن طعنہ زن نہیں ہوتا، ملامت گر نہیں ہوتا، بے حیا اور بدزبان نہیں ہوتا۔

اگر انسان کی زبان حق گوئی اور صلح جوئی کے لیے استعمال ہو، بھلائی اور نصیحت کے لیے استعمال ہو، محبت اور شرافت کا اس سے اظہار ہو تو اس سے اچھی کوئی چیز نہیں۔

زبان درحقیقت انسان کے دل و دماغ اور شخصیت کی ترجمان ہے، اگر ترجمانی بری ہے تو شخصیت بری ہے اور ترجمانی اچھی ہے تو شخصیت بھی اچھی ہے۔ دل وجدان، ضمیر، فکر، ہدایت کا مرکز ہے اور زبان اس کی ترجمان اور ذریعہ اظہار ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے نہایت حکیمانہ طریقہ سے ایمان، دل اور زبان کے رشتہ کو سمجھایا ہے:

لا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبه ولا یستقیم قلب احد حتی یستقیم لسانه. ۳

---

۱ ترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء المسلم من سلم المسلمون من لسانه

۲ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی اللعنة

۳ مسند احمد ۲/ ۱۹۸

کسی بندہ کا ایمان سلامت نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کا دل
سلامت نہ رہے اور کسی بندہ کا دل سلامت نہیں رہ سکتا جب تک
کہ اس کی زبان سلامت نہ رہے۔

ایمان کی سلامتی کے لیے دل کی سلامتی ضروری ہے اور دل کی سلامتی کے لیے زبان کی سلامتی ضروری ہے کیونکہ ایمان دل کی کیفیت کا نام ہے اور دل کی کیفیت کا اظہار زبان سے ہوتا ہے، جب تک انسان خاموش رہتا ہے اس کی شخصیت کے بارے میں دوسروں کو اندازہ نہیں ہوتا اور جب وہ بولتا ہے تو اپنے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ عقل مند لوگ اس کے بارے میں اچھی یا بری جو بھی ہو رائے قائم کر لیتے ہیں۔ عقل مندوں کو زبان کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے، بغیر سوچے سمجھے زبان کبھی نہ کھولنی چاہیے، بڑا حکیمانہ مقولہ ہے کہ ''عقل مند کی زبان اس کے دل میں ہوتی ہے اور بے وقوف کا دل اس کی زبان پر ہوتا ہے''۔

زبان کی وجہ سے انسان کا وقار اور بھرم صرف دوسرے لوگوں کے درمیان ہی نہیں بنتا اور بگڑتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی انسان کا بھرم اس کی زبان کی وجہ سے ہوتا ہے اور اسی سے اس کا مواخذہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان العبد لیتکلم بالکلمة من رضوان الله لا یلقی لها بالا یرفع الله بها درجات وان العبد لیتکلم بالکلمة من سخط الله تعالیٰ لا یلقی لها با لا یهوی بها فی جهنم۔[1]

بندہ اللہ کی خوشنودی کی کوئی بات کہتا ہے جسے وہ خود بہت زیادہ
اہمیت نہیں دیتا، مگر اللہ تعالیٰ اس کی بات کے سبب اس کا درجہ
بلند کر دیتا ہے، اسی طرح ایک بندہ اللہ کی ناراضگی کا کوئی جملہ
اپنے منہ سے نکالتا ہے جسے وہ بہت زیادہ اہمیت نہں دیتا، مگر اس
کے سبب اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ڈال دیتا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

سلیمان خطیب نے حدیث رسول علیہ ﷺ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے:

بات ہیرا ہے بات موتی ہے بات لاکھوں کی لاج کھوتی ہے
بات پھولوں کا باغ ہوتی ہے بات سینہ کا داغ ہوتی ہے
بات خیر و ثواب ہوتی ہے بات قہرو عذاب ہوتی ہے
بات برگ گلاب ہوتی ہے بات تیغ عتاب ہوتی ہے
بات کہتے ہیں رب ارنی کو بات اُمُّ الکتاب ہوتی ہے
بات ہر بات کو نہیں کہتے
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

بہت سے لوگوں کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے، غصہ، نفرت، حسد بغض اور منافقت کے الفاظ استعمال کرنے میں ان کو اللہ کا خوف نہیں ہوتا۔ دل آزاری اور توہین وتذلیل کے جملے استعمال کر کے وہ سکون پاتے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں زبان ان کے خلاف گواہی دے گی اور کہے گی کہ اس نے مجھے تیرے حکم کے خلاف استعمال کیا تھا۔ قرآن پاک میں ہے:

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النور-۲۴)

وہ اس دن کو نہ بھول جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

اسلام کی سماجی تعلیمات میں ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ انسان یا تو اچھی بات کرے، نیکی ثواب اور بھلائی کی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔ اگر گفتگو غیر مفید ہو تو خاموشی اچھی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من كان يومن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً او ليصمت ۔[1]
جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بھلائی کی بات

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر

کرے ورنہ خاموش رہے۔

لایعنی اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا بھی ایک شریف انسان کے لیے ضروری ہے۔ کامیاب مومن کی یہ صفت بتائی گئی ہے: **والذین هم عن اللغو معرضون** (المومن-۳) وہ لوگ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے لایعنی باتوں سے پرہیز کرنے کو اسلام کی خوبصورتی بتایا ہے: **من حسن اسلام المرء ترک ما لا یعنیه**[1] انسان کے اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو ترک کرے۔

انسانی زندگی میں چھوٹی اور بڑی باتوں پر اختلافات ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی حالات اتنے بگڑتے ہیں کہ جنگ وجدال کی نوبت آ جاتی ہے، ان سب کی ابتدا زبان درازی اور تلخ کلامی سے ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ناحق مومنوں کو چھیڑا جاتا ہے تا کہ ان کو پریشان کیا جائے اور اگر وہ ردّعمل کا اظہار کریں تو پھر ان سے لڑائی جھگڑا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم یہ دیا ہے کہ لڑائی جھگڑے میں پڑنے کے بجائے خوبصورت طریقہ سے اسے ٹالیں۔ **وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا**۔ (الفرقان-۶۳) اور جب جاہل لوگ مومنوں کو مخاطب کرتے ہیں یعنی چھیڑتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام۔

اسی طرح مناظرہ ومباحثہ کرتے وقت بھی انسان کو اچھی سچی اور شریفانہ بات کہنے کا حکم دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ.
(العنکبوت-۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے۔

اہل کتاب سے جس طرز گفتگو کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہی حکم

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء من تکلم بالکلمۃ لیضحک الناس

سارے انسانوں کے معاملے میں ہے، بحث وتکرار کرنا لڑائی جھگڑے پر اتر آنا مومن کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ.

(الاعراف-۱۹۹)

اے نبیؐ، نرمی ودرگذر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔

رسول پاک ﷺ نے سب سے برا اس شخص کو کہا ہے، جو ہر وقت بحث و تکرار کرتا ہے اور دوسروں سے الجھتا رہتا ہے۔[1]

زبان کا سب سے اچھا استعمال یہ ہے کہ انسان دوسروں سے نصیحت وخیر خواہی کی، عفو ودرگذری کی اور حوصلہ مندی کی بات کرے، بلکہ قرآن میں ان نیک باتوں کو اس صدقہ سے بہتر کہا گیا ہے جس کے بعد انسان اس کا احسان جتلائے، کسی سے محبت بھری بات کہنا، میٹھے بول بولنا زیادہ اچھا ہے کچھ روپے دے کر احسان جتانے سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى.

(البقرہ-۲۶۳)

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذراسی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے دکھ ہو۔

روپیہ پیسہ لینے والا تو حالات بہتر ہونے پر لوٹا بھی سکتا ہے مگر خیر خواہی اور محبت کی باتوں کا معاوضہ نہیں دے سکتا، اس لیے اپنی زبان کو دوسروں کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے استعمال کرنا بڑی نیکی ہے اور ایسی نیکی جس میں کچھ خرچ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو زبان کے صحیح استعمال کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[1] بخاری، کتاب الادب،

پڑوسیوں کے حقوق

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَاعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ. (النساء-۳۶)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے۔

اسلام میں والدین اور رشتہ داروں کے بعد سب سے زیادہ پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **ما زال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه**[1] جبریل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے بارے میں نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ شاید پڑوسی کو بھی وارث بنا دیں گے۔

انسان پر سکون اور پر امن زندگی گذارنا چاہتا ہے، الجھنوں، تکلیف، تناؤ اور ٹینشن سے محفوظ رہنا چاہتا ہے، گھریلو الجھنوں کے بعد انسان کو عام طور پر پڑوسی سے

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الوصایا بالجار۔ مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار

الجھن ہو جاتی ہے، کبھی مالی اور سماجی حیثیت میں فرق کی وجہ سے تناؤ ہوتا ہے، کبھی پڑوسی کے رویہ اور سلوک سے تناؤ رہتا ہے، کبھی بچوں کے کھیلنے سے تناؤ ہوتا ہے، کبھی جانور کے گھس جانے سے تناؤ ہوتا ہے، کبھی دروازہ اور کھڑکی کا جھگڑا ہوتا ہے، کبھی کوڑا کرکٹ پھینکنے پر تنازع ہوتا ہے اور کبھی نالی کا پانی بہنے پر تصادم ہوتا ہے۔ غرضیکہ پڑوسیوں کے مابین نااتفاقی کے چھوٹے بڑے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ اگر پڑوسی بدمزاج اور جھگڑالو ہو تو انسان کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے برے پڑوسی سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تعلیم دی ہے۔ آپ نے فرمایا:

تعوّذوا بالله من شرّ جار المقام۔[1]

اگر پڑوسی شریف، سمجھ دار، معاملہ فہم، دیندار اور مددگار ہو تو انسان کا محلّہ اور ماحول جنت نشاں بن جاتا ہے، اسی طرح جہاں اسلام نے نیک بیوی کو انسان کی خوش قسمتی کی علامت قرار دیا ہے، وہیں اچھے پڑوسی کو خوش بختی کہا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے تین چیزوں کو انسان کی سعادت اور نیک بختی کی علامت بتایا ہے۔ (۱) کشادہ مکان (۲) نیک پڑوسی (۳) قابو کی سواری۔[2]

قرآن پاک کی آیت میں تین قسم کے پڑوسیوں کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے ایک وہ پڑوسی ہے جس سے خونی رشتہ ہے، دوسرا وہ پڑوسی ہے جس سے خونی رشتہ نہیں ہے مگر ہم سایہ ہے، تیسرا وہ پڑوسی ہے جو عارضی اور وقتی طور پر ہم سایہ ہو گیا ہے، جسے ہم نشین کہا جا سکتا ہے یا کام کاج اور سفر کا ساتھی ہے۔ پڑوسی کے لیے ہم سائیگی کافی ہے، اس کے لیے مالک مکان ہونا، ہم مذہب ہونا اور برادری کا ہونا ضروری نہیں۔ اسلام نے ان تمام قسم کے پڑوسیوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم و تلقین کی ہے۔ رسول پاک ﷺ کی متعدد احادیث میں پڑوسیوں کے حقوق کی تفصیل آئی ہے اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک پڑوسی کے دوسرے پڑوسیوں پر

---

[1] مسند احمد ۲/ ۳۴۶ [2] الادب المفرد، باب الجار الصالح

حسب ذیل چھ حقوق ہیں۔

(۱) اول یہ کہ پڑوسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دے، ذہنی، جانی اور مالی نقصان نہ پہونچائے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

واللہ لا یومن واللہ لایومن واللہ لا یومن قیل من یا رسول اللہ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ۔[۱]

اللہ کی قسم وہ مومن نہیں ہے، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، صحابہ نے پوچھا کون یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے محفوظ نہ ہو۔

نبی ﷺ کی مجلس میں ایک شخص نے ایک مسلمان عورت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ نماز بہت پڑھتی ہے، روزہ بہت رکھتی ہے اور صدقہ خیرات بھی بہت کرتی ہے مگر اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہونچاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ھی فی النار" وہ جہنم میں جائے گی۔[۲]

ایک مرتبہ ایک شخص رسول پاک ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، آپؐ نے فرمایا جاؤ اور اپنا سامان گھر سے نکال کر سڑک پر ڈال دو، چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنا سامان سڑک پر ڈال دیا، لوگوں نے اسے دیکھا تو اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی، اس نے سب سے یہی کہا کہ میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے، میں نے رسول اللہؐ کے حکم پر اپنا سامان گھر سے نکال کر باہر کرلیا ہے، یہ سن کر سب لوگ اس پر لعنت بھیجنے لگے، جب اس کے پڑوسی کو معلوم ہوا کہ سب لوگ مجھ پر لعنت بھیج رہے ہیں، تو آکر معذرت کی اور کہا گھر چلو آئندہ کبھی تم کو تکلیف نہیں دوں گا۔[۳]

(۲) پڑوسی کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی عزت وآبرو پر غلط نگاہ نہ ڈالی

۱؎ بخاری، کتاب الأدب، باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ

۲؎ مسند احمد ۲/۴۴۰

۳؎ الأدب المفرد، باب شکایۃ الجار

جائے، پڑوس میں رہنے کی وجہ سے انسان اپنے پڑوسی کے گھریلو حالات اور اہلِ خانہ سے زیادہ واقف ہوتا ہے، قریب ہونے کی وجہ سے ربط ضبط بھی ہوتا ہے، ایسے میں پڑوسی کی بیوی یا بہو، بیٹی پر غلط نظر ڈالنا بہت گھناؤنا جرم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ زنا کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا وہ حرام ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور قیامت تک حرام ہے، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دس عورتوں سے زنا کرنے کا جو گناہ ہے اس سے بڑا گناہ اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنے کا ہے۔[۱]

(۳) پڑوسی کا تیسرا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ اور اچھا سلوک کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیحسن الی جارہ.[۲]

جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

(۴) پڑوسی کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس کی مدد کی جائے، اس کی ضرورت پوری کی جائے اور اسے ہدیہ و تحفہ بھیجا جائے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

لیس المومن الذی یشبع وجارہٗ جائع .[۳]

وہ شخص مومن نہیں جو خود تو آسودہ ہو کر کھائے مگر اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم سالن پکاؤ تو اس میں ذرا سا پانی ملا لو اور اس سے اپنے پڑوسی کی خبر گیری کرو۔[۴]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، سورۃ النساء، آیت ۳۶ ، الادب المفرد، باب حق الجار
[۲] مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار
[۳] بیہقی فی شعب الایمان
[۴] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ

(۵) پڑوسی کا پانچواں حق یہ ہے کہ جب مکان اور جائداد کا کوئی حصہ فروخت کرے تو پہلے اپنے پڑوسی کو پیش کش کرے، اگر وہ نہ لے تب دوسرے خریدار کو دے۔ شریعت نے اس کو ''حق شفعہ'' کا نام دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الجار احق بشفعته ينتظر بها ان كان غائبا اذا كان طريقهما واحد [۱]

پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حق دار ہے جب کہ دونوں کا ایک ہی راستہ ہو، اگر وہ موجود نہیں ہے تو اس کا انتظار کیا جائے۔

(۶) پڑوسی کا چھٹا حق یہ ہے کہ اس کی خیر خواہی کی جائے، اچھی باتوں اور دین کے احکام سے اسے واقف کرایا جائے، ایک جگہ اور ایک ساتھ رہنے کا دینی اور اخلاقی تقاضا ہے کہ پڑوسی کی خیر خواہی کی جائے۔ یوں تو ہر مسلمان سے خیر خواہی کرنا فرض ہے مگر پڑوسی خیر خواہی کا زیادہ حق دار ہے۔

قیامت کے دن ایک شخص اپنے پڑوسی کا دامن پکڑے ہوئے اللہ سے فریاد کرے گا کہ اے اللہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی، پڑوسی کہے گا کہ تیری عزت کی قسم میں نے اس کے مال اور اہل وعیال کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی، پہلا پڑوسی کہے گا یہ تو ٹھیک کہتا ہے مگر اس نے مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھا مگر مجھے روکا نہیں۔ [۲]

شہری زندگی میں جو لوگ اپارٹمنٹ اور فلیٹ وغیرہ میں رہتے ہیں وہ اکثر اپنے پڑوسیوں سے غافل رہتے ہیں، ان کو نہ تو اپنے اوپر والوں کی خبر ہوتی ہے اور نہ اپنے نیچے والوں سے سروکار رہتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں۔ اپنے آپ میں مگن رہنے کو مہذب زندگی سمجھتے ہیں۔ ایک شاعر نے کہا ہے:

---

[۱] ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی الشفعۃ للغائب

[۲] امام احمد بن حنبل، کتاب الصلوۃ وما یلزم لھا، ص ۲۲

گرچہ ہے بہت فاصلہ دونوں کے دلوں میں
دیوار سے دیوار پڑوسی کی ملی ہے

اسلام نے پڑوسیوں سے ملنے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے، ان کی خبر گیری کرنے، ان کا تعاون کرنے اور ان کی خیر خواہی کرنے کو مومن کی پہچان بتا دیا ہے اور مہذب زندگی کی علامت قرار دیا ہے، بلکہ پڑوسیوں کی رائے کو انسان کی نیکی اور بدی کا ایک معیار بتایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ مجھے اپنی اچھائی اور برائی کا علم کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا جب تم سنو کہ تمہارے پڑوسی کہیں کہ تم نے اچھا کام کیا ہے تو سمجھو کہ تم نے اچھا کام کیا ہے اور اگر تمہارے پڑوسی کہیں کہ تم نے برا کام کیا ہے تو سمجھو کہ تم نے برا کام کیا ہے۔[1]

پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے اور ان سے اچھا سلوک کرنے کی اسلام نے جو ہدایت کی ہے اگر ہم مسلمان اس پر عمل کریں تو ہمارا معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ ہو جائے گا اور ہماری سماجی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[1] ابن ماجہ،

معراج کا سفر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ
الکریم اما بعد: قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید.
اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.
سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِہِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہُ لِنُرِیَہُ مِنْ
آیَاتِنَا إِنَّہُ ہُوَ السَّمِیْعُ البَصِیْرُ (بنی اسرائیل،۱)
”پاک ہے وہ خدا جو لے گیا راتوں رات اپنے بندہ کو مسجد حرام سے
مسجد اقصیٰ تک جس کے اردگرد ہم نے برکت نازل کی ہے، تا کہ اسے
ہم اپنی خاص نشانیاں دکھائیں، وہ خدا سننے والا، دیکھنے والا ہے۔“

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا خاص اور اہم واقعہ معراج کا سفر ہے۔ معتبر روایات کے مطابق ۱۱رنبوی میں ۲۷ویں رجب کی شب میں یہ سفر پیش آیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۱رسال سے کچھ زیادہ تھی۔ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اسرا کہا جاتا ہے۔ اور مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے۔ اور اس پورے سفر کو اسرا و معراج سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں معراج کے سفر کا تذکرہ اجمالی طور پر آیا ہے۔ جب کہ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ بیس سے زیادہ صحابہؓ نے سفر معراج کی روایت کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ھانیؓ کے گھر عشا کی نماز پڑھ کر سو رہے تھے۔ جبریل امینؑ تشریف لائے،

آپ ﷺ کو اٹھایا اور مسجد حرام تک لے گئے، وہاں سفید رنگ کا براق تھا، جس کا قد گھوڑے اور خچر کے درمیان تھا۔ رسول پاک ﷺ کو اس پر سوار کرایا اور براق برق رفتاری سے مسجد اقصیٰ (فلسطین) پہونچ گیا۔ جبریل اور میکائل فرشتے آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔

مسجد اقصیٰ پہنچ کر آپ ﷺ نے براق کو ایک پتھر سے باندھ دیا۔ پھر آپ ﷺ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ مسجد اقصیٰ میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام موجود تھے۔ آپؐ نے نماز پڑھائی۔ جبریل امین نے کہا کہ جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں ان سب نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی[۱]۔ مسجد اقصیٰ میں آپ ﷺ کی ضیافت کے لیے دو پیالے پیش کیے گئے، ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی، آپ ﷺ نے دودھ پیا اور شراب چھوڑ دی، جبریل امین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی فطری رہنمائی کی، اگر آپ شراب پی لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی[۲]۔ مسجد اقصیٰ سے آپ فرشتوں کے جلو میں آسمان پر تشریف لے گئے۔ اللہ کے مقرب فرشتوں نے آپ ﷺ کا استقبال کیا۔

جب آپ پہلے آسمان پر پہونچے تو حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا، انھوں نے جواب دیا اور دعا دی۔ حضرت آدمؑ کی دائیں جانب اور بائیں جانب کچھ صورتیں تھیں۔ حضرت آدمؑ جب دائیں جانب کے لوگوں کو دیکھتے تو ہنستے تھے اور بائیں جانب کے لوگوں کو دیکھتے تو روتے تھے۔ جبریل امین نے بتایا کہ دائیں جانب نیک اولاد کی صورتیں ہیں اور اہل جنت ہیں۔ بائیں جانب بری اولاد کی صورتیں ہیں جو اہل دوزخ ہیں۔

دوسرے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے ہوئی۔ تیسرے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت یوسفؑ سے ہوئی۔ چوتھے

---

[۱] عبدالملک ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، دار الفکر، ۲/۴

[۲] بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ اسری بعبدہ

آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ادریسؑ سے ہوئی۔ پانچویں آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ہارونؑ سے ہوئی۔ چھٹے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوئی، ساتویں آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی۔ ان سب سے سلام کا تبادلہ ہوا اور سب نے مرحبا کہا [۱]۔

پھر جبریل امینؑ آپ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے، اس مقام پر رسول پاک ﷺ نے جبریل امین کو اپنی اصلی حالت میں دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے [۲]۔ وہاں آپ ﷺ نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی تخلیق کے عجائبات کا اور اپنی عظیم نشانیوں کا مشاہدہ کرایا۔ قرآن پاک کی سورہ النجم میں اس کا تذکرہ اس طرح آیا ہے:

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى۔ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى ۔ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ۔ فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى۔ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَى مَا يَرَى ۔ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى۔ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى ۔ عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى۔ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ۔ لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى (النجم،۵-۱۸)

''اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ وہ (فرشتہ) سامنے آ کھڑا ہوا جب کہ وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا اور معلق ہو گیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے بندہ کو وحی پہونچائی جو اسے پہونچانی تھی، نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے

۱۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/۴
۲۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، سورۃ النجم

جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس
نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اسے (فرشتہ کو) دیکھا جس کے پاس
ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھایا ہوا تھا جو کچھ کہ
چھایا ہوا تھا۔ نہ تو نگاہ نے دھوکہ کھایا اور نہ حد سے متجاوز ہوئی۔
اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

وہ بڑی بڑی نشانیاں کیا ہیں جن کو دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو معراج کے سفر پر بلایا تھا؟ ان کی کچھ تفصیل احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ سے آپ ﷺ بارگاہ خداوندی میں پہنچے اور جمال الٰہی کا حجاب کبریائی کے پیچھے سے مشاہدہ کیا۔ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو شرف ہم کلامی عطا فرمایا اور آپ ﷺ کی شان بندگی پر قبولیت کی مہر لگاتے ہوئے پچاس وقت کی نمازوں کا تحفہ دیا، جو آپ ﷺ کی امت کے لیے بمنزلہ معراج کے تھا۔

جب آپ ﷺ اپنے رب سے شرف ہم کلامی اور راز و نیاز کے بعد تحفۂ نماز لے کر واپس ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے پوچھا کہ کیا حکم ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پچاس وقت کی نمازوں کا حکم ہوا۔ موسیٰؑ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ کی امت پچاس وقت کی نمازوں کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ حق تعالیٰ سے کم کرنے کی درخواست کیجیے۔ حضور ﷺ واپس گئے اور نمازوں کی تعداد میں تخفیف کی درخواست کی۔ حق تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کیں۔ پھر موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا کہ مزید کمی کی درخواست کیجیے۔ حضور ﷺ واپس تشریف لے گئے اور اللہ رب العزۃ سے تخفیف کی درخواست کی اور ایسا بار بار ہوا یہاں تک کہ ۴۵ نمازیں موقوف ہوئیں اور پانچ وقت کی نمازیں باقی رہ گئیں۔ یہ پانچ وقت کی نمازیں فضیلت اور ثواب میں پچاس وقت کی نمازوں کے برابر قرار پائیں[1]۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ سے نمازوں کا تحفہ لے کر حضور ﷺ مسجد اقصیٰ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، سورۃ بنی اسرائیل، آیت ا

تشریف لائے اور وہاں سے براق پر سوار ہو کر صبح سے پہلے مکہ مکرمہ تشریف لائے۔
ایک شاعر نے کہا ہے:

یہ عروج کس کو نصیب تھا کہ تو اپنے رب سے قریب تھا
ترے انتظار میں رات بھر جو جہاں پہ تھا وہ رکا رہا

معراج کے اس سفر میں جبریل امین نے کچھ اور غیبی چیزوں کا مشاہدہ کرایا، ان میں سے یہ بھی تھا کہ انسانوں کے برے اعمال کا آخرت میں کیا انجام ہوگا، اس کو تمثیلی پیرایہ میں حضور ﷺ کو دکھایا گیا۔ آپ نے ایک قوم کو دیکھا جس کے ناخن تانبے کے تھے وہ لوگ اپنے چہروں اور سینوں کو ان ناخنوں سے نوچتے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا کہ یہ لوگ آدمیوں کا گوشت کھاتے تھے، یعنی دوسروں کی غیبت کرتے تھے۔

آپ ایک اور قوم کے پاس سے گذرے جن کے سر پتھروں سے کچلے جارہے تھے، کچلنے کے بعد سر پھر درست کیے جاتے اور پھر پتھر سے کچلے جاتے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا کہ فرض نماز چھوڑنے والے لوگ ہیں۔ آپ ﷺ کا گذر ایک دوسری قوم پر ہوا۔ وہ لوگ اپنی شرمگاہ چیتھڑوں سے چھپائے ہوئے تھے اور جانور کی طرح کانٹوں کو کھا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مالوں کی زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے۔ آپ ﷺ ایک اور قوم کے پاس سے گذرے۔ ان لوگوں کے پاس پکا ہوا گوشت تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ رسول پاک ﷺ کے سوال کرنے پر جبریل امین نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جن کے پاس اپنی بیویاں ہیں مگر وہ بدکار عورت کے ساتھ رات گذارتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ کا گذر ایسی قوم پر ہوا جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچی سے کاٹے جارہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے بتایا کہ آپ کی امت کے واعظ ہیں جو دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے[1]۔ کچھ

---

[1] محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دار الکتاب، دیوبند، ۱/۲۹۴

لوگ تھے جن کے پیٹ بہت بڑے تھے اور وہ پیاسے اونٹ کی طرح پیٹ کے بل جہنم میں پیش کیے جا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے بتایا کہ یہ لوگ وہ ہیں جو سود کھاتے تھے[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے معراج سے واپس ہو کر صبح کو جب اپنے سفر کا حال لوگوں کو سنایا تو اسے ناممکن سمجھ کر کچھ کمزور ایمان والے مرتد ہو گئے۔ مکہ کے کافروں نے آپ ﷺ کا بہت مذاق اڑایا۔ یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور بولے کیا تم اپنے دوست کی بات سنتے ہو، وہ کہتے ہیں کہ میں راتوں رات مسجد اقصیٰ کی سیر کر آیا! حضرت ابوبکرؓ بولے: ”تم ان کو کیوں جھٹلاتے ہو، اگر انھوں نے کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے، اس سے بڑی تعجب کی بات وہ یہ کہتے ہیں کہ آسمانی فرشتہ میرے پاس خبر لے کر آتا ہے اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں“ پھر حضرت ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کے پاس گئے اور کفار مکہ کی یہ بات چیت سنائی۔ اس پر رسول کریم نے حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کا لقب عطا فرمایا[2]۔

کچھ علماء اور مفسرین معراج کے اس سفر کو جسمانی نہیں بلکہ روحانی سمجھتے ہیں اور اسے خواب قرار دیتے ہیں۔ بعض سلف کا بھی یہی خیال تھا، مگر جمہور علماء اسے معراج جسمانی قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ اگر یہ خواب تھا تو کفار مکہ کو اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی اور کمزور ایمان والے کو مرتد ہونے کی وجہ نہ تھی۔ معراج کا یہ سفر ہم مسلمانوں کو یہ پیغام دیتا ہے۔

حشر میں خلوت سرکار امم تک پہونچا
مرحبا صل علیٰ باغ ارم تک پہونچا
ان کی معراج کہ وہ عرش بریں تک پہونچے
میری معراج کہ میں ان کے قدم تک پہونچا

اللہ ہم سب کو روحانی بلندی عطا کرے۔ (آمین)

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبی، ۱/۱۲
[2] ایضاً ص ۵

عدل وانصاف

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلاَ یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَن لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا للّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (المائدہ۔۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

عدل و انصاف انسان کی بنیادی ضرورت ہے، حکمرانوں کا زیور ہے اور قاضیوں کا جوہر ہے۔ معاشرہ کی سلامتی اور ترقی کا ذریعہ ہے اور اسلام کی تعلیمات کا مرکزی حصہ ہے، انصاف وہ روشنی ہے جس سے کائنات روشن ہے اور ایسی طاقت ہے جو کمزوروں کو طاقت ور بنادیتی ہے، جس فرد یا سماج سے انصاف ختم ہوجائے وہ بہت عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ زوال اور پستی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ہلاک اور برباد ہوجاتا ہے، کیونکہ ظلم ایک ایسی تاریکی ہے جس میں انسان کا وجود اور کردار تاریک ہوجاتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیمۃ واتقو الشحّ

فان الشح اھلک من کان قبلکم حملھم علی ان سفکو دماء ھم و استحلوا محارمھم۔[1]

ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن کا اندھیرا ہے، اور بخل سے بچو کیونکہ بخل نے تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کردیا، ان کو ایک دوسرے کا خون بہانے اور ان کے محارم کو حلال کرنے پر آمادہ کیا۔

ایک حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کہتا ہے:

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلتہ منکم حرام فلا تظالموا۔[2]

میرے بندو، میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کرلیا ہے اور تمہارے لیے بھی آپس میں ظلم کرنا حرام کردیا ہے اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

عدل کا مطلب یہ ہے کہ مستحق کو اس کا حق دیا جائے اور ظلم یہ ہے کہ حق دار کو اس کے حق سے محروم کردیا جائے، اس میں کمی یا اس پر زیادتی کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو عدل و انصاف پر قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی انصاف کو قائم کرنے والے بنیں۔ ظلم و زیادتی کرکے کائنات کے توازن میں خلل نہ ڈالیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لاَ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لاَ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم. (آل عمران-۱۸)

اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے، اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب تحریم الظلم۔ ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب فی الشح

[2] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب تحریم الظلم

جب انسان انصاف قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل وقسط کو نافذ کرتا ہے، ایسے شخص کا مرتبہ ومقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نور کا منبر عطا کرتا ہے اور اس کی شخصیت کو ممتاز اور نمایاں کرتا ہے۔ چنانچہ نبی علیہ ﷺ فرماتے ہیں:

المقسطون علی منابر من نور الذین یعدلون فی حکمھم واھلھم وما ولوا۔[1]

انصاف کرنے والے نور کے منبر پر سرفراز ہوں گے وہ لوگ جب سربراہ ہوتے ہیں تو اپنے حکم اور اہل میں انصاف سے کام لیتے ہیں۔

انصاف پسند حکمراں کے لیے حضور پاک فرماتے ہیں: جن سات لوگوں کو قیامت کے دن عرش الٰہی کے سایہ میں خصوصی طور پر جگہ عطا کی جائے گی ان میں ایک امام عادل ہے۔[2] جو شخص فیصلہ کرنے کے منصب پر فائز ہو، خواہ حاکم ہو یا قاضی ہو یا پنچ ہو یا ثالث ہو اس پر پہلی ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ وہ فریقین میں سے کسی کی جانب داری یا طرف داری نہ کرے بلکہ پورے انصاف سے کام لے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ (النساء-۵۸)

مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو اللہ تم کو عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

انسان انصاف سے گریز یا تو کسی لالچ، رشوت اور نفع کی امید میں کرتا ہے یا بڑے حاکم اور بادشاہ کے خلاف انصاف کرنا پڑتا ہے، یا اس کے انصاف کی زد اس کی

---

[1] مسلم، کتاب الامارۃ

[2] مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ

اپنی ذات یا قریبی رشتہ داروں پر پڑتی ہے، یا انصاف کسی دشمن سے کرنا ہوتا ہے۔ ان حالتوں میں انسان کا قدم انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور وہ نا انصافی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر حالت میں انصاف کریں۔ خواہشات نفس کی وجہ سے انصاف سے گریز نہ کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ. (ص،۲۶)

اے داؤد، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔

اپنی ذات اور اپنے والدین اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف بھی انصاف کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا. (النساء-۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگر چہ تمہارے انصاف اور گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی

ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ-۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یوں تو پوری اسلامی تاریخ عدل و انصاف کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ جس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی، لیکن اسلام کا قرن اول یعنی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا عہد تو عدل و انصاف کا زرّیں زمانہ ہے جس کا اعتراف مسلمانوں کے دشمنوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ صرف دو نمونے ملاحظہ کیجیے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے چوری کی، رسول پاک ﷺ نے شرعی قانون کے مطابق اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ سنادیا، عورت قریش کے اونچے خاندان بنی مخزوم کی تھی، قریش کے لوگوں نے خاندان کی رسوائی کے خوف سے نبی ﷺ کے پاس حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لیے بھیجا، کیونکہ حضور حضرت اسامہؓ اور حضرت زیدؓ دونوں باپ بیٹے کو بہت عزیز رکھتے تھے، انھوں نے عورت کی سزا معاف کرنے کی حضور سے سفارش کی، حضور اس پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہود اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ جب کوئی طاقت ور جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور جرم کرتا تو اسے سزا دیتے۔ اللہ کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔[1]

حضرت عمرؓ نے شریح بن حارث کو اسلامی حکومت کا قاضی مقرر کیا تھا، قاضی شریح حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی تینوں خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں

---

[1] مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف وغیرہ

قاضی رہے۔ ایک مرتبہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ کہیں گر پڑی، ایک یہودی نے اسے اٹھالیا، امیر المومنین کو جب پتہ چلا کہ ان کی زرہ فلاں یہودی کے پاس ہے تو انھوں نے زرہ کا مطالبہ کیا مگر یہودی نے زرہ دینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہ میری ہے، امیر المومنین نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ رکھا، قاضی کے سامنے یہودی نے کہا کہ زرہ میری ہے اور ثبوت یہ ہے کہ میرے قبضہ میں ہے، قاضی شریح نے امیر المومنین سے اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش کرنے کو کہا، امیر المومنین نے اپنے بیٹے حضرت حسنؓ اور اپنے غلام حضرت قنبرؓ کو پیش کیا، قاضی صاحب نے غلام کی شہادت قبول کر لی مگر حضرت حسنؓ کی گواہی کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قابل قبول نہیں ۔ دوسرا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے مقدمہ خارج ہو گیا اور حضرت علی نے اسے قبول کر لیا۔ یہودی نے دیکھا کہ حضرت علیؓ نے خلیفہ ہونے کے باوجود زرہ نہیں چھینی بلکہ عدالت میں مقدمہ دائر کیا اور قاضی نے اپنے خلیفہ کے خلاف اور ایک دشمن کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ لوگ یقیناً سچے دین کے پیرو کار ہیں، چنانچہ انھوں نے اعلان کیا کہ بے شک یہ زرہ حضرت علی کی ہے اور یہ دین سچا ہے اس پر میں ایمان لاتا ہوں اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔

آج اگر مسلمان عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں اور زندگی کے ہر معاملہ میں انصاف کا ثبوت دیں اپنے، پرائے، دوست، دشمن سب کو انصاف فراہم کریں تو اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی عظمت کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا، اللہ ہم سب کو انصاف پر چلنے کی توفیق دے۔ (آمین)

شب براءت کی رسمیں

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (الانعام-۱۵۳)

ان کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو وہ اس کے راستہ سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کردے گا۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

پندرہویں شعبان المعظم کی رات یعنی شب براءت کو منانے کا اہتمام پورے برصغیر میں ہوتا ہے، ہندو پاک اور بنگلہ دیش سے زیادہ ایران میں ہوتا ہے، مسلمانوں کے دونوں گروہ یعنی شیعہ اور سنی اس رات کا اہتمام کرتے ہیں، شیعہ حضرات اس رات کا اہتمام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بارہویں امام حضرت مہدی علیہ السلام کی شب پیدائش ہے، اس لیے وہ اس شب میں چراغاں کرنے، مکانوں اور قبرستانوں کو روشن کرنے کا اہتمام اس حد تک کرتے ہیں کہ گویا یہ عید کی شب ہو۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس شب کے اہتمام کی وجہ وہ روایات ہیں جو بعض کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے نقل کی گئی ہیں جن میں اس شب میں عبادت کرنے، نوافل و تلاوت کا اہتمام کرنے، مردوں کے لیے دعائے مغفرت

کرنے اور دن میں روزہ رکھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

شب براءت کی فضیلت کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے، قرآن پاک میں شب قدر کی فضیلت کا تذکرہ متعدد سورتوں میں آیا ہے، مگر پندرہویں شعبان کے بارے میں کوئی حکم نہیں ہے، اور نہ شیخین یعنی امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی مشہور کتابوں میں پندرہویں شعبان کی شب کی فضیلت کے سلسلہ میں کوئی روایت بیان کی ہے، جو روایتیں اس سلسلہ میں ملتی ہیں وہ ترمذی، بیہقی، ابن ماجہ، مسند احمد، معجم طبرانی اور ابن حبان وغیرہ میں ملتی ہیں، مگر وہ ضعیف ہیں اور درجہ صحت کو نہیں پہنچتیں۔ مثلاً شب براءت کی فضیلت کے سلسلہ میں عام طور پر یہ حدیث ہمارے سامنے آتی ہے:

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ پندرہویں شعبان کی شب میں میں نے رسول اللہ ﷺ کو بستر پر نہیں پایا تو میں آپ کی تلاش میں نکلی، آپ جنت البقیع میں تھے۔ آپ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: ”کیا تمہیں اندیشہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر زیادتی کریں گے؟ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میں نے سوچا کہ آپ بعض ازواج کے پاس تشریف لے گئے ہوں گے، تب آنجناب نے فرمایا:

”ان اللـه تبارک وتعالیٰ ینزل لیلة النصف من شعبان الی السماء الدنیا فیغفر لاکثر من عدد شعر غنم کلب“[1]

اللہ تبارک وتعالیٰ نصف شعبان کی شب کو آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور قبیلہ بنی کلب کی بھیڑوں کے بال سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت کرتے ہیں۔

امام ترمذی نے اس روایت کو بیان کرنے کے ساتھ ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس طرح مکحول کثیر بن مرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”

”فی لیلة النصف من شعبان یغفر اللہ عز وجل لاهل

---

[1] ترمذی، باب ماجاء فی لیلة النصف من شعبان

الارض الا لمشرک او مشاحن"۱

نصف شعبان کی شب کو اللہ تعالیٰ اہل زمین کی مغفرت کرتا ہے سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔

اسی مفہوم کی روایت طبرانی، مسند احمد اور ابن حبان وغیرہ میں بھی آئی ہے، ان تمام احادیث کو محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے، ضعیف روایات سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا البتہ ثابت شدہ حکم کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں، اسی لیے محدثین کی ایک بڑی جماعت پندرہویں شعبان کے شب کی فضیلت کو معتبر تسلیم نہیں کرتی اور اس شب گذاری کو سنت سے ثابت نہیں مانتی، کیونکہ کوئی صحیح حدیث اس شب کی فضیلت میں نہیں ملتی۔ البتہ محدثین کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو اس بات کی قائل ہے کہ گو کہ صحیح احادیث پندرہویں شعبان کی شب کی فضیلت میں نہیں ملتیں مگر جو احادیث ملتی ہیں وہ متعدد طریقوں سے ملتی ہیں جن سے ان احادیث کا ضعف کم ہو جاتا ہے، اس لیے شب براءت کی فی الجملہ اہمیت ہے اور اس رات میں عبادت کرنا، تلاوت کرنا اور مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا ثواب اور تقرب سے خالی نہیں۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے:

"اکثر اہل علم اور ہمارے اصحاب کی اکثریت شب براءت کی فضیلت کی قائل ہے، امام احمد بن حنبل کا منصوص مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس باب میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں اور سلف کے آثار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس کی بعض فضیلتوں کا ذکر مسانید اور سنن میں آیا ہے"۲

ہندوستان کے ایک مشہور محدث مولانا عبدالرحمان مبارک پوری نے بھی ان احادیث کو حجت تسلیم کیا ہے۔۳

---

۱ بیہقی فی شعب الایمان

۲ اقتضاء صراط المستقیم ص ۳۰۲ مصر ۱۹۵۰ء

۳ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان

شب براءت کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ دونوں نقطہ ہائے نظر ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور رہیں گے۔ عام لوگوں کو یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جن احادیث میں شب براءت کی فضیلت کا تذکرہ ہے، وہ سب اس رات کو عبادت اور اللہ کی اطاعت کی رات قرار دیتی ہیں۔ انسان نوافل اور تہجد کا اہتمام کرے، تلاوت اور ذکر کرے، مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرے، یعنی جس طرح رمضان المبارک میں شب قدر کا اہتمام ہوتا ہے اسی طرح اس رات میں عبادت کا اہتمام کیا جائے۔ مگر پندرہویں شعبان کو چراغاں کرنا، پٹاخے چھوڑنا، حلوہ پکانا، جشن منانا کسی کمزور سے کمزور روایت سے بھی ثابت نہیں ہے۔

آگ روشن کرنا اور آتش بازی کرنا مجوسیوں اور مشرکوں کی تہذیب ہے، اسلام کی نہیں۔ مسلمانوں نے مجوسیوں اور مشرکوں کی روایت کو اپنے معاشرہ میں داخل کرلیا ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ مجوسی بھی آگ کی پوجا کرتے ہیں اور ہندو بھی آگ کی پوجا کرتے ہیں، شب براءت کے موقع پر مسلمانوں میں آتش بازی کی رسم عباسی حکومت کے برمکی وزیروں سے شروع ہوئی، برمکی لوگ عباسی حکومت میں وزیر اور امیر ہوا کرتے تھے، وہ پہلے مجوسی تھے، انھوں نے مجوسی اثرات کے تحت آتش بازی کی رسم مسلمانوں میں داخل کی اور ان کے ذریعہ ہندوستان میں پھیل گئی، یہاں تک کہ بعض مسلمان حکمراں بھی پندرہویں شعبان کو آتش بازی کرتے تھے اور اس کے لیے باروودں کا ڈھیر جمع کرتے تھے۔

ہندوستان میں مشرک لوگ دیپاولی اور شیوراتری کے موقع پر چراغاں کرتے ہیں اور آتش بازی کرتے ہیں، ہندوؤں کے ساتھ رہنے اور ان کا طرز عمل دیکھنے کی وجہ سے بھی مسلمانوں نے آتش بازی کی رسم اختیار کرلی، نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ آپ پندرہویں شعبان کو مسلم محلوں اور علاقوں میں چراغاں اس قدر ہوتا ہے اور اتنی کثرت سے آتش بازی ہوتی ہے، پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت، تلاوت اور دعاء مغفرت کی رات نہیں بلکہ شیوراتری اور دیپاولی کی

رات ہے۔رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد ﷺ وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ۔[۱]

بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور بدترین چیز دین میں نیا طریقہ ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"

یہ جشن چراغاں اور آتش بازی دین میں نئی راہ ہے اور یہی بدعت ہے جو گمراہی کا سبب ہے، اس سے پرہیز کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا کر دیا ہے وہ مکمل ہے، اس میں کسی طرح کی کمی اور بیشی نہیں کی جا سکتی، اس کامل دین کو انسان چھوڑے گا تو مختلف راستوں میں بھٹکے گا، کوئی ایسی راہ نکالنا، کوئی ایسی رسم ایجاد کرنا جو سنت کے خلاف ہو ہرگز گوارا نہیں، ایسے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے:

"من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذلک من اجورھم شیئا ، ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل اثام من تبعہ لا ینقص ذلک من اثامھم شیئا "[۲]

جس نے ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو ہدایت قبول کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور ان لوگوں کے اجر میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی اور جس نے کسی گمراہی کی طرف بلایا اس پر ان تمام لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس میں شریک ہوں گے اور ان کا گناہ ذرا بھی کم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آتش بازی دین اسلام اور مسلم امت کے مزاج کے خلاف ہے اور سماجی

---

۱ مسلم، کتاب الجمعہ

۲ مسلم، کتاب العلم، باب من سن سنۃ حسنۃ

فتنہ وفساد اور نقصان کا بھی ذریعہ ہے، ہندوستان کے بعض شہروں میں ہندو مسلم فساد آتش بازی کی وجہ سے ہوئے ہیں، کسی نے پٹاخہ چھوڑا وہ کسی کے گھر جا گرا، کہیں آگ لگ گئی، کوئی شخص زخمی ہو گیا اور ایک فساد بھڑک اٹھا، جو چیز دین و دنیا دونوں کے لیے نقصان دہ ہو اسے ضرور ترک کر دینا چاہیے۔ آتش بازی کا شوق بڑوں سے زیادہ بچوں میں ہوتا ہے، بچے ناسمجھ اور احکام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ بڑوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اور اپنے محلوں کے بچوں کو سمجھائیں، ان کو آتش بازی سے روکیں اور بتائیں کہ یہ مجوسیوں اور مشرکوں کی رسم ہے۔ بہت سے دوکاندار پٹاخے اور آتش بازی کا سامان اس موقع پر لے آتے ہیں اور دوکان سجا کر بیچتے ہیں، ان کو بھی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ یہ گناہ کا کاروبار ہے، اس سے دوکانداری اور روزی میں برکت نہیں ہوگی۔ اگر بڑے اور سنجیدہ لوگ اس بری رسم کو مٹانے کی کوشش کریں گے تو اس کا انشاء اللہ اثر ہوگا اور آتش بازی کم بلکہ ختم ہو جائے گی۔ جہاں جہاں مسلمانوں نے اس کی کوشش کی ہے وہاں یہ رسم کم ہو گئی ہے۔

اسی طرح پندرہویں شعبان میں حلوہ کھانے کی رسم چل پڑی ہے، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ رسول پاک ﷺ کے دانت مبارک جنگ احد میں شہید ہوئے تو حضرت اویس قرنی نے یہ سن اپنے دانت توڑ لیے اور دانت نہ ہونے کے باعث حلوہ کھایا، شعبان کا حلوہ اسی کی یادگار ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ کہ جنگ احد شعبان کے مہینہ میں نہیں ہوئی، دوم یہ کہ اگر حضرت اویس قرنی نے اپنے دانت توڑ لیے تو حلوہ کی رسم اختیار کرنے والے اپنے دانت کیوں نہیں توڑتے؟ کسی بھی رسم کے لیے کوئی بھی تاویل کی جائے غلط تو بہر حال غلط ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام رسموں کا دین نہیں ہے، ایسی رسمیں نہ اپنائی جائیں جن سے اسلام کا تقدس ختم ہو اور اس کی تصویر بگڑ جائے، بلکہ قرآن وسنت پر کاربند رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بری رسموں سے دور رہنے اور صحیح اسلام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

منافقت سے پرہیز

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَلَھُمْ
نَصِیْراً. اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ
وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُوْلٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَسَوْفَ
یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْماً (النساء . ۴۶-۱۴۵)

یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے، البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خاص کر دیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

نفق عربی زبان میں سرنگ کو کہتے ہیں جس میں ایک طرف سے کوئی داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے، منافق بھی اسلام میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے اسی لیے وہ منافق کہلاتا ہے۔

ہر دور میں اسلام کو کفر و شرک سے زیادہ خطرہ نفاق سے رہا ہے، کفر و شرک اگر اپنی اصلی شکل میں آئے تو اس کا پہچاننا آسان اور اسکا مقابلہ بھی آسان ہے، لیکن اگر کفر و شرک اپنا اصلی چہرہ چھپا لے اور نقلی چہرہ لگا لے، اسلام کے لبادہ میں آ جائے، دشمنی کا اظہار کرنے کے بجائے دوستی کا سوانگ رچ لے تو اس کی پہچان مشکل اور مقابلہ بھی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ مشکل ہر زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہی ہے، ان کی صفوں میں ایسے لوگ داخل ہوتے رہے ہیں جو زبان سے اسلام کا اظہار کرتے

تھے مگر اندر سے مومن نہیں منافق تھے، وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے کافروں سے زیادہ مضر اور خطرناک ثابت ہوئے۔

اگر آپ ابتداء اسلام کے منافقوں کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نازل کردہ آیات کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت منافقوں کی بہت سی قسمیں تھیں اور بہت سے گروہ اسلام کے خلاف سرگرم تھے۔ان میں دو قسم کے منافقین کا تذکرہ قرآن بار بار کرتا ہے۔

ایک قسم منافقوں کی وہ تھی جو اسلام کے کٹر دشمن اور مخالف تھے، وہ اسلام کی جڑ کاٹنے پر تلے ہوئے تھے، انہوں نے اسلام کو مٹانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ بظاہر اسلام کا اظہار کر کے مسلمانوں کے درمیان رہیں اور اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہیں۔ان منافقوں کے بارے میں قرآن پاک کی بہت سی آیات نازل ہوئیں، منجملہ ان میں وہ آیات ہیں جن کی ابھی تلاوت کی گئی ہے، اس کے علاوہ پوری ایک سورہ ''المنافقون'' کے نام سے نازل ہوئی جو ۲۸ ویں پارہ میں ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَo اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَo (المنافقون . ۲-۱)

اے نبیؐ جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں'' ۔ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

یہ منافقین اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ، قرآن اور اسلامی عقائد کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرتے ، رسول اللہ ﷺ اور ان کے اہل بیت کے خلاف

جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے ، اسلامی شعائر اور احکام کا مزاق اڑاتے ، اسلامی منصوبوں اور پیغمبر اسلام کی سرگرمیوں کی جاسوسی کرتے ،مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے اور ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ،مسلمانوں کی مسجدوں سے ہٹ کر الگ مسجد ضرار بناتے ،دشمنان اسلام کو پناہ دیتے ،اس طرح کے منافقین ، یہود و نصاریٰ اور کفار تینوں طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ،انہی کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ . يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ . فِي قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ. (البقرہ. ۸-۱۰)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں ،حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کررہے ہیں۔ مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ ان کی سازشوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَاراً وَّكُفْراً وَّتَفْرِيْقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (التوبہ. ۱۰۷)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اُس شخص

کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول
کے خلاف برسر پیکار ہو چکا ہے، وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں
گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا، مگر اللہ
گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔

اس طرح کے منافقین صرف حضور پاکؐ کے زمانہ میں نہیں تھے بلکہ ہر زمانہ میں رہے ہیں اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق آخری زمانہ میں بھی رہیں گے، ایسے خطرناک منصوبہ کے ساتھ اور ایسی معصوم شکل وصورت میں ملیں گے کہ صرف مومنانہ فراست ہی ان کو پہچان سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تمہارے درمیان ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کی نمازوں کو
دیکھ کر تم اپنی نمازوں کو حقیر سمجھنے لگو گے، ان کے روزوں کو دیکھ کر
تم اپنے روزوں کو حقیر سمجھنے لگو گے، ان کے عمل کو دیکھ کر تم اپنے
عمل کو حقیر سمجھنے لگو گے، وہ قرآن کی تلاوت کریں گے مگر قرآن
ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ اسلام سے اس طرح نکل
چکے ہوں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے'' [1]

دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو مفاد پرستی کی وجہ سے اسلام میں داخل ہوئے تھے ان کا منصوبہ اسلام کو مٹانے کا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے ردِّعمل سے محفوظ رہنا اور اسلام کے نام پر مالی اور سماجی فوائد حاصل کرنا تھا، قرآن پاک میں ایسے منافقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَا اُوْذِىَ فِى اللّٰهِ جَعَلَ
فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ
اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِىْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ
وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (العنکبوت۔۱۱-۱۰)

---

[1] بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب اثم من رای بقراءۃ القرآن

لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر،
مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی
ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے
رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو
تمہارے ساتھ تھے۔ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی
معلوم نہیں ہے؟ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے
والے کون ہیں اور منافق کون۔

یہ دوسرے درجہ کے منافقین اگرچہ اتنے خطرناک تو نہ تھے مگر تھے منافق کیونکہ اسلام پر ان کو یقین نہ تھا اور نہ مسلمانوں سے ان کو محبت تھی، بس مفاد پرستی تھی جو ان کو اسلام کا دم بھرنے پر مجبور کرتی تھی، اس طرح کے منافقین آج بھی ہیں اور ہر زمانہ میں رہیں گے۔

نفاق کی دونوں قسمیں عقیدہ اور ایمان سے تعلق رکھتی ہیں، ایسے منافقوں کو پہچاننا اور ان سے امت کو محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان سے سختی سے نمٹنے کا حکم دیا تھا، اور ان کو کفار کے زمرہ میں شامل کیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التحریم . ۹)

اے نبیؐ، کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے
پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

نفاق عقیدہ کے علاوہ ایک نفاق عمل بھی ہے، انسان فکر و عقیدہ کی سطح پر اسلام قبول کرتا ہے مگر اس کے اعمال ایسے ہوتے ہیں جو ایمان اور عقیدہ کے منافی ہوتے ہیں، ایسا شخص اسلام کا دل سے انکار نہیں کرتا مگر عمل سے اظہار بھی نہیں کرتا۔

اس عملی نفاق کی بہت سی علامتیں ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ منافق کی چار علامتیں ہیں (۱) جب بولے تو جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (۳) جب بحث کرے تو گالی گلوج پر اتر آئے (۴) اور جب اس

کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔[1]

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم لوگ جب اپنے حاکم کے پاس جاتے ہیں تو اس کی پسند کی بات کرتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو اس کے خلاف بات کرتے ہیں، یہ سن کر حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا:

"کنا نعد هذا نفاقا علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم"[2]

ہم اسے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں نفاق میں شمار کرتے تھے

عملی نفاق کی اور بھی بہت سی علامتیں ہیں مثلاً نمازوں سے غفلت برتنا، مسلمانوں سے کنارہ کشی کرنا، انفاق اور جہاد سے جی چرانا، چرب زبانی اور ملمع سازی سے کام لینا، موقع پرستی کرنا، ضرورت کے وقت حق کا ساتھ نہ دینا، بھلائی کے کاموں سے کھسک جانا، قول و عمل میں تضاد ہونا، دورخی پالیسی اختیار کرنا وغیرہ۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب تو برائیاں ہیں نفاق کس طرح ہو سکتی ہیں؟ نفاق اور گناہ میں فرق اتنا ہے کہ گناہ گار گناہ کرتا ہے تو شرمسار ہوتا ہے اور احساس جرم میں مبتلا رہتا ہے جب کہ نفاق کا مرتکب گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا بلکہ ڈھٹائی سے کام لیتا ہے، گناہ گار گناہ سے توبہ کرتا ہے اور نفاق عمل کا مرتکب تاویل کرتا ہے اور اسے حق بجانب ٹھہراتا ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ جس طرح نفاق عقیدہ سے دور تھے اسی طرح نفاق عمل سے بھی دور تھے، بلکہ وہ ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے اور محاسبہ کرتے کہ کہیں نفاق کا کوئی شائبہ ان کے اندر داخل تو نہیں ہو گیا۔

ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کرام کو پایا وہ سب اپنے بارے میں نفاق سے خائف رہتے تھے۔[3] اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب علامۃ المنافق

[2] ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب کف اللسان عن الفتنۃ

[3] بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المومن من ان یحبط عملہٗ

بدگمانی، بہتان اورغیبت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ
الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا
اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات – ۱۲)

اے لوگو جوایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسّس نہ کرو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جواپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو،تم خوداس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو بدگمانی، تجسّس بہتان اورغیبت کرنے سے منع کیا ہے یہ چیزیں اسلامی اخلاق کے منافی ہیں، انسانی معاشرہ میں زہر گھولنے والی اور برادرانہ تعلقات کوختم کرنے والی ہیں ۔ایک مومن کودوسرے مومن کے سلسلہ میں اچھا گمان رکھنا چاہیے ۔ اگرکسی مومن کے بارے میں کوئی بری بات سنے تو فورا تسلیم نہ کرلے اور نہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اس میں یہ برائی ضرور ہوگی جبھی تو اسے برا کہا جارہاہے۔ بلکہ اسکی تردید کرے کم ازکم تائید نہ کرے،حضرت عائشہؓ پر جب منافقوں نے الزام لگایا تھاتو بعض سادہ لوح مسلمان بھی منافقوں کی افواہ کوسچ سمجھ کر غلط فہمی

میں مبتلا ہوگئے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کی پاکیزگی کا اعلان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی:

وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَايَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ . يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ . (النور. ۱۷-۱۶)

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا تھا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔

یعنی کسی بھی مومن مرد وعورت کے بارے میں جب کوئی افواہ پھیلائی جائے تو دوسرے مومن کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کی تردید کرے اور کہے کہ یہ سچ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر یقین سے معلوم ہوجائے کہ وہ شخص اس حسن ظن کا مستحق نہیں ہے تو ضرور وہ رائے قائم کی جائے جو حقیقت پر مبنی ہے، لیکن یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ بلا کسی ثبوت کے کسی مومن کے متعلق پہلے سے ایک غلط رائے قائم کرلی جائے، اس کی بری تصویر اپنے ذہن میں بنالی جائے۔ اوراس کے مطابق فیصلہ صادر کیا جائے، بلکہ اگر کسی مومن کے کسی عمل کا اچھا اور برا دونوں پہلو ہو تو ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اسے اچھے پہلو پر محمول کیا جائے۔

بدگمانی کے خاندان کی ایک اور برائی تجسس ہے، یعنی دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہنا، دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہنا، اور لوگوں کی کمزوریوں کا پتہ لگانا، یہ صحت مند اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے اور بیمار ذہنیت کی علامت ہے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تجسس سے سختی سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے:

یامعشر من آمن بلسانہٖ ولم یدخل الایمان قلبہٗ لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتھم فانہ من اتبع عوراتھم یتبع

اللہ عورتۂ ومن یتبع اللہ عورتۂ یفضحۂ فی بیتہ۔[۱]

اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان کا دعوی کرتے ہو مگر دل میں ایمان نہیں اترا ہے، مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اوران کے عیوب کی کھوج نہ لگایا کرو، جو شخص مسلمانوں کی پوشیدہ باتوں کی کھوج لگائے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی کھوج لگائے گا اور جس کے عیوب کی کھوج اللہ کرے گا اسے اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔

بہتان کا مطلب یہ ہے کسی شخص کی طرف وہ برائی منسوب کر دی جائے جو اس کے اندر موجود نہ ہو، ایسا کرنا گناہ عظیم ہے، یہ کردار کشی ہے جو ایک غیرت مند مسلمان کے لیے مردم کشی سے زیادہ سنگین ہے، انسان کسی دوسرے پر بہتان اس لیے لگاتا ہے کہ وہ بے عزت اور بے آبرو ہو، لوگوں کی نظر میں ذلیل اور رسوا ہو، معاشرہ میں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے، ایک مسلمان کی توہین وتذلیل اور اسے رسوا کرنے کا یہ جذبہ انسانیت سے بھی گرا ہوا ہے اور اللہ کی نظر میں بھی اس کا انجام بہت برا ہے، اگر کسی نے کسی کی پاکدامنی پر بہتان لگایا تو اس کی سزا اسّی۸۰ کوڑے مقرر کی گئی ہے، اگر کسی کے اخلاق وکردار پر دوسری قسم کا بہتان لگایا گیا تو اسے حق ہے کہ ہتک عزتی کا مقدمہ دائر کرے اور بہتان تراشی کرنے والے کو سزا دلوائے۔

اگر کسی مسلمان پر بہتان تراشی کی جارہی ہو تو دوسرے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خاموش اور لاتعلق نہ رہیں بلکہ اس کو تسلیم نہ کریں، اس کا دفاع کریں اور ایسا ماحول نہ بننے دیں جس میں کسی مسلمان کی عزت وآبرو باقی نہ رہے، جو شخص جب چاہے اور جس پر چاہے، کیچڑ اچھالے، کردار کشی کرے، اسلام اس ماحول کو بدلنے کا حکم دیتا ہے، رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں ''اگر کوئی شخص کسی مسلمانوں کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جارہی ہو، اور اس کی عزت وناموس پر حملہ کیا جارہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرے گا جہاں اس کو اللہ کی مدد کی ضرورت ہوگی، اور جو شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ

جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جارہا ہو اور اس کی توہین ہو رہی ہو تو اللہ عزوجل ایسے مواقع پر اس کی مدد کرے گا جہاں اسے اللہ کی مدد کی ضرورت ہوگی''۔ [1]

بہتان تراشی کے قبیل کی قابل مذمت برائی غیبت ہے، یعنی کسی شخص کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا، اس کے عیوب ظاہر کرنا کہ اگر اس شخص کو معلوم ہو جائے تو اسے ناگوار گذرے۔

بہتان اور غیبت میں فرق یہ ہے کہ کسی کی طرف ایسا عیب منسوب کرنا جو اس میں نہ ہو یہ بہتان ہے اور اگر وہ عیب ہو تو اس کو بیان کرنا غیبت ہے، ایک شخص نے جناب رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

ذكرك اخاك بمايكره قال ارئيت ان كان فيه ما اقول قال ان كان فيه ماتقول فقد اغتبته وان لم يكن فيه ماتقول فقد بهتّه. [2]

تم کسی بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو کہ اگر وہ سنے تو اسے ناگوار ہو، سائل نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اس میں وہ عیب ہو جو میں کہتا ہوں؟ آپ نے فرمایا اگر تیری بات سچ ہے تب تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ عیب نہیں تو تو نے بہتان لگایا۔

اگر کسی میں کوئی عیب یا برائی ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص سے تنہائی میں مل کر اس کو متنبہ کیجیے، نہ تو عوام میں اسے ٹوک کر رسوا کیجیے، اور نہ اس کے پیچھے اس کی برائی بیان کر کے اس کی غیبت کیجیے، غیبت کرنے والا مخلص نہیں مفسد ہوتا ہے، وہ دوسروں کی برائی بیان کر کے ایک طرح کی لذت حاصل کرتا ہے، ایسی لذت جو مردار انسان کے گوشت کھانے سے بھی بری ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے غیبت کرنے کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

ایک تو ہے مردار کا کھانا، اور دوسرا ہے مردہ انسان کا گوشت کھانا، کوئی

---

[1] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب من ردعن مسلم غیبۃ

[2] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی الغیبۃ

انسان مردار خوری کو گوارا نہیں کرسکتا۔ پھر غیبت کو کیسے گوارا کرلیتا ہے، مردار کھانے والا مردہ گوشت کھاتا ہے، غیبت کرنے والا عزت اور نیک نامی کو کھاتا ہے۔ دونوں میں صورت کا فرق ہے، نتیجہ اور انجام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے گریز کرنا مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے راستہ میں ایک شخص کو اپنے ساتھی سے حضرت ماعز اسلمیؓ جن کو رجم کی سزا دی گئی تھی کے متعلق یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس شخص کو دیکھو اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ وہ کتے کی موت نہ مارا گیا۔ حضورؐ یہ سن کر آگے بڑھ گئے، راستہ میں ایک گدھا مرا پڑا تھا جس کی لاش سڑگل رہی تھی حضور رک گئے اور ان دونوں کو بلایا اور فرمایا اس گدھے کا گوشت کھاؤ، ان دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسے کون کھانا پسند کرے گا، تب رسول پاکؐ نے فرمایا:

"فما نلتما من عرض اخیکما انفا اشد من اکل منهٗ"[۱] ابھی تم لوگوں نے جو اپنے بھائی کی عزت پر حرف زنی کی ہے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے زیادہ بری ہے۔

رسول پاکؐ نے اس موقع پر ان دونوں حضرات کو جو تنبیہ فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں غیبت کرنے کا ماحول ختم ہوگیا، لوگ ایک دوسرے کا نام عزت و احترام سے لیتے اور پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرتے۔ موجودہ مسلم معاشرہ کی اخلاقی پستی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ہماری مجلسیں غیبت سے بھری ہوتی ہیں۔ لوگ اپنے کام سے کام رکھنے کے بجائے دوسروں کے عیوب بیان کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی مجلس سے اٹھ کر جانے والے کی غیبت دیر تک بیٹھے ہوئے لوگ کرتے ہیں، غیبت کرنے والے اور غیبت سننے والے دونوں لذت حاصل کرتے ہیں۔ جب کہ غیبت سننے والا بھی غیبت کرنے والے کے گناہ میں برابر کا شریک رہتا ہے۔

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک

اگر کسی نے کسی مردہ انسان کی غیبت کی ہے تو غیبت کرنے والے کو توبہ کرنی چاہیے اور اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرنی چاہیے۔ اور اگر زندہ انسان کی غیبت کی ہے تب بھی توبہ کرنی چاہیے اور اپنے بھائی سے معذرت کرنی چاہیے۔

اگر کسی شخص سے کسی دوسرے کے بارے میں رشتہ کرنے کے سلسلہ میں رائے لی جائے اور وہ اس کا عیب جانتا ہو اور ظاہر نہ کرے تو یہ خیانت ہے اور بیان کردے تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ شرعی ضرورت ہے۔

اسی طرح کوئی شخص ظلم و زیادتی کرتا ہو اس کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی کو اس کی زیادتی کی خبر دے تو یہ بھی غیبت نہیں ہے۔ کسی سے کوئی لین دین کرنا ہو اور اس کے بارے میں کسی سے دریافت کرے تو اس کی بیان کردہ بات بھی غیبت نہیں ہے، اس طرح کسی سے اپنا حق لینے کے لیے کسی اور شخص کے سامنے اس کی برائی کرے جو اس کا حق دلا سکتا ہو تو یہ بھی غیبت نہیں۔ اسی طرح قاضی وقت یا حاکم شہر کو کسی کی برائی اس لیے بتانا کہ وہ اس کی اصلاح کرے یہ بھی غیبت نہیں ہے۔ نیز کسی مظلوم کا اپنے ظالم کی برائی بیان کرنا بھی غیبت نہیں ہے۔

اسی طرح کسی کو کوئی ذمہ داری سونپنے سے پہلے اس کی انتظامی اور اخلاقی حالت کے سلسلہ میں رپورٹ یا مشورہ طلب کرنے پر مشورہ دینے والا اس کا عیب ظاہر کردے تو یہ بھی غیبت نہیں، اس طرح کی بعض اور شکلیں ہیں جن میں کسی کے پیچھے اس کی بابت منفی بات کہنا دینی اور سماجی ضرورت بن جاتی ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو دوسروں کے دھوکہ کھانے اور حق کے مارے جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لیے شریعت نے اسے غیبت نہیں بلکہ ضرورت شمار کیا ہے، غیبت یہ ہے کہ آدمی بلا شرعی اور قانونی یا سماجی ضرورت کے دوسرے بھائی کی برائی بیان کرے اور اس کی توہین اور تکلیف کا موجب بنے، اس غیبت سے احتراز کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدگمانی، تجسس، بہتان تراشی، عیب جوئی اور غیبت سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

روزہ اور تقویٰ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. اَيَّا مًا مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ، وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ:۸۴-۱۸۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو، تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔

روزہ اہم عبادت ہے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ ہے، نفسانی خواہشات پر قابو پانے اور اپنے آپ کو

منکرات سے بچانے کا اہم ذریعہ روزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ ہر شریعت میں فرض کیا تھا اور ہر امت کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا، یہ اور بات ہے کہ روزہ کی صورت اور مدت الگ الگ تھی، مثلاً کسی امت کو ایام بیض کے روزے کا حکم تھا، یعنی قمری مہینہ کی ۱۳ ویں چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے، کسی امت پر خاموش رہنے کا روزہ تھا مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کا روزہ، کسی نبی کو ایک دن افطار کرنے اور ایک دن روزہ رکھنے کا حکم تھا مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ اور کبھی دن اور رات دونوں کا روزہ تھا اس طرح کہ اگر رات کو سو گئے تو روزہ شروع ہو گیا، اگلے دن کے افطار تک کچھ کھا پی نہیں سکتے اور نہ خواہش نفس پوری کر سکتے ہیں۔

ابتداء اسلام میں مسلمانوں پر بھی اسی طرح کا روزہ فرض تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ روزہ کے حکم میں تین مرتبہ تبدیلی ہوئی، پہلی مرتبہ اس وقت جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے، لوگ ہر ماہ میں تین دن روزہ رکھتے تھے اور یوم عاشورا کا روزہ رکھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر باقاعدہ رمضان المبارک کا روزہ فرض کیا، اس میں لوگوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہیں تو روزہ رکھیں اور چاہیں تو روزہ کے بدلہ کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں، یہ حکم تبدیل ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، جو شخص رمضان کا مہینہ پائے اس کا روزہ ضرور رکھے، چنانچہ ہر عاقل بالغ مسلمان پر روزہ فرض کیا گیا اور اختیار ختم کر دیا۔ البتہ مریض و مسافر کو دوسرے دنوں میں روزہ رکھنے کی رخصت دے دی گئی، عمر دراز ضعیف انسان کو فدیہ کی اجازت دے دی۔ تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ افطار کے بعد جب تک لوگ سوتے نہیں تھے اس وقت تک کھانے پینے اور بیوی سے مجامعت کرنے کی اجازت تھی مگر جب وہ سو جاتے تو اٹھکر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ سونے کے بعد سے روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک انصاری صحابی صرمہ بن قیس روزہ کی حالت میں محنت مشقت کر کے آئے اور بغیر کچھ کھائے ہوئے سو گئے، صبح ہوئی تو پھر ان کا روزہ تھا۔ نبی علیہ ﷺ نے ان کو دیکھا کہ وہ نڈھال ہو چکے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے

ان سے پوچھا کہ میں تم کو شدید مشقت میں مبتلا دیکھتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ انھوں نے کہا یا رسول اللہ: کل میں نے محنت کی ،شام کو گھر آیا، لیٹا تو نیند آ گئی، صبح جب اٹھا تو پھر روزہ رکھنا تھا۔[۱] اسی طرح حضرت عمرؓ نے سونے کے بعد اپنی بیوی سے مباشرت کی وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اپنی پریشانی بیان کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ''اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ''[۲]

رمضان کا مہینہ ایسا بابرکت مہینہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی نیکیاں پروان چڑھتی ہیں اور موسم بہار کی طرح برگ و بار لاتی ہیں ،حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا دخل رمضان فتحت ابواب السماء وغلقت ابواب جهنم وسلسلة الشياطين۔[۳]

جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ،جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے۔

رمضان کا روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ہر عبادت کی اپنی شان اور لذت ہے،روزہ کی شان سب سے الگ اور منفرد ہے ہر عبادت ظاہری عمل پر مبنی ہے مگر روزہ داخلی عبادت ہے، اگر کوئی چھپ کر پانی پی لے تو اسے اللہ کے علاوہ کون دیکھ سکتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كل عمل ابن آدم له الا الصيام فانه لي وانا اجزي به[۴]

بنی آدم کا ہر عمل اسی کے لیے ہے سوائے روزہ کے کیونکہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔

---

[۱] بخاری، کتاب الصوم، باب قول اللہ احل لکم لیلۃ الصیام
[۲] تفسیر ابن کثیر، البقرہ، ۱۸۳
[۳] بخاری، کتاب الصوم، باب ھل یقال رمضان
[۴] ایضا

دوسری روایت میں ہے کہ:

من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه۔[۱]

جس نے ایمان اور خود احتسابی کے ساتھ روزہ رکھا اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

روزہ شرعی طور پر تو صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے پرہیز کرنے کا نام ہے، مگر روزہ کی حکمت یہ ہے کہ انسان خواہشات نفس پر مکمل کنٹرول کرے، عبادت اور ذکر سے اپنے قلب کی تطہیر کرے اور غیر اخلاقی کاموں سے بچے، لڑائی جھگڑے، فتنہ فساد، گالی گلوچ، چیخنے چلانے سے بچے، دوسروں کی برائی نہ کرے بلکہ ہر برے قول اور عمل کو ترک کردے۔ چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ داروں کو یہ حکم دیا ہے کہ:

الصیام جنة فلا یرفث ولا یجهل فان امروٌ قاتله او شاتمه فلیقل انی صائم مرتین والذی نفسی بیده لخلوف فم الصائم اطیب عند الله تعالیٰ من ریح المسک یترک طعامه وشرابه وشهوته من اجلی۔[۲]

روزہ گناہوں سے ڈھال ہے، روزہ دار کو چاہیے کہ وہ گناہ کا کام نہ کرے، نہ جہالت کی بات کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے جھگڑا کرے یا گالی گلوچ کرے تو وہ اس سے دو مرتبہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ روزہ دار نے اللہ کی خاطر کھانے پینے اور شہوت کو ترک کردیا ہے۔

---

[۱] بخاری، کتاب الایمان، باب صوم رمضان احتسابا من الایمان

[۲] بخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم

روزہ کا مقصد قرآن میں تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے اور تقوی بری باتوں، برے کاموں سے بچنے، اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَ یُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (الحشر-۱۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے، اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اگر انسان روزہ بھی رکھے، غلط کام بھی کرے، بری باتیں بھی کرے، تو روزہ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، بظاہر وہ شخص روزہ تو رکھتا ہے مگر اسے روزہ کا اجر نہیں ملتا، کیونکہ وہ روزہ کا مقصد پورا نہیں کرتا ایسے روزہ دار بہت سے ہیں جن کے بارے میں رسول پاک ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

کم من صائم لیس له من صیامه الا الظمأ و کم من قائم لیس له من قیامه الا السهر۔[1]

بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کو روزہ کے نام پر صرف بھوک پیاس ملتی ہے اور بہت سے رات کو نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جن کو قیام لیل کے نام پر رات کا جاگنا ہی ملتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں مگر روزہ کے روحانی اور اخلاقی تقاضے پورے نہیں کرتے، زبان کو دوسروں کی غیبت سے، برائی سے، بدگوئی سے محفوظ نہیں رکھتے۔ دوسروں کی حق تلفی سے، ایذارسانی سے، جھگڑا لڑائی سے باز نہیں آتے غرضیکہ وہ سب کام کرتے ہیں جو بے روزہ دار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو روزہ سے نہ خود فائدہ ہوگا اور نہ اللہ کو اس کے روزہ کی ضرورت ہے، چنانچہ رسول پاک ﷺ نے صاف صاف فرمایا ہے:

---

[1] ابن ماجہ، کتاب الصیام

من لم يدع قول الذور والعمل به فليس لله حاجة في ان يدع طعامه وشرابه ۱

جوشخص جھوٹی بات اور جھوٹا کام نہیں چھوڑتا تو اللہ کو اس کا کھانا پینا چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

روزہ کی دو اہم سنتیں ہیں ایک سحری اور دوسرے افطار، سحری رسول ؐ کی سنت ہے اور یہی فرق ہے اہل کتاب اور مسلمانوں کے روزہ میں۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

تسحّروا فان فی السحور برکة ۲

سحری کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔

اگر روزہ دار کو سحری کھانے کی خواہش نہ ہو تب بھی ایک کھجور کھالے یا ایک گلاس پانی پی لے تاکہ سنت رسول ﷺ سے محروم نہ رہے۔

دوسری سنت افطار ہے، سحری میں تاخیر اور افطار میں جلدی کرنا سنت ہے۔ افطار کی یہ بھی سنت ہے کہ روزہ داروں کو افطار کرائیے اگر غریب روزہ دار کو افطار کرائیں گے تو دوہرا ثواب ملے گا یعنی افطار کا بھی اور غربا پروری کا بھی۔ افطار کے وقت دعا کرنا بھی مسنون ہے اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: تین آدمیوں کی دعا اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ ایک انصاف پرور حکمراں کی، دوسرے مظلوم انسان کی اور تیسرے افطار کرنے والے روزہ دار کی۔ ۳

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ روزہ افطار کے وقت دعا کرتے اور یہ حدیث بھی دہراتے۔ **ذهب الظما وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء الله** ۴

روزہ میں تلاوت قرآن کا اہتمام کرنا تراویح اور تہجد کا اہتمام کرنا اور ذکر کا اہتمام کرنا روزہ کی قبولیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو روزہ کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

---

۱ بخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور
۲ ایضاً، باب برکۃ السحور
۳ ابن ماجہ، کتاب الصیام
۴ ابوداؤد، کتاب الصوم

رمضان اور قرآن

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید۔ اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ۔۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔

رمضان المبارک کی فضیلت کے دو بڑے اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ یہ ماہ صیام ہے اس ماہ میں روزہ رکھنا سارے مسلمانوں پر فرض ہے جو کوئی سفر یا مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھے اور جو جان بوجھ کر ایک روزہ چھوڑ دے وہ کفارے کے طور پر مسلسل ساٹھ دن تک روزے رکھے۔

رمضان المبارک کی فضیلت کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے، اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریم نازل ہوا، یعنی انسانی زندگی کے لیے الٰہی دستور اور انسانی عمل کے لیے ربانی منشور اسی مہینہ میں عطا کیا گیا، صرف قرآن ہی نہیں جتنے آسمانی صحیفے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں پر اتارے

وہ سب رمضان ہی کے مہینہ میں نازل ہوئے۔

قرآن پاک کے نازل ہونے کی صراحت دو اور مقامات پر کی گئی ہے، چنانچہ سورہ الدخان میں ہے:

حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ. اِنَّآ اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ. فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ. اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ. (الدخان:۵-۱)

ح-م-قسم ہے اس کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیرو برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے۔

تیسری جگہ سورہ القدر میں فرمایا گیا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (القدر:۲-۱)

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ تم کیا جانو شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

یہ تینوں آیات قرآن کریم کے نازل ہونے کی ابتدا اور تاریخ کو بیان کرتی ہیں۔ قرآن رمضان کی بابرکت راتوں میں نازل ہوا اور وہ بابرکت رات لیلۃ القدر ہے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے سماءِ دنیا پر شب قدر میں نازل ہوا اور وہاں سے نبی پاک ﷺ پر جبریل امین کے ذریعہ اسی رات میں نازل ہوا۔ چنانچہ رمضان کو قرآن سے گہری مناسبت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیمۃ[1]

روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن مومن بندہ کی سفارش کریں گے۔

---

[1] مسند احمد ۲/۱۷۴

روزہ اللہ کی بندگی ہے اور قرآن کی تلاوت اللہ سے شرف ہم کلامی ہے، جو مومن اللہ کی بندگی اور اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی سفارش ضرور ہونی چاہئے ۔ روزہ کہے گا اے اللہ یہ بندہ تیری خاطر بھوک و پیاس کی شدت برداشت کرتا تھا تو اسے بخش دے اور قرآن کہے گا کہ اے اللہ یہ بندہ تیری خاطر میری تلاوت میں مشغول رہتا تھا تو اسے بخش دے۔

رمضان صرف نزول قرآن کا مہینہ نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت و اشاعت کا بھی مہینہ ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر سال جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لاتے اور قرآن کریم کا دور کرتے، جس سال رسول پاک کا وصال ہوا اس سال تو جبریل امین نے دو مرتبہ قرآن پاک کا دور کیا، اسی سے رسول پاک نے سمجھ لیا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کو اٹھالے گا۔[1]

رمضان المبارک میں رسول پاک اور جبریل امین کا مذاکرۂ قرآن تراویح کی نماز میں قرآن پاک کو سننے اور سنانے کی روایت کا ذریعہ بنا اور آج تک رمضان المبارک میں دنیا کی کڑوروں مساجد میں قرآن پاک کا سننا اور سنانا دراصل اسی سنت کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی بھی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی، چنانچہ پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف اور تبدیلی کر دی گئی، مگر قرآن پاک کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے خود لی ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (الحجر-۹)

اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

قرآن کی حفاظت کا ایک بڑا ذریعہ رمضان المبارک ہے جس میں ہر طرف قرآن کی تلاوت کا ماحول ہوتا ہے۔

دنیا میں کسی کتاب کے یاد کرنے والے اتنی بڑی تعداد میں نہیں پائے جاتے جتنی بڑی تعداد میں قرآن پاک کے حفاظ پائے جاتے ہیں اور یہ حفاظ صحت

---

[1] بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبیؐ

کے ساتھ زیر، زبر، پیش تک کی حفاظت کے ساتھ قرآن کریم کو سناتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو فوراً دوسرا حافظ اسے لقمہ دے دیتا ہے اور وہ نیکی سمجھ کے قبول کر لیتا ہے، یہ قرآن کریم کی حفاظت کا من جانب اللہ ایک انتظام ہے۔

تراویح اور تہجد میں قرآن پڑھنے اور سننے کے علاوہ خوش نصیب مسلمان کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بھی رمضان میں ایک سے زیادہ مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کرے اور یہ تو کلام اللہ ہے جو جتنی مرتبہ اسے پڑھے گا نئی لذت وحلاوت پائے گا۔ اس لیے تلاوت قرآن کا شغل سال بھر رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ''ھدی للناس'' کہا ہے یعنی تمام انسانوں کے لیے یہ ہدایت نامہ ہے، انسان اگر فکری اور عملی گمراہی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، دل اور دماغ کی تاریکی کو مٹانا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ قرآن کو اپنا لے۔ قرآن اس کے لیے عبادت بھی ہے، نور بھی ہے، دستور بھی ہے، منزل بھی ہے اور مقصد بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء-۱۷۴)

لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیلِ روشن آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔

جس طرح ہر مشین کے ساتھ ایک گائیڈ بک کمپنی کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مشین کو کس طرح استعمال کیا جائے اور نقصان اور خرابی سے کس طرح اس کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح اللہ رب العزت نے یہ عظیم کائنات بنا کر انسانوں کے حوالہ کر دیا ہے، کس طرح اس سے فائدہ اٹھانا ہے اور کس طرح اس کو تباہی سے بچانا ہے، ان سب ہدایات کے لیے اس نے قرآن کریم عطا کر دیا ہے۔

قرآن کریم سے ہدایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ تلاوت کرنے

کے ساتھ اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے، اس میں غور وفکر کیا جائے اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے سمجھ کر نہ پڑھا جاتا ہو یہ صرف اللہ کی کتاب کا معاملہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ جب ہمارے پاس کسی کا خط آتا ہے تو اسے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ اگر وہ کسی دوسری زبان میں ہو تو اس زبان کے جاننے والے سے رجوع کرتے ہیں، مگر اللہ کا نامہ گرامی قرآن کریم اسے نہ تو ہم خود سمجھتے ہیں نہ ان علماء سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کی زبان جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کے متعلق کہا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (محمد-۲۴)

کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنا عوام کا کام نہیں بلکہ علماء کا کام ہے، یہ ایک وسوسہ ہے جو اللہ کی کتاب سے دور کرنے کا ذریعہ ہے، علماء کرام نے قرآن پاک کا دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمہ کر دیا ہے، یہ ترجمہ عوام ہی کے لیے کیا گیا ہے تا کہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اگر قرآن کا سمجھنا صرف علماء کا کام ہوتا تو وہ لوگ اس کا ترجمہ کیوں کرتے۔ حضرات صحابہ کرام کا معمول یہ تھا کہ وہ قرآن کی آیات پر غور وفکر کرتے، اسے سمجھتے پھر آگے بڑھتے، چنانچہ ابو عبدالرحمان السلمی روایت کرتے ہیں:

''ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن اہتمام سے پڑھا کرتے تھے، جیسے حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرات صحابہ جب نبی ﷺ سے دس آیات پڑھ لیتے تو ان سے آگے نہ بڑھتے یہاں تک کہ وہ ان آیات میں علم وعمل کی تمام باتیں نہ جان لیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے قرآن اور عمل دونوں ایک ساتھ سیکھا ہے اور اسی لیے وہ ایک سورہ کو یاد کرنے میں بڑا وقت صرف کر دیتے''[1]

---

[1] مسند احمد ۵/۴۱۰

قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، قرآن میں ایمان و اسلام کی جو بنیادی تعلیمات ہیں، حلال وحرام کے جو احکام ہیں، عبادات، معاشرت، معیشت، حکومت، حقوق وفرائض، امن وانصاف اور جہاد وقتال، جنت وجہنم کے استحقاق کی جو آیات ہیں اور انسانی خیالات اور رویوں کی اصلاح کے لیے جو فرامین ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو قرآن کے نازل ہونے کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، قرآن صرف علم کی کتاب نہیں بلکہ عمل کی کتاب بھی ہے۔ مسلمان جب تک اپنی عملی زندگی اور اپنے سماج کو قرآن کی تعلیم کے مطابق نہیں ڈھالیں گے وہ قرآن کا حق ادا نہ کرسکیں گے۔ قرآن میزان عمل بھی ہے، اسی میزان کے مطابق انسان کا عمل قیامت کے دن تولا جائے گا۔

قرآن پاک پر عمل کرنے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسے غیر مسلموں تک پہونچانے کی کوشش کی جائے۔ غیر مسلموں سے خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے کہ ان کی فلاح اور نجات کی راہ سے ان کو باخبر کیا جائے، تاکہ ہدایت کا راستہ ان کے لیے کھلے اور وہ اللہ کے حضور یہ نہ کہہ سکیں کہ تیری ہدایت سے ہمیں آگاہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

اگر ہم مسلمان قرآن کی تلاوت کا اہتمام کریں گے، اس کو سمجھیں گے، اس پر عمل کریں گے اور اس کی دعوت غیر مسلموں تک پہونچائیں گے تو دنیا میں بھی ہم سرخرو ہوں گے اور قیامت میں بھی قرآن ہمارا سفارشی ہوگا، ورنہ قرآن بھی ہمارے خلاف حجت بن جائے گا اور رسول پاک بھی یہ شکوہ فرمائیں گے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا. (الفرقان-۳۰)

اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا"۔

ہمیں قرآن کو اپنے دل ودماغ کی روشنی، اپنے گھر اور سماج کی روشنی بنانے کی فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

قرآن کریم اور تزکیۂ نفس

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
الکریم اما بعد: قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید.
اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

یَا أَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْکُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِکَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (یونس، ۵۷-۵۸)

(اے لوگو! تمہارے پاس نصیحت نامہ تمہارے رب کے پاس سے آچکا ہے، جو سینوں کے امراض کے لیے شفا ہے اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ یہ اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت کی وجہ سے ہے تو لوگوں کو اس پر خوش ہونا چاہیے، وہ ان چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔)

نزول قرآن کا بنیادی مقصد روحانی بنیادوں پر حیات انسانی کی تشکیل ہے اور اس کے ذریعہ انسانی معاشرہ کی تعمیر ہے۔ نفسِ انسانی کی تہذیب اور عقلِ انسانی کی تربیت قرآن کا خاص موضوع ہے۔ یہ مقصد اگر چہ سابقہ آسمانی کتابوں کا بھی رہا ہے مگر وقتی طور پر، قرآن کریم تہذیبِ انسانی کا مکمل نسخہ ہے یہ ہر دور اور ہر مقام کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے، قرآن پاک کی یوں تو بہت سی خصوصیات اور اعلیٰ صفات

خودقرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں، مگر ان خصوصیات میں ہدایت رسانی اورتہذیب نفس کی خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور قرآن اس کا بار بار اظہار کرتا ہے۔

تلاوت کردہ آیت میں قرآن کریم کی چار صفات عالیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے:

اول یہ موعظۃ ہے۔یعنی قرآن بری باتوں اور برے اعمال سے روکتا ہے۔

دوم یہ شفاء لمافی الصدور ہے۔یعنی سینہ کے تمام امراض کے لیے شفا ہے۔

سوم یہ ہدایت نامہ ہے۔ یعنی اللہ کی رضا پر چلنے کا راستہ دکھاتا ہے۔

چہارم یہ رحمت ہے۔یعنی اہل ایمان کو دنیا اور آخرت میں رحمت الہٰی کا مستحق بناتا ہے۔

یہ چاروں صفات انسانی زندگی کی تعمیر وتہذیب میں قرآن مجید کے جامع اور انقلاب آفریں کردار کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور قرآن کے مقصد و مدعا کو واضح کرتی ہیں۔

پہلی صفت قرآن کریم کی ان حکیمانہ نصیحتوں پر مشتمل ہے جو انسان کو بری باتوں، بری عادتوں، برے عمل اور برے اطوار کو ترک کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔مثلاً ظلم وتعدی، حق تلفی، گالی گلوچ، قتل وغارت گری، زنا کاری وبدکاری اور شہوت رانی، غیظ وغضب، فتنہ وفساد، غرور ونخوت، بت پرستی اور مادہ پرستی جیسی تمام حرکات سے اجتناب کرنے کی دعوت کا نام موعظۃ ہے۔اس میں دل سوزی اور اخلاص کا وافر حصہ پایا جاتا ہے اور استدلال واستذکار بھی اس میں موجود ہے۔سورہ اعراف میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً وَأَن تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (الاعراف:۳۳)

(آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میرے رب نے حرام کیا ہے بے حیائی

کی باتوں کو خواہ کھلی ہوئی ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ کو اور ناحق زیادتی
کو، اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے کو جس کی اس نے کوئی سند نازل
نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرو جو تم نہیں جانتے۔)

اسی مضمون کی مزید وضاحت سورہ الانعام کی آیت ۱۵۱ میں بھی کی گئی ہے۔

یہ آیات انسانوں کو احساس دلاتی ہیں کہ جو کام اور حرکات تمہارے دین و دنیا کے لیے اور تمہاری شخصیت کے وقار اور اعتبار کے لیے مضر ہوں ان کو ترک کر دو، اگر تم برائیوں کو ترک نہیں کرو گے تو نیکیوں کی فصل تمہارے وجود سے نہیں ابھرے گی۔ کاشت کار پودے لگانے سے پہلے کھیت کے جھاڑ جھنکار کو صاف کرتا ہے اسی طرح تم کو اپنے نفس کی کھیتی کو نقصان دہ چیزوں سے پاک کرنا چاہیے۔

قرآن پاک اوصاف رزیلہ کو کہیں محرمات سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی منکرات سے، کبھی فواحش سے اور کبھی معصیت سے تعبیر کرتا ہے۔ مقصد انسانی وجود کی آلائشوں کو صاف کرنا اور اسے پاکیزگی کی راہ پر گامزن کرنا ہے اور انسانی زندگی کو مہذب اور مؤدب بنا کر اللہ رب العزت کا محبوب بنانا ہے۔

قرآن کریم کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ دلوں کے امراض کے لیے نسخہ کیمیا ہے، قرآن انسان کے ظاہر کو فاسد اعمال سے پاک کرنے کے ساتھ اس کے دلوں کو بھی گناہ کے اثرات اور مہلک روحانی امراض سے پاک کرتا ہے۔ دلوں کے امراض میں شرک والحاد، تشکیک اور نفاق، توہم پرستی اور بدگمانی، خود پسندی اور نفس پرستی، کینہ، حسد، غرور، تعصب وغیرہ ایسے امراض ہیں جو انسان کو اندر سے جلا دیتے ہیں انسان بظاہر معقول اور مہذب نظر آتا ہے مگر اندر سے اس کا وجود جل کر راکھ میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے، جسے ایک شاعر نے اس طرح کہا ہے

منظر سیاہ پوش نہ پیکر جلا ہوا
ہر شخص اپنی ذات کے اندر جلا ہوا

قرآن پاک نے انسانی وجود کی پاکیزگی اور اس کے نفس کی تہذیب کے لیے باطن کو سنوارنے پر زیادہ زور دیا ہے، یہ انسان کا وہ پہلو ہے جسے دوسرے لوگ کم دیکھتے ہیں اور وہ خود زیادہ محسوس کرسکتا ہے۔

جب تک انسان باطنی امراض سے پاک نہ ہو ظاہری امراض سے پاک نہیں ہوتا، جب جسم پر پھوڑا اور زخم نکلتا ہے تو اس کے علاج کے ساتھ اطباء فسادِ خون کا بھی علاج کرتے ہیں کیوں کہ فسادِ خون زخم کا موجب ہے۔ اسی طرح ظاہری اعمالِ فاسدہ کے پیچھے باطنی رویہ کی اصلاح ضروری ہے اور عارفین ہمیشہ باطنی رویہ کو ذہن میں رکھ کر فرد کی اصلاح کرتے ہیں۔ قرآن پاک انکشاف کرتا ہے کہ دلوں کے امراض اگر دور نہ ہوں تو عقیدہ و عمل کی گندگی مزید پھیلتی ہے۔

وَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْساً إِلَى رِجْسِهِمْ (التوبۃ: ۱۲۵)

(اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اللہ نے ان کی گندگی میں اضافہ کردیا۔)

انسان جسمانی امراض میں مبتلا ہوتا ہے تو دوا کی فکر کرتا ہے، معالج سے رجوع کرتا ہے۔ کیونکہ مرض کی تکلیف اسے علاج پر مجبور کرتی ہے، مگر انسان روحانی امراض میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے علاج کی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ اسے نہ مرض کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ نہ اپنی ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگرچہ روحانی مرض جسمانی امراض سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے، قرآن مریضوں کو روحانی علاج کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

قرآن پاک کی تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مکمل ہدایت نامہ ہے۔ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے توریت کو بھی ہدایت نامہ کے طور پا نازل کیا گیا تھا، مگر وہ ہدایت نامہ صرف یہود و نصاریٰ یعنی بنی اسرائیل کے لیے تھا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَلَّا تَتَّخِذُواْ مِن دُونِيْ وَكِيْلاً (بنی اسرائیل:۲)

(اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا کہ میرے علاوہ کسی اور کو کارساز نہ ٹھہراؤ۔)

یہود ونصاریٰ کل بھی یہ کہتے تھے کہ ''کُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ'' (البقرہ:۱۳۵)(یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو راہ یاب ہو جاؤ گے)۔

آج بھی وہ اسلام کو باطل مذہب، پیغمر اسلام کو نعوذ باللہ جھوٹا پیغمبر اور قرآن کو خودساختہ کتاب قرار دیتے ہیں۔ مگر قرآن صاف اعلان کرتا ہے کہ: ''إِنَّ هَـذَا الْقُرْآنَ يِهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ'' (بنی اسرائیل:۹) (قرآن سب سے سچے اور اچھے راستہ کہ رہنمائی کرتا ہے)۔ یہود و نصاریٰ دین حنیف سے مرتد اور منحرف ہیں۔ انہوں نے کتاب الٰہی کو ترمیم وتحریف کا شکار بنایا اور دین الٰہی کو کھیل تماشا بنالیا۔ اس مذہب سے رشد و ہدایت ختم ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہونچنے کا واحد معتبر ذریعہ قرآن کریم ہے۔ اس کی ہدایت وقتی نہیں دائمی ہے۔ یہ خاص قوم کے لے نہیں بلکہ آفاقی ہے۔

قرآن زندگی کے تمام معاملات میں انسان کی رہنمائی کا حق ادا کرتا ہے، عقیدہ واخلاق سے لیکر حلال وحرام تک، تمدن سے لے کر معیشت تک اور خاندان و معاشرت سے لے کر سیاست تک اس کی رہنمائی کا سلسلہ وسیع اور روشن ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے منشا کو سمجھنے، اس کی مرضی کو جاننے اور نجات حاصل کرنے کا واحد مکمل راستہ قرآن کریم ہے۔ قرآن ہر طبقہ کے انسان کو اپنی ہدایت سے فیض یاب کرتا ہے اور دنیاوی سعادت اور اُخروی نجات کی بشارت دیتا ہے۔ اس ہدایت سے منہ موڑ کر انسان کامیاب نہیں ہوسکتا۔ خواہ اسے اپنی عقل وفہم اور علم وتجربہ پر کتنا ہی ناز کیوں نہ ہو۔

قرآن پاک کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اہلِ ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ جب انسان اپنے وجود کو ہر طرح کی برائیوں سے پاک کرتا ہے، فاسد خیالات اور مہلک رسم و رواج سے اجتناب کرتا ہے، نفس کو عقائد صحیحہ اور اخلاق حسنہ سے آراستہ کرتا ہے اور آسمانی ہدایت نامہ کو اپنی زندگی کا دستور بنالیتا ہے تو صحیح معنوں میں رحمتِ الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے۔ رحمتِ الٰہی کی کرنیں اس پر نچھاور ہوتی ہیں اور اس کا پورا وجود روحانی ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں ربانی قدروں کا نمائندہ قرار پاتا ہے۔

جب انسان اس روحانی منزل تک پہونچتا ہے تو ایک طرح کا سرور اسے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اندر فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں جذبۂ شکر بھی شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کے اظہار کی اجازت یہ کہہ کر دی ہے کہ ''اس پر اہل ایمان کو خوش ہونا چاہیے۔ وہ اس مال و دولت سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں''۔

قرآن پاک میں قارون کی داستان سنائی گئی ہے اور اس کے مال و دولت کا تذکرہ کرکے کہا گیا ہے کہ اپنی دولت پر اتراؤ نہیں، اللہ اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ مگر قرآن کی دولت پر اہل ایمان کو خوش ہونے کی تلقین کی گئی ہے، دونوں جگہ ''فرح'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر یاد رہے کہ قارون کی خوشی اس کی ناجائز دولت پر تھی۔ اور اہل ایمان کی خوشی روحانی دولت پر ہے، ایک فانی ہے اور دوسری جاودانی، ایک ہلاکت کا ذریعہ ہے، دوسری حیات جاودانی کا سرچشمہ ہے۔ ایک کا انجام پستی ہے اور دوسرے کا بلندی ہے، ایک کی خوشی جھوٹی ہے دوسرے کی حقیقی۔ اللہ اس حقیقی خوشی سے بندۂ مومن کو سرفراز کرے۔ (آمین)

شب قدر اور اعتکاف

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ. (القدر)

ہم نے اس (قرآن) کوشب قدر میں نازل کیا ہے اورتم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔فرشتے اورروح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کراترتے ہیں۔وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو دوسروں پرفضیلت بخشی ہے اسی طرح رمضان المبارک کو سال کے دوسرے مہینوں پرفضیلت عطا کی ہے اور رمضان المبارک کے آخری عشرہ کو خصوصی فضیلت عطا فرمائی ہے، کیونکہ اسی عشرہ میں لیلۃ القدر آتی ہے جو ہزار مہینوں کی راتوں سے افضل ہے۔رمضان المبارک کے پہلے عشرہ کو''رحمۃ'' کہا گیا ہے،دوسرے عشرہ کو''مغفرۃ'' کہا گیا ہے اورتیسرے عشرہ کو''عتق من النار'' یعنی جہنم کی آگ سے نجات کہا گیا ہے۔رمضان المبارک کا آخری عشرہ انتہائی فضیلت اور اہمیت کا حامل ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ عبادت کی جائے، غریب پروری اور خدمت خلق کی جائے اور اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنے کی کوشش کی

جائے، کیونکہ اس عشرہ کے بعد یہ مبارک مہینہ ختم ہو جائے گا، حدیث میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک آتا تو رسول اللہ ﷺ مومنوں کو خطاب فرماتے:

"ان هذا الشهر قد حضركم وفيه ليلة خير من الف شهر من حرمها فقد حرم الخير، كله ولا يحرم خيرها الا محروم"۔[۱]

یہ ماہ مبارک آ چکا ہے، اس کی ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں کی راتوں سے افضل ہے، جو اس رات سے محروم رہا وہ ساری بھلائیوں سے محروم رہا اور اس کی بھلائیوں سے بدنصیب ہی محروم رہ سکتا ہے۔

اہلِ ایمان کو عبادت اور آخرت کی تعلیم دینے کے ساتھ رسول پاک ﷺ خود بھی قدر کی راتوں میں بہت زیادہ عبادت اور خیرات کا اہتمام فرماتے اور اپنے اہل خانہ کو بھی اس کا اہتمام کرنے کی تلقین فرماتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ:

"كان النبي ﷺ اذا دخل العشر الاخير شد مئزره واحيا ليله، وايقظ اهله.[۲]

جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ ﷺ ازار کس لیتے، راتوں کو جاگتے اور اپنے اہل خانہ کو جگاتے"

لیلۃ القدر کی فضیلت کے سلسلہ میں قرآن پاک نے تین اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک تو یہ کہ اس رات میں قرآن پاک نازل کیا گیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو شرف ہم کلامی سے نوازا۔ اللہ نے قوموں کی تقدیر قرآن سے

---

[۱] ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ماجاء فی فضل شهر رمضان

[۲] بخاری، کتاب الصوم، باب العمل فی العشر الاواخر من رمضان

وابستہ کردی ہے اوران کے عروج وزوال کا پیمانہ قرآن کو بنادیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس رات میں اللہ کا پیغام لے کر فرشتے اور جبریل امین اترتے ہیں اورطلوع فجر تک سلامتی کا مژدہ سناتے رہتے ہیں۔یعنی اللہ خود بھی متوجہ ہوتا ہے اوراپنے فرشتوں کو بھی انسانوں کی سعادت اور رحمت کے لیے بھیجتا ہے، یہ فرشتے انسانوں کو اللہ کی رحمت کی طرف بلاتے ہیں، ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں اوراللہ کے حضوران کی سفارش کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ اس رات میں انسانوں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، قدر کے معنی عزت واحترام کے بھی ہیں اورتقدیر کے بھی ہیں،یعنی لیلۃ القدر عزت واحترام کی بھی رات ہے اورتقدیر کے بننے اور بگڑنے کی رات بھی ہے، اسی بات کو سورہ الدخان میں اس طرح کہا گیا ہے:**فیها یفرق کل امر حکیم** (الدخان-۴)اس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے،بعض لوگوں نے شعبان کی پندرہویں شب کو تقدیر کی رات سمجھ لیا ہے،مگر قرآن میں جو صراحت کی گئی وہ صرف لیلۃ القدر کے بارے میں ہے اوراسی لیے جناب رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

من يقم ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه. [1]

جس شخص نے ایمان اوراحتساب نفس کے ساتھ قدر کی رات میں عبادت کا اہتمام کیا اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ لیلۃ القدر کونسی رات ہے اوراس رات کی علامت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں بہت سی روایات ملتی ہیں،بعض روایات میں ۲۵ ویں شب،بعض میں ۲۷ ویں شب اوربعض روایت میں ۲۹ ویں شب بیان کی گئی ہے،،بہت سے سلف نے ۲۷ ویں شب کو لیلۃ القدر تسلیم کیا ہے اورآج بھی زیادہ تر لوگ اسی رات میں عبادت

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب قیام لیلۃ القدر من الایمان

کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن حضرت عبادہ ابن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، تیئسویں، پچیسویں، ستائیسویں یا انتیسویں۔[۱]

حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں تلاش کرو۔[۲]

چنانچہ یہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ قدر کی رات آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کی جائے اور ان تمام راتوں میں عبادت کا اہتمام کیا جائے۔

نبی ﷺ کے معمول سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پورے آخری عشرہ کی راتوں میں عبادت کا اہتمام بکثرت فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں دن اور تاریخ یکساں نہیں ہوتی، مشرقی حصہ میں جو تاریخ ہے وہ مغربی حصہ میں نہیں ہوگی، دن اور رات کے اوقات میں تبدیلی جغرافیائی لحاظ سے ہوتی ہے، ایک ملک میں اگر ۲۷ کی شب ہے تو تمام ملکوں میں اسی وقت ہو یہ ضروری نہیں اس لحاظ سے بھی حدیث پر عمل کرنا زیادہ صحیح ہے کہ طاق راتوں میں شب قدر کا اہتمام کیا جائے۔

اسی آخری عشرہ میں رسول پاک ﷺ اعتکاف کا اہتمام فرماتے تھے اور اپنی امت کو بھی ماہ مبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں:

ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی قبضہ اللہ ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ[۳]

نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے جب

۱۔ بخاری، کتاب الصوم، باب تحرّی لیلۃ القدر

۲۔ ایضاً

۳۔ ابوداؤد، کتاب الصیام، باب الاعتکاف

آپ کا وصال ہو گیا تو آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی تھیں۔

اعتکاف واجب علی الکفایہ ہے، مردوں کے لیے اعتکاف کی جگہ مسجد ہے اور عورتوں کے لیے اعتکاف کی جگہ اس کے گھر کا حجرہ یا کونہ ہے۔ اعتکاف کا مقصد مقررہ دنوں تک انسانی تعلقات اور ضروریات سے یکسو ہو کر اللہ کے لیے اپنے آپ کو فارغ کر لینا اور اس کی عبادت میں لگا رہنا ہے تاکہ نفس کی روحانی تربیت ہو سکے اور اللہ کے لیے یکسو ہونے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔

اعتکاف کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ آباد مسجد میں اعتکاف کیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اعتکاف کرنے والا روزہ دار ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی روزہ تو نہ رکھے مگر اعتکاف کرے، روزہ میں رات کے وقت کھانا پینا اور زوجین کا جنسی معاملہ کرنا جائز ہے، مگر معتکف کے لیے صرف کھانا پینا درست ہے، مباشرت کرنا درست نہیں، اس سے اعتکاف ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا . (البقرہ-۱۸۷)

اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو، تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ان کے قریب نہ پھٹکنا۔

معتکف کا ضرورت طبعی اور حاجت شرعی کے بغیر مسجد سے باہر نکلنا بھی اعتکاف کے منافی ہے، اعتکاف کے معنی ہی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں۔ شریعت نے عبادت و تربیت کی غرض سے مسجد میں ٹھہرنے کو اعتکاف قرار دیا ہے اس لیے معتکف کو اس کا پابند رہنا چاہیے اور دلجمعی کے ساتھ دس دن مسجد میں گذارنا چاہیے۔

روزہ اور اعتکاف کی حکمت پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سال بھر میں ایک

مہینہ ضبطِ نفس کی تربیت کے لیے مقرر کیا گیا اور اس ایک ماہ میں آخری عشرہ اس تربیت کو موثر اور موکد بنانے کے لیے خاص کیا گیا ہے۔

عام طور پر لوگ اعتکاف کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے، بہت سی مسجدیں خالی رہتی ہیں، اعتکاف کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کام کو انجام دے۔ شریعت نے انسانی تربیت کا جو نظام بنایا ہے، اس سے پوری طرح استفادہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس پر پورا پورا عمل کیا جائے اور اعتکاف بھی اس کا حصہ ہے۔ چونکہ ہر شخص کے لیے اپنی مصروفیت سے دس دن فارغ کرنا آسان نہیں ہوتا اس لیے اسے سب لوگوں پر واجب قرار نہیں دیا گیا، لیکن اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخری راتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق دے۔ (آمین)

زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلاَ یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ
فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ
لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ. (التوبہ– ۳۴،۳۵)

دردناک سزا کی خوش خبری دو ان لوگوں کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

انسان جس طرح اپنی جان اور اولاد سے محبت کرتا ہے اسی طرح اپنے مال سے بھی محبت کرتا ہے۔ جان و مال کی محبت اگر چہ فطری ہے مگر وہ اپنی جان اور مال کا مالک نہیں ہے، بلکہ امین اور خزانچی ہے، جان و مال کا حقیقی مالک تو اللہ ہے، مالک جس طرح مال کو رکھنے اور خرچ کرنے کا حکم دے گا، اسی کے مطابق امین اور خزانچی کو خرچ کرنا ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مالک کی مرضی کو نظر انداز کردے۔ ایک کافر و مشرک تو یہ سوچ سکتا ہے کہ جو مال اس کو باپ دادا سے ملا ہے یا خون پسینہ ایک کر کے اس نے کمایا ہے وہ اس کا مال ہے کسی اور کو اس کے مال میں ہدایت دینے کا حق نہیں، مگر جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس

ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور اس کی امانت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا حکم مانو اور اس کے مال کو اللہ کی ہدایات کے مطابق خرچ کرو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ۔ (الحدید-۷)

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

جو لوگ مال و دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور خدا کی راہ میں، اس کے نادار بندوں پر خرچ نہیں کرتے قیامت کے دن یہی اس کے لیے عذاب بنے گا اور اسی مال کے ذریعہ جہنم کی آگ سے اسے داغا جائے گا، اور جو لوگ اپنے مال میں اللہ کا حق پہچان کر زکوۃ اور صدقات نکالتے ہیں وہ دنیا میں بھی پاکیزہ ہیں اور قیامت میں بھی ان کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے گناہوں کو دھونے کا ذریعہ صدقہ کو بنایا ہے، جب گناہوں کی وجہ سے اللہ کا غضب بھڑکتا ہے تو یہ صدقہ ہے جو اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ پروردگار تو نے پہاڑ سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی چیز پیدا کی ہے؟ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ہاں لوہا پیدا کیا ہے جو اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، فرشتوں نے پوچھا کیا لوہے سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی چیز تو نے پیدا کی ہے؟ اللہ کہتا ہے ہاں آگ پیدا کی ہے جو اسے پگھلا دیتی ہے۔ فرشتوں نے پوچھا کیا آگ سے بھی زیادہ طاقت ور تو نے کوئی چیز پیدا کی ہے؟ اللہ کہتا ہے کہ ہاں پانی پیدا کیا ہے جو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ فرشتوں نے پوچھا کہ پانی سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز پیدا کی ہے؟ اللہ کہتا ہے کہ ہاں ہوا پیدا کی ہے جو اسے اڑا دیتی ہے، فرشتوں نے پھر پوچھا کیا تو نے ہوا سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی چیز پیدا کی ہے؟ اللہ کہتا ہے ہاں وہ بنی آدم کا صدقہ ہے جب دایاں ہاتھ دیتا ہے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی'' [1]

---

[1] مسند احمد ۳/۱۲۴

پتھر، لوہا، آگ، پانی، ہوا یہ سب مادی طاقتیں ہیں اور صدقہ وزکوۃ روحانی قوت ہے، روحانی قوت مادی قوت کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندہ صدقہ زکوۃ کے ذریعہ روحانی قوت حاصل کرے۔

صدقہ مال کو گھٹاتا نہیں ہے بلکہ بڑھا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بندہ کے نامہ اعمال میں جمع کر دیتا ہے اور ایسے وقت میں اسے عطا کرتا ہے جب وہ اس کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے پوچھا بتاؤ تم میں کس کو اپنے مال کے مقابلہ میں اپنے وارث کا مال پسند ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کو بھی اپنے مال کے مقابلہ میں وارثوں کا مال پسند نہیں، تب رسول پاک نے فرمایا: جو تم نے اللہ کے یہاں بھیج دیا وہ تمہارا مال ہے اور جو تم نے بچا کے رکھا وہ تمہارے وارثوں کا مال ہے۔ [1]

جو صدقہ اللہ کی رضا کے لیے دیا جائے، اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، جب، جہاں ضرورت مند نظر آئے اس کی مدد کرے، راہِ خدا میں ضرورت ہو حسب توفیق خرچ کر دے، اس کے لیے نہ صاحبِ نصاب ہونا ضروری ہے، نہ مقدار متعین ہے نہ سال کا گذرنا ضروری ہے، البتہ صدقہ کی ایک متعین شکل زکوۃ ہے۔

زکوۃ صرف اس مسلمان پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہو یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کے مساوی مالیت کا وہ مالک ہو، زکوۃ سال میں ایک بار صرف اس مال پر واجب ہے جو انسان کے خرچ سے زیادہ ہو اور اس پر ایک سال گذر چکا ہو ایسے مال میں صرف ڈھائی فیصد خدا کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے، مال کے علاوہ، زرعی پیداوار، سامان تجارت، گلہ بانی کے جانوروں پر بھی زکوۃ دینا فرض ہے۔

زکوۃ ادا کرنے سے انسان کا دل بھی پاک ہو جاتا ہے، کیونکہ مال کی محبت دل سے نکل جاتی ہے اور اللہ اور اس کے بندوں کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اور باقی دولت بھی پاک ہو جاتی ہے، زکوۃ کے معنی ہی پاکیزگی کے ہیں، اور جس مال سے زکوۃ نہ نکالی جائے وہ بدستور ناپاک رہتا ہے، اس میں خیر و برکت نہیں ہوتی۔ صحت مند

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب ماقدم من مالہ فھو لہ

اسلامی معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان زکوٰۃ پابندی سے نکالیں تاکہ دولت منجمد ہو کر ایک یا چند ہاتھوں میں نہ رہ جائے بلکہ گردش کرتی رہے اور لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، جس طرح جسم کے تندرست رہنے کے لیے ضروری ہے کہ خون کی گردش رگوں میں ہوتی رہے، کہیں پہ رک نہ جائے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ وصدقات کو عبادت قرار دیا ہے یہ ٹیکس نہیں ہے ٹیکس تو انسان مجبوری میں دیتا ہے اور عبادت انسان اپنی خوشی اور دلی آمادگی سے کرتا ہے۔ اور اس کو انجام دے کر اللہ کی رحمت اور مغفرت کا امیدوار ہو جاتا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَ نْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ۔ ۲۷۲)

اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کروگے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

انسان زکوٰۃ وصدقات نکال کر اپنے ان بھائیوں پر خرچ کرتا ہے جن کی ضروریات زندگی آسانی سے پوری نہیں ہوتیں وہ اپنی ضرورت پوری کرنے میں مال داروں کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مال داروں کے مال میں رکھ دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج—۲۴)

اور جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ناداروں سے نہیں کہا ہے کہ وہ مال داروں کے در پر جائیں اور ہاتھ پھیلائیں بلکہ مال داروں سے کہا ہے کہ ناداروں کا حق پہنچائیں، لہٰذا یہ مال داروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان کا حق ان کو پہونچائیں۔ چنانچہ زکوٰۃ وصدقات کے مستحقین کی فہرست بھی اللہ تعالیٰ نے بیان

فرمادی ہے۔ارشاد ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (التوبہ:۶۰)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

یہی آٹھ قسم کے لوگ زکوٰۃ وصدقات لینے کے مستحق ہیں۔بہت سے مال دار لوگ بھیک مانگنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اسے پیشہ بنا لیتے ہیں، مانگنے کے بہت سے طریقے اختیار کرتے ہیں، بہت سے صحت مند لوگ محنت ومزدوری کرنے کے بجائے دست سوال دراز کرتے ہیں ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لاتحل الصدقة لغنيٍ ولا لذي مِرَّةٍ سوي. [1]

صدقہ مال دار آدمی کے لیے اور طاقت ور مضبوط آدمی کے لیے حلال نہیں ہے۔

بہت سے لوگ ضرورت مند اور نادار ہوتے ہیں مگر غیرت اور حیا کی وجہ سے ہاتھ نہیں پھیلاتے ، ایسے لوگوں تک زکوٰۃ پہونچانا بڑی نیکی ہے ، یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان اپنے محلّہ اور شہر کے لوگوں کی خبر گیری کریں، اس طرح ان کی زکوٰۃ صحیح جگہ تک پہونچ سکتی ہے۔

زکوۃ تھوڑا تھوڑا تقسیم کرنے کے بجائے اگر ضرورت مندوں کو اتنی رقم دیدی

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب من یعطی من الصدقۃ

جائے کہ ان کے بال بچوں کی کفالت ہو جائے، وہ ایسا کام کرلیں کہ پھر زکوٰۃ لینے کی ضرورت نہ رہے تو یہ بڑی نیکی ہے، اس کے لیے اگر ہر شہر میں زکوٰۃ کا اجتماعی نظم قائم ہو جائے تو ناداروں کی کفالت بھی ہو سکتی ہے اور شریعت نے اجتماعیت کی جو روح پھونکی ہے اس کی بھی تعمیل ہو سکتی ہے۔ جس طرح نماز باجماعت کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے، اسی طرح زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کی بڑی فضیلت ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ"

افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام (زکوٰۃ) کی اہمیت سے مسلمان غافل ہو گیے، اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں اور پھر جس طرح چاہیں خود ہی خرچ کر ڈالیں۔ حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائے گی کا قرآن نے حکم دیا ہے اس کا قطعا یہ طریقہ نہیں ہے اور مسلمان کی جو جماعت اپنی زکوٰۃ کسی امین زکوٰۃ یا بیت المال کو حوالہ کرنے کی جگہ خود ہی خرچ کر ڈالتی ہے وہ دیدہ و دانستہ حکم شریعت سے انحراف کرتی ہے اور یقیناً عنداللہ اس کے لیے جوابدہ ہوگی"۔[1]

مسلمانوں میں غربت وافلاس اور ناداری دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ہے مگر مسلمانوں میں مال دار حضرات یا متوسط طبقہ کے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، اگر ہر صاحب نصاب مسلمان اپنی زکوٰۃ پابندی سے نکالے اور زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم ہو جائے تو نہ صرف محلّہ کے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہوگی، مدارس، یتیم خانے، راحت رسانی کے کام مریضوں اور اسپتالوں کا نظام اور مصیبت زدہ لوگوں کی بھی شرعی ہدایت کے مطابق امداد کی جاسکتی ہے، اور اس طرح سماج سے بھیک مانگنے والوں کی تعداد میں کمی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں زکوٰۃ کی ادائے گی کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[1] حقیقت زکوٰۃ، ص ۳۹-۳۸

عیدالفطر نمازشکر

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم
یُرِیْدُ اللّٰہَ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا
الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُو اللّٰہَ عَلٰی مَاھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ
(البقرہ ۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا، اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جارہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گذار بنو۔

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ہر سانس اللہ کی نعمت ہے اور زندگی کا ہر لمحہ اللہ کا انعام ہے اگر وہ اسے روک لے تو کوئی اسے حاصل نہیں کرسکتا، اسی لیے قران کہتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لاَ تُحْصُوْھَا (النحل : ۱۸)

اگر تم اللہ کی نعمت کو گننا چاہو تو گن نہ پاؤ گے۔

اللہ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے ہمیں انسان اور اشرف المخلوق بنایا، صحیح اور غلط کی تمیز عطا کی اور اپنی ہدایت اور معرفت سے نوازا۔ اگر انسان غور کرے تو ایمان اور عمل صالح کی توفیق اللہ کی گراں قدر نعمت ہے اس لیے کہ یہی ہماری دنیوی سعادت اور اخروی نجات کا ذریعہ ہے۔ روزہ کو اعمال صالحہ میں خصوصی مقام

حاصل ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''بنی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزہ کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ عطا کروں گا[1]۔ اس لیے روزہ دار اللہ کی بڑی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عید کا دن شکر کا دن ہے اور عید کی نماز شکر کی نماز ہے۔ جب انسان کو کوئی نعمت ملے تو اس کا تقاضا شکر ہے، شکر نعمت کا اعتراف ہے۔ احسان شناسی کا اظہار ہے اور اعلیٰ ظرفی کا معیار ہے، شکر ایمان ہے اور ناشکری کفر ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: الشکر نصف الایمان[2] شکر نصف ایمان ہے۔

کافر کی پہچان یہ ہے کہ جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا بلکہ اسے اپنا حق سمجھتا ہے اور جب کوئی چیز چھن جاتی ہے تو گلہ شکوہ کرتا ہے جب کہ مومن کی پہچان یہ ہے کہ جب کوئی نعمت اسے ملتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور اگر چھن جاتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے۔ کیوں کہ اسے یقین ہے کہ نعمت کا ملنا اور چھن جانا دونوں کا تعلق اس کی آزمائش وامتحان سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (الانبیاء: ۳۵)

اور ہم بھلائی اور برائی دونوں کے ذریعہ تمہیں آزماتے ہیں اور تم کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔

مسلمانوں کو شکر کی توفیق کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

رَبِّ اَوْزِعْنِي اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ (النمل . ۱۹)

اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا

---

[1] بخاری، کتاب الصوم

[2] احیاء علوم الدین ۸۱/۴

شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور
ایسا عملِ صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو
اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔

عید الفطر نمازِ شکر ہے اس لیے کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں رمضان المبارک کا مہینہ عطا کیا، روزہ، تلاوت، نوافل، صدقات و خیرات کی توفیق بخشی اور ہمیں ظاہری اور معنوی برائیوں سے پاک ہونے کا موقع ملا، انسانی ہمدردی اور غم خواری کی سعادت نصیب ہوئی اور ہمارے رزق میں وسعت اور برکت ہوئی، اس پر ہم شکر گزار ہیں۔ سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں بلکہ سراپا تشکر ہیں اور اس شکر کا اظہار ہم نماز عید الفطر ادا کر کے کرتے ہیں۔

آپ بخوبی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ نمازِ شکر وہی ادا کرتا ہے جس نے اس نعمت کی قدر کی ہو یعنی رمضان المبارک کی برکتوں کو سمیٹا ہو، مگر جس کو یہ نعمت زحمت کی شکل میں نظر آئی ہو، جو روزہ رکھنے کے بجائے شکم پروری میں لگا رہا ہو، نماز اور تلاوت قرآن کا اہتمام کرنے بجائے تن آسانی کا شکار رہا ہو اور صدقہ و خیرات کرنے کے بجائے بخل و کنجوسی میں مبتلا رہا ہو، اس کے لیے نمازِ شکر ادا کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ جواز، اسی لیے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قدرت کے باوجود روزہ نہیں رکھا وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے''۔

عید کا دن اللہ کی روحانی نعمتوں کے ساتھ مادی نعمتوں کے اظہار کا بھی اچھا موقع ہے، عمدہ لباس پہننا عمدہ غذائیں کھانا اور عمدہ ماحول آج کے دن کی زینت ہیں۔ ان کا اظہار ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

ان اللّٰہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ ۔[1]

اللہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا چاہتا ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الاستیذان والأدب، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ

نبی کریم ﷺ نے مزید فرمایا: ''اللہ جس بندہ پر انعام کرتا ہے اور وہ اس نعمت کا اثر اپنے اوپر ظاہر کرتا ہے تو اس کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا دوست ہے اور اس کی نعمت کا شکر گزار ہے۔ اور جس بندہ پر اللہ انعام کرتا ہے اور اس کا اثر وہ اپنے اوپر ظاہر نہیں کرتا تو اس کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا مبغوض ہے اور اس کی نعمت کا منکر ہے''۔

نعمت کا اظہار اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نعمت کا اظہار شکر ہے اور اس کا اظہار نہ کرنا کفران نعمت ہے۔ رسول ﷺ کا ارشاد ہے: التحدث بنعمة اللّٰه شکر و ترکھا کفر۔[۱] جن مسلمانوں کو یہ نعمتیں میسر نہیں ہیں ان کی دست گیری اور مدد کرنا مال داروں پر لازم کیا گیا ہے اور اس کی مختصر شکل صدقۃ الفطر کا ادا کرنا ہے۔ مسلمانوں کو اس دینی و سماجی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرنی چاہیے۔

شکر ہی کے ذریعہ انسان مزید نعمتوں کا حق دار ہوتا ہے اور اگر ناشکری کرے تو زوال نعمت کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْد

(ابراھیم :۷)

اگر تم نے شکر کیا تو مزید عطا کروں گا اور اگر کفران نعمت کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال دی ہے جو امن و سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے فراوانی کے ساتھ اس کو رزق پہنچ رہا تھا۔ مگر اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ (النحل:۱۱۲)

عدی ابن ارطاۃ نے خلیفہ وقت عمر بن عبد العزیز کو خط لکھا کہ میں ایسی

---

[۱] مسند احمد ۴/ ۲۷۸

سرزمین میں ہوں جہاں اللہ کی بکثرت نعمتیں ہیں مگر مجھ سے پہلے کے مسلمانوں پر شکر میں کمی کے باعث مخفی رہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ اللہ جب کسی قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اور وہ شکر و سپاس بجالاتی ہے تو اس پر عطیات کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔

شکر گزاری کا ایک پہلو زبانی اظہار ہے، یعنی اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح وتکبیر کرنا ہے، عیدگاہ میں دراصل مسلمان یہی شکر بجالانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اور شکر کا دوسرا پہلو انعام کرنے والے رب العزت کا شرمندہ احسان رہنا ہے۔ اس کا ہر حکم ماننا، اس کی نافرمانی سے بچنا اور ہر حال میں اس کی پسند وناپسند کا خیال رکھنا ہے۔ یہ عمل عیدگاہ سے لوٹنے کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔

اس اہم پہلو سے غافل نہ رہنا چاہیے کہ شکر کا عملی اظہار بھی لازم ہے۔ اگر نماز کا وقت آیا اور ہمارے قدم مسجد کی طرف نہ بڑھے، حرام رزق سامنے آیا اور ہمارے ہاتھ نہ رکے، بدکاری اور بدکلامی کا موقع ملا اور ہم اللہ کی ناراضگی کا خیال نہ رکھ سکے، غربت وتنگ دستی کا مارا ہوا انسان نظر آیا اور ہمارے جذبہ رحم میں حرکت نہ ہوئی تو سمجھا یہ جائے گا کہ ہمارا شکر وقتی اور زبانی تھا عمل نے اس کی مخالفت کی۔ زبانی جمع خرچ کرنے والے بہت ہیں مگر حقیقی شکر ادا کرنے والوں کی کمی ہے۔ حقیقی شکر اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ ہم کو اللہ کے احکام کا بھی پاس ولحاظ ہو۔ فرض شناسی شکر و سپاس کی بنیاد ہے جو فرض شناس نہیں شکر گذار بھی نہیں ہوسکتا ہے۔

عید کی خوشی میں انسان کو اتنا مگن نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہوجائے بقول شاعر

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بدحواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عید الفطر کی سچی خوشی عطا کرے (آمین)

والدین اور رشتہ داروں سے سلوک

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا
اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَا اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ
لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْ ھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا
وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ
ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا. (بنی اسرائیل:۲۴-۲۳)

تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہوکر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی ورحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ ”پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ حسن سلوک، خدمت اور اطاعت کا حق دار والدین کو قرار دیا گیا ہے، والدین ایک ایسی نعمت ہیں جن کا دنیا میں کوئی بدل نہیں ہے، انسان سب کچھ حاصل کرسکتا ہے، مال ودولت بھی حاصل کرسکتا ہے، آل واولاد بھی اسے مل سکتی ہے مگر ماں باپ کی نعمت اسے دوبارہ نہیں ملتی، ماں باپ اپنے بچوں کی جس طرح پرورش کرتے ہیں اور ان کی بے شعوری اور بچپن کے ایام میں دیکھ بھال

کرتے ہیں کہ اگر ان کی عنایت نہ ہوتی تو آدمی توانا نہ ہوسکتا تھا، جس طرح پودے کی دیکھ بھال ابتدائی دنوں میں انتہائی ضروری ہے اگر یہ دیکھ بھال نہ ہوتو پودا سوکھ جائے، ٹوٹ جائے اور مرجائے، اسی طرح ابتدائی عمر میں بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب والدین بوڑھے ہوجائیں تو تندرست وتوانا اولاد ان کی دیکھ بھال، ان کی خدمت کرے، ان سے نرمی اور احترام سے بات کرے، نہ ان کو تکلیف دے اور نہ ان کو سخت بات کہے، یہاں تک کہ اُف بھی نہ کہے بلکہ انکساری اور عاجزی کا ان کے سامنے اظہار کرے اور اللہ سے دعا کرے کہ بچپن میں جس طرح انھوں نے میری پرورش کی تھی، الٰہی تو بھی اسی طرح ان پر اپنا رحم اور فضل فرما۔

بڑا ہی بدنصیب ہے وہ آدمی جس کے ماں باپ یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہوں اور وہ ان کی خدمت نہ کرسکے، ان کو خوش نہ رکھ سکے اور ان کی دعائیں نہ لے سکے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے:

رغم انف وثم رغم انف ثم رغم انف من ادرک ابویه عند الکبر احدهما او کلیهما فلم یدخل الجنة[۱]

اس شخص کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان کی خدمت کرکے جنت میں داخل نہ ہوا۔

والدین کی نافرمانی کو اسلام نے گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے، رسول پاک ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا:

الا انبئکم باکبر الکبائر، قالوا بلی یا رسول الله قال الاشراک بالله وعقوق الوالدین۔[۲]

کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑے گناہوں کی اطلاع نہ دوں،

---

۱ مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل صلة صدق، الأب والأم ونحوہا
۲ بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر

صحابہ نے کہا اللہ کے رسول کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

جو لوگ والدین کی نافرمانی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے ناراض رہتا ہے، ان کی روزی میں کمی کر دیتا ہے، ان کی برکت اٹھا لیتا ہے، ان کی دعائیں قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں اور جو لوگ والدین کی اطاعت کرتے ہیں اللہ ان کے گناہ معاف کرتا ہے، ان کی عمر میں اضافہ کرتا ہے اور ان کی روزی میں برکت دیتا ہے۔ ماں باپ کی رضا میں اللہ کی رضا ہے اور ماں باپ کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے۔

والدین کی خدمت کو اسلام نے جہاد سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور میں صرف اس سے اللہ کا اجر چاہتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں دونوں زندہ ہیں۔ رسول پاک ﷺ نے پوچھا کیا واقعی تم اللہ کا اجر چاہتے ہو، انھوں نے کہا، جی ہاں! تب آپ ﷺ نے فرمایا: **''فارجع الی والدیک واحسن صحبتھما''** اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ [1]

نبی ﷺ سے کسی نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند کونسا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وقت پر نماز ادا کرنا، سائل نے پوچھا پھر کونسا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ والدین کی فرماں برداری کرنا، سائل نے پھر پوچھا، پھر کونسا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر جہاد فی سبیل اللہ۔ [2]

والدین میں بھی زیادہ حق اللہ نے ماں کا رکھا ہے، ماں کی مامتا اور شفقت باپ سے زیادہ ہے، بچہ کی پیدائش، پرورش اور خدمت کے سلسلہ میں باپ کے مقابلہ میں ماں کو زیادہ محنت ومشقت سے کام لینا پڑتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ماں کا حق

---

[1] مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب برالوالدین

[2] الادب المفرد، باب وصینا الانسان بوالدیہ حسنا

بھی باپ سے زیادہ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهُ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ. (لقمان-۱۴)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے، (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تیری ماں، اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تیری ماں، اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تیرا باپ۔[۱]

والدین کی خدمت اور ان سے حسن سلوک ہر حال میں واجب ہے، اگر والدین مشرک اور ملحد ہوں تب بھی ان سے حسن سلوک کرنا چاہیے، البتہ اگر والدین اپنی اولاد کو اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو اس معاملہ میں ان کی فرماں برداری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ خالق حقیقی اللہ ہے اور اللہ کی نافرمانی کسی حال میں اور کسی کے کہنے سے جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.[۲]

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں۔

قرآن پاک میں مسلمانوں کو صاف صاف ہدایت کردی گئی ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ

۱؎ مسلم، کتاب البرّ والصلۃ، باب برّ الوالدین ۔ بخاری، کتاب الأدب، باب من احق الناس بحسن الصحبۃ

۲؎ بخاری، کتاب الاحکام

فَلاَ تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (لقمان-۱۵)

اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا، تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔

ماں باپ کا حق ان کے مرنے کے بعد بھی اولاد پر باقی رہتا ہے، قبیلہ بنی سلمہ کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا، اے اللہ کے رسول کیا میرے والدین کے مرنے کے بعد بھی ان کی فرماں برداری کا حق ہم پر واجب ہے جسے ہم پورا کریں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں! ان کی نماز جنازہ پڑھو، ان کے لیے دعاء مغفرت کرو، ان کے وعدے پورا کرو، ان کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو اور ان کے دوستوں کا اکرام کرو۔[1]

والدین کے بعد رشتہ داروں اور عزیزوں کا حق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ ہر انسان رشتوں، ناطوں اور تعلقات کے دائرہ میں گھرا ہوا ہے اور اسی سے انسانی سماج وجود میں آتا ہے، جن لوگوں سے خون کا رشتہ ہے اس رشتہ کا لحاظ کرنا اور ان رشتہ داروں کا اکرام کرنا انسانیت کا تقاضا ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیم ہے، قرآن پاک میں ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا. (بنی اسرائیل-۲۶)

رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق اور فضول خرچی نہ کرو۔

رشتہ داروں کا ایک حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے، یعنی ان سے رشتہ داری نبھائی جائے، اس رشتہ کو کمزور نہ کیا جائے اور نہ رشتہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب،

داری ختم کی جائے، اہل ایمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ. (الرعد-۲۱)

ان کی روش یہ ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں۔ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔

سب سے اچھا انسان وہ ہے جو صلہ رحمی کرتا ہے اور سب سے برا انسان وہ ہے جو قطع رحمی کرتا ہے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ جو کچھ تو نے کہا ہے اگر یہ سچ ہے تو تم ان کے منہ پر راکھ ملتے ہو، جب تک تمہارا یہ عمل جاری رہے گا اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔ [۱]

رشتہ داروں کا لحاظ کرنا رزق میں کشادگی اور عمر میں برکت کا ذریعہ ہے، چنانچہ رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں:

من احب ان یبسط لہ فی رزقہ وینسا لہ فی اثرہ فلیصل رحمہٗ. [۲]

جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور اس کی عمر دراز ہو وہ صلہ رحمی کرے۔

رشتہ داروں کا دوسرا حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ ان کی خدمت کی جائے، ان کی ضرورت پوری کی جائے اور ان کی مالی مدد کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو والدین اور رشتہ داروں کی خدمت کی توفیق دے۔ (آمین)

---

[۱] مسلم، کتاب البر والصلۃ والأدب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتہا
[۲] ایضاً

عورتوں سے حسن سلوک

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا، وَلاَ تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ، اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (النساء-۱۹)

اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بد چلنی کی مرتکب ہوں اور ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔

انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ کی بنیاد مرد و عورت کے پاکیزہ تعلقات پر ہے، اگر یہ تعلقات خوش گوار ہیں تو خاندان میں نظم وضبط اور استحکام ہے اور اگر ان تعلقات میں ناخوش گواری اور کھینچ تان ہے تو خاندان پریشان اور برباد ہے۔ تعمیر و ترقی سے محروم اور اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کو یکساں اہمیت دی ہے اور دونوں کو مناسب ذمہ داریوں کا متحمل بنایا ہے، مرد کو بال بچوں کے نان نفقہ اور تعلیم و تربیت کا ذمہ دار بنایا ہے اور عورت کو گھر کی حفاظت اور بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا ذمہ دار بنایا ہے، یہ دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہوں گے۔ رسول پاک فرماتے ہیں:

الرجل راع علی اهل بیته والمراة راعیة علی اهل بیت زوجها وولده فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته۔[۱]

مرد اپنے اہل خانہ کا نگراں ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی نگراں ہے، تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اپنی نگرانی کے سلسلہ میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو ایک دوسرے کی تکمیل وتسکین کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور دونوں کے حقوق ایک دوسرے پر مقرر کیے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ. (البقرہ-۲۲۸)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔

میاں بیوی دونوں کو برابر کے حقوق اور فرائض کا ذمہ دار قرار دینے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے شوہر کو بیوی پر معمولی فضیلت عطا کی ہے اور اس کی وجہ بھی دوسری آیت میں واضح کی ہے کہ مرد پر بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری ہے اور فطری بات ہے کہ کفیل اور ذمہ دار کو زیر کفالت افراد پر برتری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء-۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

شوہر اگر گھر کا نگراں اور منیجر ہے تو اسے گھر کے مسائل کو اہل خانہ کے مشورہ سے حل کرنا چاہیے، ڈکٹیٹر بن کر حکم نہیں چلانا چاہیے، گھر کے لوگوں کی عزت واحترام کرنا چاہیے اور ان کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے پابندی

---

[۱] بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

کرنی چاہیے۔ اسلام سے پہلے عرب کے سماج میں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں عورتوں کو عزت واحترام کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، ان سے بدسلوکی کی جاتی تھی، ان پر ظلم کیا جاتا تھا اور ان کے مال و جان پر ناجائز قبضہ جمایا جاتا تھا، اسلام نے جاہلیت کے اس غیر انسانی عمل کو ختم کر دیا، اور عورتوں کو یکساں عزت و احترام کا مستحق قرار دیا، خاص طور پر بیوی کی عزت و اکرام کو بہت پاکیزہ اور بلند مرتبہ تک پہونچادیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید کی۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کی عزت وتکریم کو مردوں کی شرافت کا معیار بنایا ہے۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

خیر کم خیر کم لاهله و انا خیر کم لاهلی. [۱]

تم سے بہترین انسان وہ ہے جو اپنی فیملی کے لیے بہتر ہو اور میں تم لوگوں میں اپنی فیملی کے لیے سب سے زیادہ بہتر ہوں۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

ان من اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا وخیار کم خیار کم لنساء هم. [۲]

مومنوں میں سب سے کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہو اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے سلسلہ میں بہتر ہیں۔

آپ نے دیکھا اور سنا ہوگا کہ بہت سے لوگ جو باہر کی دنیا میں، مجلسوں میں، دفتروں میں بہت مہذب شریف اور باوقار نظر آتے ہیں، جب اپنے گھر میں جاتے ہیں تو بیوی بچوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، ان کے حق میں ظالم اور سفاک ہو جاتے ہیں، بہت سے بظاہر دیندار بھی یہی حرکت کرتے ہیں یہ سب جاہلیت کی عادتیں ہیں

---

[۱] ترمذی، ابواب المناقب

[۲] ترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی استکمال الایمان

جن کو اسلام ختم کرنے کے لیے آیا تھا۔

حضرت ایاس بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو یہ کہہ کر بیوی کو مارنے سے منع فرمایا: "لاتضربوا اماء الله" اللہ کی بندیوں کو نہ مارو، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے عورتیں اپنے شوہروں پر جری ہوگئی ہیں اور ان کی تادیب کی اجازت چاہی، حضورؐ نے اجازت دے دی، پھر تو بہت سی عورتیں حضور ﷺ کے گھر آئیں اور اپنے شوہروں کی بدسلوکی کا شکوہ کرنے لگیں تب نبی ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

لقد طاف بآل بیت محمد نساء کثیر یشکون ازواجهن لیس اولئک بخیارکم. [1]

بہت سی عورتوں نے محمد ﷺ کے گھر کا چکر لگایا، یہ عورتیں اپنے شوہروں کی بدسلوکی کا شکوہ کررہی تھیں، ان سے بدسلوکی کرنے والے تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں بھی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی خصوصی تاکید کی تھی، آپ نے فرمایا تھا:

اتقوا لله فی النساء فانهن عوان فی ایدیکم اخذتموهن بامانة الله واستحللتم فروجهن بکلمة الله. [2]

عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو اس لیے کہ وہ تمہارے پاس اللہ کی امانت ہیں تم نے ان کو اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے اور ان کی شرمگاہیں تم پر اللہ کے کلمہ کی وجہ سے حلال ہوئی ہیں۔

دینی تعلیم اور شرافت کی کمی کی وجہ سے آج بھی بہت سے مسلمان اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کررہے ہیں، بہت سے شوہر اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتے اور گناہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء
[2] مسلم، کتاب الحج

کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، بہت سے شوہر اپنی بیوی کا نان ونفقہ نہیں دیتے، بہت سے شوہر بیوی کو میکے چھوڑ آتے ہیں، بہت سے شوہر مدتوں ان سے نہیں ملتے، نہ ان کو رکھتے ہیں اور نہ آزاد کرتے ہیں بلکہ معلقہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں، بہت سے شوہر جوانی میں ان سے استفادہ کرتے ہیں اور جب ان کی عمر ڈھلتی ہے یا وہ بیمار ہوتی ہیں تو ان سے بے توجہی برتتے ہیں، یہ سب حرکتیں انسانیت سے گری ہوئی ہیں اور اسلامی تعلیمات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ایک ساتھ رہنے سہنے سے بعض تکلیفیں بھی ہوتی ہیں، بعض باتیں ناموافق بھی ہوتی ہیں اور بعض عادتیں ناپسندیدہ بھی ہو سکتی ہیں۔اللہ کا حکم یہ ہے کہ ان چیزوں پر صبر کرو اور حکمت سے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرو، جہاں تک اصلاح کی گنجائش ہو، ایسا نہ ہو کہ ان سے نفرت کرنے لگو اور وہ سلوک اپناؤ جو تمہاری غیرت اور شرافت کو داغ دار کر دے۔رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لا یفرک مومن مومنة ان کره منها خلقا رضی منها آخر[1]

کوئی مومن مرد کسی مومنہ بیوی سے نفرت نہ کرے اگر وہ اس کی بعض عادتوں کو ناپسند کرتا ہے تو اس کی دوسری عادتوں سے وہ خوش بھی ہوتا ہے۔

بیویوں کی کمزوری کو نظر انداز کرنا اور ان پر سختی نہ کرنا بلکہ مہربانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا مہذب انسان اور مہذب معاشرہ کی پہچان ہے۔اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا لباس قرار دیا ہے۔ارشاد ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ-۱۸۷)

عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

لباس کی تین اہم خوبیاں ہیں (۱) انسان کے جسم کی حفاظت کرتا ہے (۲) پردہ پوشی کرتا ہے (۳) زینت اور راحت ہے۔ٹھیک اسی طرح مرد و عورت ایک

---

[1] مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء

دوسرے کے محافظ ہیں، پردہ پوش ہیں اور زینت اور راحت ہیں۔ بہت سے مرد ایسے ہیں جو وراثت میں عورتوں کو ان کا جائز حق نہیں دیتے۔ عورتوں کی یہ حق تلفی شوہروں کے بجائے ان کے والدین اور بھائیوں کی طرف سے ہوتی ہے، بہت سے والدین اپنی زندگی ہی میں اپنی دولت بیٹوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور بیٹیوں کو برائے نام کچھ دیتے ہیں یا جہیز میں سامان دینے کا بہانہ بنا کر اسے محروم کر دیتے ہیں، بہت سے بھائی ایسے ہیں جو ماں باپ کا ترکہ خود ہڑپ کر لیتے ہیں اور بہنوں کو کچھ نہیں دیتے، حالاں کہ وراثت میں عورتوں کا حصہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ انسانوں کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ان سے چھین لیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا. (النساء-۷)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ مقرر ہے۔

جو لوگ عورتوں کا حق وراثت چھین لیتے ہیں، ان کو مال و جائیداد میں حصہ نہیں دیتے، اس حصہ سے ان کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کسی دوسرے کی زمین جائداد پر قبضہ کر لیا جائے، جس طرح اس کی آمدنی حلال نہیں ہوتی اس طرح اس کی آمدنی بھی درست نہیں ہوگی۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ خواتین کی عزت وتکریم کریں اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں اسلامی احکام کا پاس ولحاظ کریں اور اسلامی معاشرہ کو بدنامی اور ذلت سے بچائیں، اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

اولاد کی تربیت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ. (الطّور-۲۱)

جولوگ ایمان لائے ہیں اوان کی اولاد کسی درجۂ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملادیں گے اوران کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنی کمائی کے عوض رہن ہے۔

ہر جاندار کو اللہ تعالیٰ نے دو فطری خواہشات عطا کی ہیں ایک تو جینے کی خواہش اور دوسری اولاد کی خواہش، انسان میں یہ خواہشیں دوسرے جاندار سے کچھ زیادہ ہی قوی درجہ میں پائی جاتی ہیں۔ انسان اور دوسرے جاندار میں فرق یہ ہے کہ دوسرے جاندار صرف افزائش نسل کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، ان کو روزی حاصل کرنے اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کے فطری طریقے سکھاتے ہیں، مگران کی تعلیم وتربیت اور ترقی کرنے کے طریقے نہیں سکھاتے، کیونکہ وہ خودان نعمتوں سے محروم ہیں۔ مگر انسان کو قدرت نے اشرف المخلوق بنایا ہے، اس کو عقل وفہم، ضمیر، روحانیت جیسی نعمتوں سے نوازا ہے، اس لیے وہ صرف اولاد کی خواہش ہی نہیں رکھتے، اولاد کو دنیاداری کے طریقے ہی نہیں بتاتے بلکہ ان کی تعلیم وتربیت بھی کرتے ہیں۔

تعمیر وترقی، اخلاقی برتری اور روحانی صلاحیت میں آگے بڑھانے کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔
جانوروں کو اللہ نے صرف جسمانی زندگی عطا کی ہے، اس لیے وہ اس زندگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ نے جسمانی اور روحانی دونوں زندگی عطا کی ہے اس لیے اس پر دونوں تقاضے پورے کرنے کی ذمہ داری ہے۔

انسانی سماج کا کونسا جوڑا ایسا ہے جو اولاد کی تمنا نہیں کرتا اور اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ جتن نہیں کرتا، مگر جب اولاد ملتی ہے تو بہت کم لوگ اولاد کی تعلیمی، اخلاقی اور دینی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں۔ بہت سے لوگ بچوں کو پیدا کرتے ہیں مگر ان کو سماج اور ماحول پر بوجھ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں، ان کی پرورش پر بھی توجہ نہیں دیتے، بہت سے والدین اپنے بچوں کی پرورش پر دھیان دیتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دیتے، بہت سے والدین بچوں کی صرف عصری تعلیم پر دھیان دیتے ہیں جو ان کو مادی اور سماجی ترقی عطا کرے، دینی اور اخلاقی تربیت سے ان کو محروم رکھتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے والدین ہمارے سماج میں بکثرت موجود ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو حقیقی اسلامی شخصیت، اسلامی معاشرہ اور اسلامی ماحول کہاں سے وجود میں آئے؟ نبی پاک ﷺ نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے "**اکرموا اولادکم واحسنوا ادبھم**" [۱] اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کو ادب تمیز سکھاؤ۔

بے شعوری کے زمانہ میں ماں باپ جو ماحول اور تربیت اسے دیتے ہیں وہی بچہ کی بنیاد بن جاتی ہے اور زندگی بھر اس کے سہارے وہ زندگی گذارتا ہے، چنانچہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے:

کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھودانہ او ینصّرانہ او یمجّسانہ۔ [۲]

ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یا

---

[۱] ابن ماجہ، ابواب الأدب، باب برّ الوالد والاحسان الی البنات
[۲] بخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین

یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

صرف صاحبِ اولاد ہونا والدین کی خواہش اور ضرورت کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ نیک اور صالح اولاد کا ہونا والدین کی خوش بختی کے لیے ضروری ہے ۔ چنانچہ مومن کا شعار یہ ہے کہ وہ صرف اولاد کی دعا نہیں کرتا بلکہ صالح اولاد کی دعا کرتا ہے، کیونکہ وہی اس کی آنکھ کا نور ہے۔ قرآن میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان-۷۴)

وہ لوگ دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔

اولاد اگر صالح ہو تو ماں باپ کے لیے دنیا میں بھی نیک نامی اور نیک بختی کا ذریعہ ہے اور مرنے کے بعد آخرت میں بھی والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہے، چنانچہ سورۃ الطّور کی آیت میں اسی سعادت کا ذکر ہے۔ رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوا له.[1]

انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے تین اعمال کے (۱) ایسا صدقہ جس کا فیض جاری رہے۔ (۲) ایسا علم جس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں (۳) ایسی نیک اولاد جو والدین کے لیے دعا کرتی رہے۔

اگر اولاد نالائق اور بد ہو تو دنیا میں بھی بدنامی کا ذریعہ ہے اور آخرت میں بھی رسوائی کا ذریعہ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے

---

[1] مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ

کہ وہ اپنی نجات کے ساتھ اولاد کی نجات کی بھی فکر کرے اور ان کو بھی صالح بنانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ . (التحریم-۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

والدین اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں وہ ان کی خوشی اور راحت کا خیال رکھتے ہیں، ان کا دل بہلانے کا سامان کرتے ہیں، ان کو پیسے اور تحفے دیتے ہیں، مگر اسلام کی نظر میں اچھے والدین وہ ہیں جو اپنے بچوں کو اچھی تعلیم اور عمدہ تربیت عطا کرتے ہیں۔ اچھی تعلیم سے زیادہ بہتر تحفہ اولاد کے لیے کوئی اور نہیں ہوسکتا، کیونکہ جتنے تحفے مادی ہیں وہ سب ختم ہونے والے ہیں، ان کے برباد ہونے، چوری ہونے اور گم ہوجانے کا خطرہ ہے، مگر عمدہ تعلیم وتربیت کے برباد ہونے، ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، اسی لیے رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے۔

مانحل والد ولده من افضل ادب .[۱]

باپ اپنے بچے کو اچھی تربیت سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دے سکتا۔

اولاد کی تعلیم وتربیت صرف اولاد ہی کے لیے بہترین تحفہ نہیں بلکہ سماج اور معاشرہ کے لیے بھی عطیہ ہے، والدین کی تعلیم وتربیت سے بچے شریف اور صالح ہوں گے تو سماج کے لوگوں کے لیے راحت، تعاون اور امن وسکون کا ذریعہ ثابت ہوں گے، ورنہ دوسروں کے لیے باعث تکلیف بنیں گے اور اپنی حرکتوں سے سماج کی مشکلات میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسی لیے تو نبی پاک ﷺ نے صدقہ وخیرات کرنے سے بہتر اپنے بچوں کی تربیت کو قرار دیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

۱ ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ

لان یودب احدکم ولدہ خیر لہ من ان یتصدق بصاع[1]

تم میں سے کوئی اپنی اولاد کی تربیت کرے یہ ایک صاع صدقہ کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

صدقہ انسان دوسروں کی مدد کے لیے اور ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کرتا ہے، اولاد اگر تربیت یافتہ مہذب اور نیک ہو تو یہ بھی سماج کی راحت رسانی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ وخیرات کا جو ثواب عطا کرتا ہے اس سے زیادہ ثواب بچوں کی تعلیم وتربیت کا عطا کرتا ہے۔

اولاد کے بارے میں ہمہ جہت تربیت اور پوری شخصیت کی نشو ونما کا خیال رکھنا ضروری ہے، وہ تعلیم بھی ضروری ہے جس کی باعزت زندگی گذارنے کے لیے کسی بھی ملک اور کسی بھی عہد میں ضرورت ہے اور وہ تعلیم بھی ضروری ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی واقفیت ہو، دین کا شعور حاصل ہو اور آخرت میں نجات آسان ہو، ان دونوں تعلیم کے علاوہ ایسی تربیت ضروری ہے جس سے شرافت تمیز، تہذیب، سلیقہ، ادب، بڑوں کا احترام چھوٹوں سے شفقت، بھلے برے کی پہچان، ضرورت مندوں کی مدد، بہادری، امانت اور غیرت وحمیّت بچوں کے اندر پیدا ہوتی ہو۔

آج کے والدین تعلیم وتربیت میں سارا زور لڑکوں کی تعلیم وتربیت پر دیتے ہیں، ان کے لیے سارے جتن کرتے ہیں، پیسے خرچ کرتے ہیں اور ان کی ساری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں پر کم توجہ دیتے ہیں، ان کی تعلیم وتربیت سے غفلت برتتے ہیں۔ گاؤں، دیہات میں تو ان کو تعلیم دینا بھی بہت سے لوگ ضروری نہیں سمجھتے، بیٹے اور بیٹیوں کی تعلیم وتربیت میں یہ تفریق اسلام کی

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ

تعلیم کے خلاف ہے، ایسا کرنے والے لوگ گنہگار ہیں، اللہ کے یہاں ان کو اپنے اس مجرمانہ عمل کا جواب دینا ہوگا۔ حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے سچ کہا تھا کہ ؎

تعلیم لڑکیوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے

نبی علیہ السلام نے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا حکم دیا ہے:

"من کانت لہ انثی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یوثر ولدہ علیھا ادخلہ اللہ الجنۃ" [1]

"جس شخص کے پاس بیٹی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے، نہ اس کی توہین کرے اور نہ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا کرے گا۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر زیادہ توجہ دینے کا حکم فرمایا ہے۔ صحاح ستہ اور حدیث کی معتبر کتابوں میں متعدد احادیث لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی فضیلت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کی حکمت یہ ہے لڑکیاں تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوں گی اور تو نئی نسل تعلیم وتربیت پائے گی کیونکہ ماں کی گود بچہ کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔

اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیجیے، ان کے ساتھ وقت دیجئے، ان پر محنت کیجئے اور ان کو اپنے لیے آخرت کا سرمایہ بنایئے، آپ کی غفلت صرف آپ کے بچوں کا مستقبل برباد نہیں کرے گی بلکہ آپ کی آخرت بھی تباہ کرے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب

معذوروں سے حسن سلوک

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَ ہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّایَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَ کَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ (العبس)

ترش روہوئے اور منہ پھیر لیا کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا، جو پروانہیں کرتا اس کی طرف تو تم نے توجہ کی، حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کوئی الزام نہیں اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ خدا سے ڈرتا ہے اس سے تم بے رخی کرتے ہو قرآن ایک نصیحت ہے جو چاہے اسے یاد کرلے۔

اس سورہ کا شان نزول یہ ہے کہ:

ایک مرتبہ آخری رسول محمد ﷺ مکہ کے سردار سے باتیں کررہے تھے اور اسے اسلام کی دعوت پہونچارہے تھے مگر وہ دعوت قبول کرنے اور اپنی انا اور جھوٹی شہرت کو ترک کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسی دوران ایک نابینا صحابی جن کا نام عبداللہ بن ام مکتوم تھا وہاں آگئے اور اس گفتگو میں مخل ہوئے۔ نبی پاک ﷺ انکی ناوقت آمد اور

مداخلت سے خوش نہیں ہوئے، آپ چاہتے تھے کہ سردار قریش سے بات چیت اپنے منطقی نتیجہ تک پہونچ جائے۔ فرق اتنا تھا کہ آپ جس کو نصیحت فرما رہے تھے وہ آپ کی بات ماننے پر آمادہ نہ تھا اور جو نابینا آپ کے پاس آیا تھا وہ آپ کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنا چاہتا تھا۔ اس نابینا سے آپ نے اعراض کیا اور منہ پھیر لیا، یہ اگر چہ فطری اور انسانی ردعمل تھا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات پر رسول پاک ﷺ کو متنبہ کیا اور سورہ عبس نازل ہوئی۔

اس آیت میں اگر چہ رسول پاک ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے مگر عتاب اس سردار قریش پر ہے جس کو سمجھانے کے لیے آپ نے نابینا صحابی کو نظر انداز کیا تھا، مگر اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ اس نابینا صحابیؓ کا بہت اکرام واحترام کرنے لگے، بلکہ ہر معذور کے بارے میں آپ کا رویہ احترام و ہمدردی کا ہوتا تھا، شاید اسی وجہ سے اسلامی تاریخ میں معذوروں کے ساتھ حسن سلوک ایک اچھی روایت بن گئی، حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے زمانہ خلافت میں ایک اندھی بوڑھی عورت کی خود جا کر خدمت کرتے تھے اور یہی خدمت خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ بھی انجام دیا کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ اپنے ملک کے عالم ابو معاویہ الضریر کو کھانے کی دعوت دی وہ نابینا تھے، خلیفہ نے خود ان کا ہاتھ دھلایا اور پوچھا کہ کون آپ کا ہاتھ دھلا رہا ہے؟ انھوں نے کہا، خلیفہ علم کی قدر کر رہے ہیں۔

معذوروں سے ہمدردی اور ان کی خیر خواہی انسانی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور سماجی ضرورت بھی، جب ہم کسی معذور شخص کو دیکھتے ہیں تو فطری طور پر ہمارے اندر اس کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ صرف دلی ہمدردی یا زبانی خیر خواہی تک رہ جائے تو اس کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں، ضرورت ہے کہ ہمدردی کا یہ جذبہ عمل اور حسن سلوک میں ڈھل کر معذوروں کی مدد اور تعاون کا ذریعہ بنے، رسول پاک ﷺ نے فرمایا: **الخلق عیال اللہ فاحب الخلق**

الی اللہ من احسن الی عیالہ[۱] مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، تم میں سے اللہ کو وہی بندے پسند ہیں جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ تعاون اور حسن سلوک معذور حضرات کے ساتھ دینی فریضہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ایک تیسری چیز بھی ضروری ہے اور وہ ہے معذوروں کے عذر کی رعایت کرتے ہوئے ان کو صحت مند لوگوں پر ترجیح دینا اور کم از کم مساوی حقوق و مراعات عطا کرنا۔ تاکہ وہ سماج کے دوسرے صحت مند افراد کے شانہ بشانہ تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں۔ قرآن کریم میں بھی معذوروں کو کچھ زیادہ مراعات دینے کی ہمت افزائی کی گئی ہے، ارشاد ہے:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ آبَآئِكُمْ (النور-۶۱)

کوئی حرج نہیں کہ اندھا یا لنگڑا یا مریض کسی کے گھر سے کھالے اور نہ تم پر کوئی حرج ہے کہ اپنے گھروں سے یا ماں باپ اور رشتہ داروں کے گھروں سے کھاؤ۔

قرآن نے معذوروں کو زیادہ مراعات دینے کی جو تعلیم دی ہے اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ان کے لیے مختلف میدان زندگی میں تخصص اور تحفظ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے، یعنی ان کے لیے مزید مواقع فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ مقابلوں کی اس دنیا میں اگر اپنی مجبوری کے باعث وہ کامیاب نہ ہوسکیں تو ان کو تحفظ اور مراعات دے کر کامیابی کی طرف لایا جاسکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال خود عبداللہ بن ام مکتومؓ کی ہے جن کے بارے میں سورہ عبس کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، ان کو اسلامی معاشرہ میں عزت واحترام کی جو خصوصی مراعات دی گئیں ان کے نتیجہ میں وہ مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے۔

---

[۱] مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق

اسلام نے ایک انوکھی تعلیم یہ دی ہے کہ صحت مند لوگوں کو اللہ تعالیٰ کمزوروں کے صدقہ میں رزق دیتا ہے۔ انما ترزقون لضعفائکم عام طور پر مالداری اور خوش حالی کو ہم اپنی محنت وذہانت کا ثمرہ سمجھتے ہیں مگر رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ معذوروں اور کمزوروں کا صدقہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے، اللہ کی نعمتوں میں ان کا حق تسلیم کرنا چاہیے اور ان کو اپنی زندگی بہتر بنانے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو حضرات کسی وجہ سے معذور ہیں ان کی دوسری صلاحیتیں زیادہ کارگر بن جاتی ہیں۔ وہ اگر ایک جگہ معذور ہیں تو دوسری جگہ صحت مند لوگوں سے زیادہ موثر اور فعال ثابت ہوتے ہیں۔ قدرت نے تلافی کا قانون اسی لیے رکھا ہے، تا کہ محرومیوں کے بادل سے صلاحیتوں کا سورج ابھر سکے۔ آپ کسی نابینا کو دیکھیے، قدرت اگر اسے بصارت سے محروم کرتی ہے تو ذہانت سے مالا مال کر دیتی ہے، ایک نابینا آپ کو دیکھ نہیں سکتا مگر آپ کی آواز سن کر ہمیشہ کے لیے آپ کو یاد رکھتا ہے، آپ اس سے کوئی معاملہ کیجیے، کوئی حوالہ دیجیے شاید وہ معاملہ آپ کے ذہن سے محو ہو جائے گا، مگر اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔

اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ معذوروں کی مخفی صلاحیتوں کو ابھارنے اور بروئے کار لانے کے لیے پروگرام بنائے، معذروں کی ہمت افزائی کرے، کیونکہ وہ بالکلیہ معذور نہیں ہیں، وہ بھی کچھ کر سکتے ہیں، اگر ایک میدان میں نہیں تو دوسرے میدان میں کر سکتے ہیں۔ تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ یونان کے شہر ایتھنز کا ایک زبردست خطیب تھا جس نے اپنے زور خطابت سے اپنے شہریوں کو آزادی دلائی۔ بچپن میں اس کی زبان میں لکنت تھی وہ دریا کے کنارے جاتا اور منہ میں کنکر ڈال کر بولنا شروع کرتا اور دریا کے شور میں اپنی آواز ملاتا۔ ایک وقت آیا کہ اس کی نہ صرف لکنت دور ہوئی بلکہ بڑا خطیب بن گیا، یونان ہی کا مشہور شاعر

ہومر جس کی شاعری مغربی کلاسیکی ادبیات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، وہ نابینا تھا مگر اس کی ادبی تخلیق مغربی ادیبوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلامی دنیا میں حضرت قتادہ م ۱۱۸ھ مشہور تابعی اور فن تفسیر میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے تفسیری اقوال کو ہر عہد میں اہمیت حاصل رہی ہے وہ آنکھوں سے معذور تھے، حضرت قتادہ کا یہ قول مشہور ہے کہ میں نے کسی محدث سے دوبارہ حدیث بیان کرنے کی فرمائش نہیں کی۔ بصارت سے محرومی فن تفسیر کی قیادت میں حائل نہیں ہوئی۔

علامہ جار اللہ زمخشری م ۵۰۵ھ جنھوں نے قرآن کریم کی عظیم الشان تفسیر ''الکشاف عن حقائق التنزیل'' کے نام سے لکھی وہ پاؤں سے معذور تھے مگر انھوں نے نحو، صرف اور بلاغت میں اپنی صلاحیتوں کا اس طرح استعمال کیا کہ وہ اس فن کے امام بن گئے۔

علم قراءت کے مشہور امام ابو محمد قاسم شاطبی اندلسی م ۵۹۰ھ بھی نابینا تھے، مگر علم قراءت پر انکی تصانیف سے آج کا کوئی قاری اور علم قراءت کا کوئی عالم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف قراءت ہی کے امام نہ تھے بلکہ صرف ونحو اور لغت کے بھی امام تھے۔

فن حدیث کے امام حافظ علامہ ابو عمر حفص م ۲۳۰ھ بھی نابینا تھے۔ علم حدیث میں ان کا مقام ومرتبہ یہ ہے کہ وہ مشہور محدثین مثلاً امام ابوداؤد اور ابوزرعہ وغیرہما کے استاذ ہیں، حدیث کے علاوہ فقہ، حساب اور تاریخ وادبیات کے بھی ماہر تھے۔

فقہ شافعی کے برگزیدہ عالم زبیر بصری م ۳۲۰ھ فقہ، حدیث ادب کے استاذ تھے، کتاب الہدایۃ اور کتاب الامارۃ جیسی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، آنکھوں سے معذور تھے۔ اسلامی تاریخ میں ان معذور حضرات کی طویل فہرست ہے جنھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، شاعری، لغت، حساب اور سماجیات کی گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہیں۔

اس وقت پوری دنیا میں نصف بلین سے زیادہ معذور افراد پائے جاتے ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان معذوروں کی ۸۰ فیصد تعداد ترقی پذیر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ صرف ہندوستان میں دو کروڑ سے زیادہ معذور افراد موجود ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں صحت وتندرستی کے اصولوں سے لاپرواہی اور احتیاطی تدابیر سے غفلت برتی جاتی ہے، اسی وجہ سے یہاں معذوروں کا تناسب ترقی یافتہ ممالک سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ ان معذوروں میں ہاتھ پاؤں، آنکھ کان یعنی اعضا و جوارح کے معذور بھی ہیں اور ذہنی و دماغی معذور بھی ہیں، پیدائشی معذور بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو کسی حادثہ اور بیماری کا شکار ہوکر معذور ہوئے اور وہ بھی جو جنگوں، فسادات اور باہمی جھگڑوں میں معذور ہو گئے۔

یہ تو ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں صرف صحت ہو بیماری نہ ہو، تندرستی ہو، معذوری نہ ہو، خوشی ہو غم نہ ہو، کیونکہ حادثات سے چھٹکارا نہیں۔ مگر انسان کے اختیار میں یہ تو ہے کہ معذوروں کی شرح کو کم کرسکتا ہے۔ حفاظتی تدابیر اختیار کر کے بھی اور علاج و تدارک کے ذریعہ بھی۔ اس کے باوجود جو لوگ معذور بن گئے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کا اٹوٹ حصہ ہیں، وہ یکساں طور پر ہماری ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہیں، بلکہ تندرست حضرات سے زیادہ توجہ، ہمدردی، خیر خواہی اور تعاون ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

شرم وحیا اور پاک دامنی

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القرانِ المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ (النور:۳۱-۳۰)

اے نبی مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ اور اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔

اسلام نے شرم وحیا کو انسان کا زیور قرار دیا ہے، عفت وعصمت، پاکدامنی اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کو انسانی معاشرہ کا فریضہ قرار دیا ہے۔ پاکدامنی اسلامی تہذیب کی جان اور اسلامی معاشرہ کی پہچان ہے۔ جس شخص اور جس سماج میں شرم و حیا نہ ہو وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے، شیطان اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور اللہ کے غضب کا وہ مستحق بن جاتا ہے۔ دو چیزیں انسان کو سب سے زیادہ برباد کرتی ہیں، ایک حرام خوری اور دوسری حرام کاری۔ اسی لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

کہ اگر تم دو چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دو تو میں تمھیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں ایک وہ جو تمہارے دو جبڑوں کے بیچ ہے یعنی زبان اور دوسری وہ جو تمہاری دو رانوں کے بیچ ہے یعنی شرمگاہ۔[۱]

بے حیائی اور بدکاری کو اسلام نے سختی سے روکا ہے اور فرد اور معاشرہ کی پاکیزگی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ (الاعراف-۳۳)

آپ کہہ دیجیے کہ میرے رب نے حرام کیا ہے بے شرمی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسان کا سب سے گھناؤنا جرم زنا کاری ہے، خواہ زبردستی کسی کی عزت لوٹی جائے یا باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے، دونوں حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِیْلًا۔ (بنی اسرائیل-۳۲)

اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو بے شک زنا بدکاری ہے اور برا راستہ ہے۔

زنا جیسی سنگین اور گھناؤنی برائی ہے اسی لحاظ سے شریعت نے اس کی سزا بھی سخت اور عبرت ناک مقرر کی ہے یعنی غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے رجم کی سزا رکھی ہے۔ یہ تو دنیا میں اس کی سزا ہے، آخرت میں اس کی سزا جہنم کا رسوا کن عذاب ہے، جیسا کہ معراج کے سفر میں رسول پاک نے زنا کرنے والوں کو آگ کے کنویں میں دیکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے جہنم کی یہ عبرت ناک سزا زنا کرنے والوں کی لیے مقرر کی ہے، حالانکہ یہ سزا تو کافروں اور مشرکوں کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک اور بدکاری دونوں میں ایک گندگی مشترک ہے، شرک عقیدہ کی گندگی ہے اور زنا کردار کی گندگی ہے، شرک ایمان کا زبان و دل سے انکار ہے اور زنا کاری ایمان کی عملاً نفی ہے، چنانچہ

[۱] مسند احمد ۵/۳۲۳

رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ:

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔[1]

زنا کار جس وقت زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں رہتا۔

عام طور پر زنا کا ارتکاب کوئی یکدم نہیں کرتا، پہلے نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، پھر اپنے دل میں گناہ کا خیال لاتا ہے پھر گفت وشنید کرتا ہے، پھر اس کے لیے عملی تدابیر کرتا ہے اور پھر اپنی عزت وآبرو کا شیشہ توڑ لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے صرف زنا کو حرام نہیں قرار دیا بلکہ زنا کی طرف لے جانے والے راستوں کو بند کیا اور فرمایا ''زنا کے قریب بھی نہ جاؤ'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

آنکھیں زنا کرتی ہیں، ان کا زنا دیکھنا ہے اور ہاتھ زنا کرتے ہیں، ان کا زنا چھونا ہے اور پکڑنا ہے اور پاؤں زنا کرتے ہیں، ان کا زنا اس راستہ پر چلنا ہے، زبان بھی زنا کرتی ہے اس کا زنا بات چیت کرنا ہے اور دل کا زنا خواہش اور شہوت ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔[2]

کتنی بڑی سماجی سچائی اور حکیمانہ بصیرت ہے، رسول پاک کی اس حدیث میں بدکاری کی نفسیات اور اس کے عوامل اور مراحل کو لوگوں کے سامنے واضح کر دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زنا کے ان تمام راستوں کو بند کرنے کے لیے مومنوں کو شرم وحیا اور پاکدامنی کے ایسے احکام دیے ہیں جو ان کی شخصیت اور سیرت کو پاکیزگی اور معاشرہ کو اخلاقی بلندی عطا کرتے ہیں۔ صاحب کردار وہ نہیں ہے جس نے برائی اس وجہ سے نہیں کی کہ اس کو موقع نہ ملا، بلکہ باکردار مومن وہ ہے جس کو بدکاری کا موقع ملا مگر اللہ کے خوف سے اس نے بدکاری نہیں کی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال رہتی دنیا تک کے لیے روشن ہے۔ ان کی مالکہ جو حسن اور دولت کی بھی مالکہ تھی، جب برائی کے لیے بلایا تو آپ نے انکار کر دیا، پاک دامنی کی خاطر جیل کی سزا کاٹی، مگر

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی

[2] مسلم، کتاب القدر، باب قدر علی ابن آدم وحظہ من الزنا

بدکاری کا ارتکاب نہ کیا۔ یہ سارے انسانوں کے لیے نمونہ ہے۔

بدکاری اور بے حیائی سے بچنے کے لیے اسلام کا پہلا حکم شرم وحیا کا احساس اور نگاہ کو نیچی رکھنا ہے، یہ حکم مرد وعورت، لڑکے اور لڑکیاں دونوں کے لیے ہے۔ اگر نگاہ میں شرم وحیا نہیں ہے اور مرد وعورت ایک دوسرے کو دیکھ کر لذت، سرور حاصل کرتے ہیں تو بدکاری میں مبتلا ہونے کا پورا اندیشہ ہے۔ اسی لیے رسول پاک نے حکم دیا ہے:

لا تتبع النظرة النظرة فان لک الاولی ولیست لک الآخرة۔ [1]

کسی عورت کو بار بار نہ دیکھو، پہلی نظر تیری ہے مگر دوسری نظر درست نہیں ہے۔

اس زمانہ میں اخلاق وکردار کی بربادی سب سے زیادہ نظر بازی کی وجہ سے ہے، اسی وجہ سے جملہ بازی، چھیڑ چھاڑ اور غیر اخلاقی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ علامہ ماہر القادری فرماتے ہیں:

شرم و غیرت ہے آبروئے جمال — اے میری شاہد پری تمثال
سر سے آنچل ڈھلک گئے تو کیا — تو مگر دامن نظر کو سنبھال

بدکاری وبے حیائی سے محفوظ رہنے کے لیے دوسرا حکم اسلام نے مرد وعورت دونوں کو یہ دیا ہے کہ اجنبی مرد وعورت تنہائی میں نہ ملیں، کیونکہ جب دو اجنبی مرد وعورت تنہائی میں ہوتے ہیں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے، جو ان دونوں کے دلوں میں برائی کا چنگاری چھوڑتا ہے اور یہی چنگاری شعلہ بن کر دونوں کی عصمت کو جلا دیتی ہے، رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یخلون رجل بامراة إلا ومعها ذو محرم۔ [2]

کوئی مرد کسی عورت سے اس کے محرم کے بغیر تنہائی میں نہ ملے۔

آج کل تجربہ گاہوں میں، ریسرچ کے نام پر تعلیم گاہوں میں، دفتروں میں اور

---

[1] ترمذی، کتاب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی نظرۃ الفجاۃ
[2] مسلم، کتاب الحج، باب سفر المرأۃ مع محرم

کال سینٹرس پرلڑکیوں اورلڑکوں میں تنہائی میں ملنے کا جو ماحول پیدا ہوگیا ہے، اس نے برائی اور بدکاری کی فضا پیدا کردی ہے، اسلام اس کو انسانی شرافت کے منافی قرار دیتا ہے۔

تیسرا حکم اسلام نے یہ دیا ہے کہ شائستہ لباس استعمال کریں، لڑکیاں اور خواتین خاص طور پر ایسا لباس استعمال نہ کریں جس سے جسم کے نشیب وفراز کی نمائش ہو، دوسرے لوگوں میں خواہشات نفس جاگے اور اخلاقی فتنہ وفساد رونما ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب کا سیة فی الدنیا عاریة فی الآخرة [۱] بہت سی عورتیں جو دنیا میں لباس میں ہیں آخرت میں ننگی ہوں گی۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایسا لباس استعمال کیا ہوگا جو ان کے نسوانی حسن کی نمائش کرے، جو پردہ پوشی کے لیے ناکافی ہو، حضرت اسماءؓ سے حضور پاک نے فرمایا کہ: اے اسماء! جب لڑکی بالغ ہو جاتی ہے تو اس کا جسم اس کے چہرہ اور ہتھیلی کے علاوہ ڈھکا رہنا چاہیے۔ [۲]

مغربی تہذیب نے بے پردگی اور عریانیت کو اس طرح پھیلایا ہے کہ مسلمان بھی جو مغربی تہذیب میں ڈوب گئے ہیں اسے معیوب نہیں سمجھتے۔ اپنی لڑکیوں کو اسکرٹ اور ٹی شرٹ قسم کا لباس پہناتے ہیں، اپنی عورتوں کو ایسا لباس پہناتے ہیں جس سے عریانیت جھلکتی ہے۔ سب سے زیادہ بے حیائی ان تعلیم گاہوں میں پائی جاتی ہے جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں، جہاں بے پردگی معیوب نہیں ہے، ماحول میں آوارگی ہے، نگاہوں میں حیا نہیں، دلوں میں غیرت نہیں، بدکاری کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے، کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہ اسلامی غیرت وحمیت کے منافی ہے۔

اسلام نے چوتھا حکم بدکاری و بے حیائی سے حفاظت کے لیے یہ دیا ہے کہ عورتیں اپنی زیب وزینت کا استعمال اپنے گھر میں کریں اور باہر نکلیں تو اپنے حسن اور زینت کی نمائش نہ کریں، اس سے ان کو اطمینان وسکون ملے گا اور بری نگاہ سے محفوظ رہیں گی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[۱] بخاری، کتاب العلم
[۲] سنن ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فیما تبدی المرأة من زینتھا

الرافلة فی الزینة فی غیر اهلها کمثل ظلمة یوم القیمة لانور لها.[1]

نامحرم کے سامنے زیب و زینت کا اظہار کرنے والی اس تاریکی کی طرح ہے قیامت کے دن جس میں روشنی نہ ہوگی۔

ہمارے سماج کی اخلاقی حالت الٹی ہوگئی ہے، جب عورتیں اپنے گھر میں ہوتی ہیں تو زیب وزینت نہیں کرتیں اور اپنے شوہروں کی تسکین کا خیال نہیں کرتیں اور جب شادی بیاہ اور دوسرے سماجی پروگراموں میں جاتی ہیں تو خوب بناؤ سنگار کرتی ہیں جس سے دوسرے مردوں کے دلوں میں فتنہ پیدا ہوتا ہے، اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

بدکاری اور بے حیائی سے محفوظ رہنے کے لیے اسلام نے پانچواں حکم یہ دیا ہے کہ عورتیں اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنی یا چادر ڈال لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا. (الاحزاب-۵۹)

اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔

آجکل، فلموں نے، ٹی وی سیریل نے، فیشن شو اور مقابلہ حسن کی شیطانی تہذیب نے مسلمان گھروں کی پاکیزگی کو چھین لیا ہے۔ شرم وحیا اور پاکدامنی جو شریف گھرانوں اور شریف زادوں کی پہچان تھی اب کم ہوتی جارہی ہے اور اگر باہر کا ماحول آپ کے قابو سے باہر ہے تو کم از کم گھر کے ماحول کی فکر کیجیے ورنہ ایمان وعمل سب کچھ غارت ہونے کا اندیشہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں شرم وحیا اور پاکدامنی سے آراستہ کرے۔ (آمین)

---

[1] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی کراهیة خروج النساء فی الزینة

اسراف اور فضول خرچی

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل-۲۷،۲۶)

رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

مال و دولت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی شکر گذاری اس طرح ہوسکتی ہے کہ انسان اسے اپنی ضروریات اور دوسروں کی امداد میں خرچ کرے اور ناشکری یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یا گناہ اور لغو کاموں میں اسے خرچ کرے اور وہی فضول خرچی ہے جس سے قرآن پاک میں بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے، شیطان کو اللہ نے عقل و فہم کی دولت دی تھی، اس کا استعمال اس نے برے کاموں میں کیا، انسان کو بھٹکانے اور راہ راست سے ہٹانے میں کیا، اللہ نے انسانوں کو جو دولت دی ہے اگر وہ اس کا بے جا استعمال کرے تو یہ شیطانی طریق کار ہے اور اس پر چلنے والا شیطان کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو انفاق کا حکم دیا ہے اور اسراف سے منع کیا ہے، انفاق پر ثواب کا وعدہ کیا ہے اور اسراف پر سزا کی تنبیہ کی ہے، اپنی جائز ضرورتوں کو

پورا کرنا، اپنے بال بچوں کی ضرورت پوری کرنا، رشتہ داروں، ناداروں، محتاجوں، مسافروں کی ضرورت پوری کرنا انفاق ہے اور بلاضرورت خرچ کرنا یا اپنی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، ایسے کاموں میں خرچ کرنا جن میں بے حیائی اور برائی ہو، انسانوں کی گمراہی اور اللہ کی نافرمانی ہو یہ سب فضول خرچی ہے۔

انسانی معیشت کا بڑا انحصار زراعت کاشت کاری، باغبانی اور مویشی پالن پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ایک انعام کے طور پر انسانوں کے حوالہ کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ان سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کا بھی خیال رکھیں، لیکن ہرگز فضول خرچی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. (الانعام-۱۴۱)

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں۔ زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

نبی پاک ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

كلوا واشربوا والبسوا و تصدّقوا في غير اسراف ولا مخيلة[1]

کھاؤ پیو، صدقہ کرو اور پہنو مگر فضول خرچی نہ کرو اور نہ تکبر کرو۔

---

[1] بخاری، کتاب اللباس

اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورت اور زینت دونوں کا لحاظ کرتا ہے، جس طرح انسان کو زندگی کی بنیادی ضروریات، لباس، طعام، مکان، سواری وغیرہ کو حلال طریقہ پوری کرنے کی تاکید کرتا ہے، اسی طرح اسے زینت اختیار کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ اچھا کھاؤ اچھا پہنو، اچھی طرح رہو، اچھی سواری استعمال کرو یعنی زندگی کو صرف گذارنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ زندگی کو سنوارنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. (الاعراف-۳۱)

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فضول خرچی زندگی کے جس معاملہ میں ہو تباہ کن اور گناہ ہے، خواہ کھانے پینے کے معاملہ میں ہو، پہننے اوڑھنے کے معاملہ میں ہو، رہنے سہنے کے معاملہ میں ہو، خوشی اور غم کے معاملہ میں ہو، لین دین کے معاملہ میں ہو یا شادی بیاہ کے معاملہ میں ہو، یہاں تک کہ مذہبی معاملہ میں بھی فضول خرچی کو شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا قرآن میں بڑا مرتبہ بیان کیا گیا ہے اور اس پر جنت کی بشارت دی گئی ہے، مگر انفاق میں بھی اعتدال کا حکم دیا گیا ہے، بخل اور فضول خرچی سے روکا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان-٦٧)

جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ بنی تمیم کا ایک شخص جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میرے پاس بہت مال و دولت اور اہل و عیال ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں کیسے خرچ کروں اور اپنے مال میں کس طرح تصرف کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمہارے مال میں زکوۃ واجب ہے تو زکوۃ ادا کرو، زکوۃ پاکیزگی ہے جو تجھے پاکیزہ بناتی ہے، اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو، پڑوسیوں، مسکینوں اور سائلوں کا حق پہچانو، اس نے کہا اے اللہ کے رسول ذرا مختصر کر کے بیان فرمایئے، تو آپؐ نے فرمایا: ”فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا“ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، اس نے کہا یہ کافی ہے یا رسول اللہ اگر میں آپ کے عامل صدقہ کو زکوۃ ادا کردوں تو میں بری الذمہ ہوگیا؟ تو رسول پاک نے فرمایا ہاں! اگر تم نے میرے عامل کو زکوۃ سونپ دی تو تم بری ہوگئے اور تم اجر کے مستحق ٹھہرے۔[۱]

انسان کو اپنے مال و دولت میں جس طرح تصرف کا حق ہے، اسی طرح وصیت کا بھی حق ہے، لیکن اس کے مال میں اس کے وارثوں اور رشتہ داروں کا بھی حق ہے اس لیے شریعت نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص اپنی وفات کے وقت اپنی ساری دولت خدا کی راہ میں دینے کی وصیت کردے تو یہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں پوری کی جائے گی۔ کیونکہ اس میں رشتہ داروں کا حق موجود ہے۔

اندازہ کیجیے کہ اسلامی شریعت نے عدل و رحمت کا جو نظام قائم کیا ہے، اس میں انفاق میں بھی فضول خرچی کو ناپسند کیا گیا ہے، پھر کس طرح مسلمانوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ دنیا کے کاموں میں اسراف اور فضول خرچی کا ارتکاب کریں۔

سماجی زندگی میں سب سے زیادہ پامالی اسی حکم کی ہو رہی ہے، آپ نظر اٹھا کر دیکھیں کہ فضول خرچی کے نت نئے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں اور لوگ آنکھ بند

---

[۱] مسند احمد ۳/۱۳۶

کر کے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

کھانے پینے میں فضول خرچی کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو بڑے ہوٹلوں میں جا کر دیکھیے، دینی شعور سے بے بہرہ نوجوان کھانے کا بڑا آرڈر دیں گے، تھوڑا کھائیں گے باقی ضائع کر دیں گے، نکاح، ولیمہ اور دعوت کے موقع پر باراتیوں اور دعوت میں جانے والوں کو دیکھیے، اپنی پلیٹوں میں خواہش سے زیادہ سالن لیں گے، آدھا ضائع کر دیں گے۔ شریعت نے کھانے پینے کے جو آداب سکھائے ہیں ایسے موقع پر لوگ بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں ہم سے سوال کیا جائے گا۔ کھانا بچ جائے تو غریبوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اسے ضائع کر دینا پسند کرتے ہیں۔ فضول خرچی کی یہ بدترین مثال ہے جس کا ارتکاب ہمارے سماج میں ہو رہا ہے۔

فضول خرچی کا سب سے زیادہ ارتکاب شادی بیاہ کے موقع پر ہونے لگا ہے۔ وہ شادی جس کی برکت سادگی میں اللہ تعالیٰ نے رکھی تھی، ہم لوگوں نے اس کو تکلفات اور اسراف سے اس طرح بھر دیا ہے کہ یہ زحمت بن گئی ہے۔ شادی کارڈ یعنی دعوت نامہ محض ایک اطلاع ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد لوگ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں، مگر اس ایک کارڈ پر اب سو روپیہ تک خرچ کیا جاتا ہے، یوں ہزاروں روپے صرف کارڈ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھیے جہاں چند گھنٹوں کے لیے شادی کی تقریب انجام پاتی ہے وہاں پنڈال پر صرف ڈیکوریشن کے نام پر لاکھوں روپے خرچ ہونے لگے ہیں۔ معاذ اللہ سادگی کی تعلیم پانے والی یہ امت اس قدر اسراف میں مبتلا ہو رہی ہے، اس کی اصلاح کی فکر کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

جو لوگ لاکھوں روپے پنڈال اور شادیانہ پر خرچ کر دیتے ہیں، ان کے محلّہ اور بستی میں بہت سی جوان لڑکیاں بغیر نکاح کے بیٹھی ہیں، بہت سے یتیم اور نادار بچے

دو وقت کی روٹی کے محتاج ہیں۔ بہت سے ذہین بچے اور بچیاں تعلیم سے محروم ہیں، بہت سے مدرسے، ادارے اور اسکول وسائل کی تلاش میں ہیں، مگر یہ فضول خرچ لوگ کبھی ان کی خبر گیری اور دست گیری کے لیے آگے نہیں بڑھتے، انسانوں کی آبادی میں رہنے والے یہ دولت مند فضول خرچ لوگ اگر انسانوں کے بھائی ہوتے تو انسانی جذبات سے بھرے ہوتے، انسانی ضرورتوں کو سمجھتے اور انسانوں کی مدد کے لیے پیش پیش ہوتے۔ مگر فضول خرچی کے رویہ نے ان کو شیطان کا بھائی بنا دیا، اب وہ شیطان کی ہدایت پر اپنی دولت، شہرت، نام ونمود اور جھوٹی عزت کی خاطر برباد کر دیتے ہیں اور تعمیر وترقی، نیکی اور فلاح کے کاموں میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شیطان کے بھائی کو انسان کے بھائی سے کیوں ہمدردی ہو۔

کچھ مال دار ایسے ہیں کہ ہمیشہ نئے ماڈل کی گاڑی کی تلاش میں رہتے ہیں اور اپنی گاڑی بدلتے رہتے ہیں، یہی ان کی زندگی ہے، وہ کبھی اپنے سماج کی معاشی حالت کو بدلنے میں اپنی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے، بہت سے اصحاب ثروت مسلم سماج میں ایسے بھی ہیں جو سیاسی تقریب پر اور سیاسی نیتاؤں پر رقم بے دریغ خرچ کرتے ہیں، مگر غربا پروری، تعلیم وتربیت، دینی ضرورت اور فلاح کے کام کے نام پر خرچ کرتے ہوئے ان کو خوف محسوس ہوتا ہے، کیونکہ پارٹی اور سیاست کے لیے خرچ کرنے میں شہرت اور حیثیت ملتی ہے جب کہ دینی، تعلیمی اور فلاحی کاموں میں خرچ کرنے پر صرف آخرت ملتی ہے، امت مسلمہ کی عزت اور ترقی اگر مقصود ہے تو ہم سب کو طے کرنا ہوگا کہ اسراف اور فضول خرچی سے اور ناحق کاموں میں روپیہ خرچ کرنے سے ہم گریز کریں گے اور تعمیری اور فلاحی کاموں میں دل کھول کر خرچ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اچھی سمجھ اور نیک توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نکاح کا سنت طریقہ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ. (الروم-۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

نکاح مرد و عورت کے تعلق کی قانونی، اخلاقی اور دینی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے، انسانوں کو بھی مرد و عورت کی شکل میں جوڑا بنایا ہے، بغیر نکاح کے اگر مرد عورت ایک ساتھ رہیں تو لوگ ان کو آوارہ اور بدکار سمجھتے ہیں، مذہب ان کو گنہگار کہتا ہے اور سماج میں ان کو گری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن جب دونوں نکاح کے ذریعہ ایک ساتھ رہنے کا اعلان کرتے ہیں تو ان کو نیکوکار سمجھا جاتا ہے، ان کو مبارکباد دی جاتی ہے اور ان کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں، ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ بغیر نکاح کے مرد و عورت کا باہم جنسی تسکین پانا بے حیائی اور مجرمانہ عمل ہے اور اللہ کے قانون سے بغاوت ہے، جب کہ نکاح کے بعد جنسی آسودگی حاصل کرنا، ذمہ داری نیکی اور عبادت ہے کیونکہ یہ دونوں اللہ کے قانون کے مطابق رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ جس چیز میں اللہ کا نام اور اس کے رسول کی

سنت شامل ہو اس میں رحمت و برکت ہے اور جس چیز سے اللہ اور اس کے رسول کا حکم خارج کر دیا گیا ہو اس میں زحمت اور لعنت ہے، نکاح ایسی عبادت ہے جسے تمام رسولوں نے انجام دیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (الرعد-۳۸)

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا:

اربع من سنن المرسلین الحیاء والتعطر والسواک والنکاح۔ [۱]

چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں: حیا، خوشبو، مسواک اور نکاح۔

آخری رسول محمد ﷺ نے بھی نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے۔

النکاح من سنتی [۲] نکاح میری سنت ہے۔

رسول پاک ﷺ نے مسلم نوجوانوں کو پاکدامنی اور پاکبازی کی تعلیم دیتے ہوئے نکاح کرنے اور پاکیزہ زندگی گذارنے کی تلقین فرمائی ہے:

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع منکم فعلیہ بالصوم فان لہ وجاءٌ [۳]

اے نوجوانو کی جماعت تم میں سے جو شخص استطاعت رکھتا ہے وہ شادی کر لے اس لیے کہ یہ نگاہ کی پاکیزگی اور شرم گاہ کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور جس شخص کے پاس شادی کرنے کی استطاعت

---

[۱] ترمذی، ابواب النکاح عن رسول اللہ ﷺ

[۲] ابن ماجہ، کتاب النکاح

[۳] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب التحریض علی النکاح

نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ روزہ رکھے، یہ اس کی شہوت کا توڑ ہوگا۔

عزت و ناموس اور پاک دامنی کی حفاظت کا بہترین ذریعہ نکاح ہے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کا نکاح کردیں۔ نکاح کے لیے جوڑے کا انتخاب مختلف چیزوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، لڑکی کا انتخاب اس کے حسن و جمال، مال و دولت، خاندان وغیرہ کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ وہ لڑکی کے انتخاب میں دینداری کو ترجیح دیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

تنکح المراۃ لاربع لما لھا ولحسبھا ولجمالھا ولدینھا فاظفر بذات الدین تربت یداک۔ [1]

عورتوں سے نکاح چار اسباب سے کیا جاتا ہے، اس کے مال و دولت کی وجہ سے، اس کے حسب ونسب اور خاندان کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کی دین داری کی وجہ سے، تو تم دیندار عورت سے نکاح کرو۔

حضور پاک ﷺ کا یہ حکم ہر علاقہ اور ہر زمانہ کے لیے رہنما ہے، اس کی حکمت اس وقت زیادہ سمجھ میں آتی ہے جب کوئی نوجوان کسی لڑکی کے حسن پر فریفتہ ہو کر، اس کی مالداری، نوکری یا اس کے باپ کا عہدہ و اقتدار دیکھ کر شادی کرتا ہے، پھر وہ لڑکی اس کے لیے اور اس کے گھر والوں کے لیے زحمت اور آزمائش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ گھریلو سکون غارت ہو جاتا ہے، نوبت تفریق اور مقدمہ بازی تک پہونچ جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں جب کوئی دیندار، اور سیرت و کردار کی لڑکی سے رشتہ کرتا ہے تو اس کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہو جاتی ہے اور خاندان کی عزت اور نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے۔

رسول پاک ﷺ نے بیٹی والوں کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ اپنی دختر کا رشتہ ایسے

---

[1] مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح ذات الدین

نوجوان سے کریں جن میں دین داری ہو، سیرت وکردار اور اخلاقی محاسن ہوں، محض مال و دولت، آمدنی اور عہدہ اقتدار کو دیکھ کر رشتہ نہ کریں ورنہ بیٹی کی زندگی دشوار ہوجاتی ہے۔ رسول پاک نے فرمایا:

اذا جاء کم من ترضون دینه وخلقه فانکحوه الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض وفساد۔ ۱

جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاقی حالت سے تم مطمئن ہو تو تم اس کی شادی کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ رونما ہوگا اور فساد برپا ہوگا۔

ایک شخص حضرت امام حسنؓ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میری بیٹی سے رشتہ کا پیغام متعدد لوگوں نے بھیجا ہے، میں کس سے اپنی بیٹی کا نکاح کروں؟ حضرت حسنؓ نے ارشاد فرمایا، تم اپنی بیٹی کا نکاح ایسے شخص سے کرو جو اللہ سے ڈرتا ہے، کیونکہ اگر وہ اس سے محبت کرے گا تو اس کی عزت وتوقیر کرے گا، اور اگر کبھی اس سے ناراض ہوگا تو اس پر زیادتی نہیں کرے گا۔ ۲

صحابیٔ رسول حضرت ابودرداءؓ جس زمانہ میں شام میں تھے اس وقت ملک شام کے گورنر امیر معاویہؓ تھے، امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کے رشتہ کا پیغام حضرت ابودرداء کی بیٹی کی لیے بھیجا، مگر حضرت ابودرداء نے اس رشتہ کو نامنظور کر دیا۔ حضرت ابودرداء اپنی بیٹی کا رشتہ گورنر کے بیٹے سے کرنے کے بجائے عام دیندار مسلمان سے کرنا پسند کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے فرمایا: ''تمہارا کیا خیال ہے، جب ہر وقت درداء کی خدمت میں غلاموں اور لونڈیوں کی جماعت اس کا ہر حکم بجالانے کے لیے موجود ہوتی اور وہ خود کو ایسے شاندار محلوں میں پاتی جس کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تو اس وقت اس کا دین کہاں ہوتا؟'' ۳

---

۱ ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینه
۲ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۶/ ۱۸۸
۳ عبدالرحمٰن رافت پاشا، صور من حیاۃ الصحابہ، ابودرداءؓ

مسلمانوں نے کفو کے نام پر ذات و برادری کو نکاح کے لیے قید خانہ بنالیا ہے، برادری سے باہر نکاح کرنے کو معیوب اور عزت کے خلاف سمجھا جاتا ہے، کفو کا مطلب مناسبت ہے تاکہ ازدواجی زندگی میں ناہمواری نہ ہو، زندگی سکون سے گذرے، ایک برادری میں بھی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے ناہمواری ہوسکتی ہے بلکہ ایک خاندان میں بھی ہوسکتی ہے، اس کا دین وشریعت سے کوئی تعلق نہیں، شریعت کی نظر میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حسب ونسب یعنی ذات و برادری کے مقابلہ میں دینداری کو نکاح کے لیے پسندیدہ معیار قرار دیا ہے۔

رسول پاک ﷺ نے اپنی حقیقی چچازاد بہن حضرت زینب کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید سے کردی تھی، اس پر کفار نے بڑا شور مچایا کہ قریش کے اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح آزاد کردہ غلام سے کیسے کردیا گیا، مگر حضور ﷺ کی اس عملی مساوات نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اصل معیار دینداری ہے ذات و برادری نہیں۔

اسلام نے نکاح کو انتہائی سادہ اور آسان عمل بنایا تھا، تاکہ لوگ گناہ کی طرف مائل نہ ہوں، نبی ﷺ نے فرمایا:

ان اعظم النكاح بركة ايسرهٗ مؤنة۔[1]

برکت کے لحاظ سے سب سے عظیم نکاح وہ ہے جس کا خرچ سب سے کم ہو۔

مگر آج کے مسلمانوں نے شادی بیاہ کے نام پر اتنی رسمیں ایجاد کرلی ہیں کہ نکاح کرنا ایک مشکل کام ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے بداخلاقی اور بدکاری رونما ہونے لگی ہے۔ جہیز کی رسم اتنی عام ہوگئی ہے کہ جب تک لڑکی والے قیمتی سامان جہیز نہ جوڑلیں لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول پاک نے حضرت فاطمہ کو جہیز دیا تھا، یہ بات غلط ہے، رسول پاک نے اپنی کسی صاحب زادی کو جہیز نہیں دیا، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کسی کو جہیز نہیں دیا۔

---

[1] مسند احمد ۸۲/۶

حضرت فاطمہؓ کا جب حضرت علیؓ سے نکاح ہوا تو حضور نے حضرت علیؓ سے پوچھا، تمہارے پاس مہر میں دینے کے لیے کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میری زرہ ہے، حضور نے ان کی زرہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ بیچ دی اور اسی کی رقم سے مہر کا اور گھریلو سامان کا انتظام کر دیا، کیونکہ حضرت علی کے سرپرست بھی حضور ہی تھے، اگر حضور نے اپنی رقم سے یہ سامان دیا ہوتا تو ضرور جہیز سنت بن جاتی۔

آج جہیز کی رسم کی وجہ سے ہزاروں لڑکیاں بغیر شادی کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ مسلم معاشرہ کے لیے شرمندگی کی بات ہے۔ جہیز کے ساتھ ہی بارات کی رسم مسلمانوں کے یہاں شادی کا جزو بن گئی ہے۔ اکثر بارات کی جو تعداد طے کی جاتی ہے اس سے زیادہ باراتی پہونچتے ہیں۔ شریعت، شرافت اور ضمیر تینوں کی عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ یہ کھانا درست نہیں۔ بعض علاقہ میں نکاح سے پہلے منگنی کی رسم اور نکاح کے بعد چوتھی کی رسم ہوتی ہے، اس میں بھی بارات ہی طرح بڑی تعداد میں لڑکی والوں کے گھر مہمان بن کر جاتے ہیں اور ان سے فرمائشی کھانا کھاتے ہیں۔ یہ ساری رسمیں درست نہیں۔ اسلام نے لڑکی والوں پر کوئی خرچ عائد نہیں کیا ہے، جب کہ لڑکے کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق نکاح کے بعد ولیمہ کرے، ہندوستانی سماج میں غیر مسلموں کے زیر اثر ہم مسلمانوں نے سنت کو بدعت میں تبدیل کر دیا ہے۔

بعض علاقوں میں جہیز کے علاوہ لڑکی والوں سے نقد رقم کا مطالبہ ہوتا ہے۔ لڑکے کی مالی تعلیمی اور سماجی حیثیت کے مطابق رقم ادا کی جاتی ہے، ایسا کرنا صریح گناہ اور ظلم و زیادتی ہے، بعض حضرات نقد رقم کا مطالبہ نہیں کرتے مگر امید کے مطابق لڑکی والوں سے رقم لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانگا نہیں خوشی سے دیا گیا ہے، یاد رکھیے یہ وہی تاویل ہے جو یہودیوں نے مچھلی کے شکار کے لیے کی تھی۔ شریعت کی نظر میں جو چیز معروف ہو جائے یعنی رواج پا جائے اس پر عمل کرنا ایسا ہی ہے جیسے شرط لگا دی گئی ہو، نقد رقم لڑکی والوں سے لینا خواہ مانگے یا بلا مانگے دونوں ناجائز ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے رسول کی سنت پر چلنے کی توفیق دے۔ (آمین)

طلاق ناپسندیدہ ہے

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اَلطَّلاَقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلاَ یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَا اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلاَ جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلاَ تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (البقرہ-۲۲۹)

طلاق دوبار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے اور ایسا کرنا تمہارے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو البتہ مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔

نکاح ایک انسانی ضرورت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، لیکن جب نکاح بوجھ بن جائے، میاں بیوی میں نباہ مشکل ہو جائے تو اسلام نے معقولیت اور شرافت سے

الگ ہوجانے کا راستہ بھی رکھا ہے، جسے طلاق کہا جاتا ہے۔ طلاق اگر چہ علیحدگی کا طریقہ اور مجبوری کا راستہ ہے مگر پسندیدہ ہرگز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ما احل الله شيئا ابغض اليه من الطلاق. [۱]

اللہ نے جو چیزیں حلال کی ہیں ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

طلاق کا استعمال اسی وقت کرنا چاہیے، جب نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور نکاح میں رہنا میاں بیوی میں سے کسی ایک یا دونوں کے لیے نقصان اور تکلیف کا باعث ہو۔

جس طرح نکاح کے لیے شریعت نے یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ والدین رشتہ ڈھونڈتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں، تاریخ طے کرتے ہیں، دعوت نامے تقسیم ہوتے ہیں، پھر نکاح کی مجلس منعقد ہوتی ہے اور قاضی خطبہ نکاح پڑھتا ہے اور دو گواہوں کے حوالہ سے ایجاب وقبول ہوتا ہے، اسی طرح اگر میاں بیوی میں نااتفاقی ہوجائے تو اسلام نے طلاق دینے سے پہلے میل ملاپ کی کچھ صورتیں رکھی ہیں، تاکہ رشتہ قائم رہے، آپسی اختلاف دور ہوجائے اور طلاق کی نوبت نہ آئے۔

انسان طلاق دینے کا ارادہ کئی اسباب سے کرتا ہے، ان میں بڑا سبب یہ ہے کہ بیوی سے اسے کوئی تکلیف پہونچتی ہے، اس کی کوئی حرکت یا عادت اسے ناپسند ہوتی ہے یا کسی بات پر دونوں میں نااتفاقی ہوجاتی ہے، اگر بیوی کی کوئی خصلت شوہر کو ناپسند ہو تو اسلام کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے طلاق نہ دو بلکہ صبر وتحمل سے کام لو، زندگی میں اونچ نیچ آتے رہتے ہیں، اسے خوشگوار بنانے کی اور خوبصورتی سے نباہ کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا. (النساء-۱۹)

اور ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو، اگر وہ تمہیں

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق

ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

رسول کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لایفرک مومن مومنة ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر۔[1]

کوئی مومن شوہر مومنہ بیوی کو ناپسند نہ کرے اگر وہ اس کی بعض عادت کو ناپسند کرتا ہے تو دوسری عادت سے خوش بھی ہوتا ہے۔

اگر ناپسندیدگی کا تعلق بیوی کی سرکشی سے ہو تو شریعت نے شوہر کو دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرو، اس سے کام نہ چلے تو ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے بستر الگ کرلو، اس سے بھی کام نہ چلے تو ان کو سرزنش کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰتِی تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً. (النساء-۳۴)

اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، خوابگاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو، پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔

اگر اختلاف کا تعلق ایسے معاملہ سے ہو جس میں دونوں اپنے رویہ کو حق بجانب سمجھتے ہوں اور دونوں اپنے موقف پر اڑے ہوں تو ان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کو بیچ میں ڈالیں اور معاملہ کو حل کرنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا. (النساء-۳۵)

اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا

---

[1] مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء

اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔ وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔

اگر یہ سارے طریقے ناکام ہو جائیں اور نباہ کی واقعی کوئی صورت نہ بچے، تو سنت طریقہ سے صرف ایک طلاق دو، مگر اس بات کا خیال رکھو کہ طلاق طہر کی حالت میں دو حیض کی حالت میں نہ دو اور طلاق پر گواہ بھی رکھو، ایک طلاق دے کر بیوی کو گھر سے نہ نکالو بلکہ اپنے گھر میں رہنے دو تا کہ وہ عدت کے تین ماہ گذارے، اس عرصہ میں شوہر کو بھی اپنے اقدام پر نظر ثانی کرنے کا موقع ملے گا اور بیوی کو بھی اپنے رویہ پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔

اگر شوہر کو یہ احساس ہو کہ ہم دونوں کو مل جانا چاہیے تو طلاق سے رجوع کرلو، پھر اگر کبھی نا اتفاقی ہو جائے اور نباہ مشکل نظر آئے تو ایک طلاق اسی طریقہ سے دو، پھر اگر عدت کے دوران لوٹانے کی ضرورت محسوس ہو تو رجوع کرلو، اگر لوٹالیا اور پھر کبھی طلاق کی نوبت آ گئی تو تیسری طلاق دو، تیسری طلاق کے بعد لوٹا نہیں سکتے، کیونکہ بار بار کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک ساتھ رہنا اور زندگی گذارنا مشکل ہو چکا ہے، اب اسی صورت میں وہ تمہارے پاس آ سکتی ہے کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے اور مباشرت کے بعد اگر وہ بھی طلاق دے دے تو پہلا شوہر نکاح کر سکتا ہے، جب پہلی یا دوسری طلاق کے بعد عدت پوری ہو جائے تب بھی لوٹا نہیں سکتے، دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ . (الطلاق-۲)

پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو، یا بھلے طریقے پر

ان سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے
صاحب عدل ہوں اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔

طلاق دینے کا یہی طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مقرر کیا ہے، ہمارے زمانہ کے جاہل مسلمانوں نے اسلام کے مقرر کردہ طریقہ کو چھوڑ کر، ظلم و جہالت کا طریقہ اپنالیا ہے، جب ان کو غصہ آتا ہے تو بجائے افہام و تفہیم کے اور بجائے گھر والوں کو بلائے خود ہی طلاق دے ڈالتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، پھر ایک طلاق دینے کو وہ کافی نہیں سمجھتے، حالانکہ ایک طلاق سے کام چل جاتا ہے، جب غصہ ٹھنڈا ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ اپنے عمل پر پچھتاوا ہو اور رجوع کرنے کی کوئی صورت نکل آئے، مگر جاہل شوہر ایک ساتھ تین طلاق دے ڈالتا ہے۔ یہ طریقہ ظالمانہ ہے، بدعت ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو سخت ناپسند ہے۔

حضرت محمود بن لبید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دے دی تو حضور ﷺ غصہ کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور فرمایا: کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے، رسول پاک ﷺ کی ناراضگی دیکھ کر ایک صحابی نے کہا اللہ کے رسول کیا میں اسے قتل نہ کردوں؟ (مگر رسول پاک نے اسے اجازت نہ دی)۔[1]

حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیتا تو وہ اسے کوڑوں کی سزا دیتے، آج ہمارے یہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اس لیے لوگوں کو جرأت ہورہی ہے کہ وہ ایک ساتھ تین طلاقیں دے کر اللہ کے قانون کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ لوگ اگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوتے تو اپنے جرم کی یقیناً سزا پاتے۔

ایک شخص کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا اور اس نے غصہ میں آکر کہہ دیا طلاق،

---

[1] نسائی، کتاب الطلاق، الثلث المجموع وما فیہ من التغلیظ

طلاق، طلاق، جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ، جب غصہ ٹھنڈا ہوا، تو مولوی صاحب کے پاس مسئلہ پوچھنے گیا، مولوی صاحب نے کہا ایک ساتھ تین طلاق دینا شریعت کی خلاف ورزی ہے، تم نے کیوں دی؟ اس نے جواب دیا کہ غصہ میں دے دی۔ مولوی صاحب نے کہا، کیا کوئی محبت میں بھی تین طلاق دیتا ہے؟ رسول پاک نے غصہ پر قابو پانے کا حکم دیا، تم نے غصہ پر قابو نہ پایا، رسول پاک ﷺ نے غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنے سے روکا، تم نے غصہ کی حالت میں طلاق دینے کا فیصلہ کیا، رسول پاک ﷺ نے ایک ساتھ تین طلاق نہ دینے کا حکم دیا، تم نے ایک ساتھ تین طلاق دی، تین تین جرم کا ارتکاب کر کے مسئلہ پوچھنے آئے ہو؟

ذرا سوچیے! اس طرح طلاق دینے سے فیملی ٹوٹ جاتی ہے، خاندان میں نا اتفاقی ہوتی ہے، اگر بچے ہوں تو ان کا مستقبل برباد ہو جاتا ہے اور غیر مسلموں کی نظر میں اسلام کی رسوائی اور بدنامی ہوتی ہے، اس پر بھی غور کیجیے کہ کنواری لڑکیوں ہی کی شادی مشکل سے ہو پاتی ہے، بہت سی بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہیں، نادان لوگ طلاق دے کر، مطلقہ عورتوں کو بے یار و مددگار سماج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں، ان کی شادی تو اور بھی مشکل ہے، بہت سی مطلقہ عورتیں ایسی ہیں جو بھیک مانگنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ بہت سی مطلقہ عورتیں ایسی ہیں جن کی عزت و آبرو کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے، ان ساری معاشرتی برائیوں کی ذمہ داری ان ظالم شوہروں پر عائد ہوتی ہے جو اسلامی احکام و ہدایات کی پرواہ کیے بغیر طلاق دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو معاشرتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور اسلامی قوانین کی پابندی کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

اتباع شریعت

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ. (الجاثیہ-۱۸)

ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے لہذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

ہر انسان اپنی زندگی کے مراحل اور معاملات طے کرنے کے لیے مختلف قوتوں اور شخصیتوں کا اتباع کرتا ہے، کسی کا حکم مانتا ہے، کسی کا مشورہ قبول کرتا ہے اور کسی کے نقش قدم پر چلتا ہے، جس کا جو عقیدہ اور مذہب ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ اپنا رہنما چنتا ہے اور اس کا اتباع کرتا ہے، ایک مسلمان کی زندگی کا قانون اور قابل اتباع طریقہ اسلامی شریعت ہے، جو اللہ تعالیٰ کے فرمان رسول اللہ ﷺ کی سنت اور اولوالامر کے اتباع پر مبنی ہے، اسلامی شریعت کا اتباع ہی درحقیقت ہدایت کا معیار ہے اور کامیاب زندگی کی پہچان ہے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول اور اولوالامر کے اتباع کو واجب قرار دیا ہے اور اختلاف ونزاع کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى
الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ
وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (النساء-۵۹)

اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور
ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے
درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی
طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جس دین پر ہم ایمان رکھتے ہیں اس کے ضابطوں اور قوانین پر عمل کریں اور اپنے سارے معاملات خواہ ذاتی ہوں یا خاندانی، سماجی ہوں یا اقتصادی، عوامی ہوں یا سیاسی اسی کی رہنمائی میں انجام دیں۔

اسلامی شریعت کا اتباع ہی مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت کی بنیاد ہے، اگر لوگ اسلامی شریعت کا اتباع چھوڑ کر اور چیزوں کا اتباع کریں گے تو وہ ٹکڑوں، خانوں اور گروہوں میں بٹ جائیں گے، صراط مستقیم سے دور ہو جائیں گے اور اللہ کی مدد اور رحمت سے محروم ہو کر ناکام ونامراد ہو جائیں گے، ارشاد ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.
(الانعام-۱۵۳)

بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہذا تم اسی پر چلو اور دوسرے
راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں
گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید
کہ تم کج روی سے بچو۔

شریعت کے احکام وقوانین کو اگر انسان چھوڑے گا تو وہ یا تو غیر اللہ کے قاعدے اور قوانین پر چلے گا، یا اکثریت کو دیکھ کر اپنا راستہ طے کرے گا، یا سماج کے رسم ورواج کو اپنائے گا، یا شیطان کے نقش قدم پر چلے گا یا اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہے گا، ان تمام صورتوں میں راہ حق سے دور ہوگا اور گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا، آج بہت سے مسلمان یہود ونصاریٰ کے طور وطریقوں کو اپنائے ہوئے ہیں، بلکہ بہت سے مسلمان ملک یہود ونصاریٰ کے دستور اور طرز حکومت پر چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کا اتباع کرنے سے مسلمانوں کو روکا ہے اور فرمایا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كَافِرِيْنَ . (آل عمران-۱۰۰)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔

کوئی گروہ اور قوم جب اقلیت میں ہوتی ہے تو وہ اکثریت کے اثرات قبول کرتی ہے اور اکثریت کے عقائد وخیالات، اعمال، رواج، طور طریقے اپنا لیتی ہے، یہ دوسری اقلیتوں کے لیے تو ممکن ہے فائدہ مند ہو، مگر اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہ شدید گمراہی ہے، اس سے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو بچانا بہت ضروری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ.
(الانعام-۱۱۶)

اور اے محمدؐ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔

وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ انسان کو راہ راست سے بھٹکانے کے لیے ہر لمحہ جتن کرتا رہتا ہے، یوں تو لوگ شیطان سے نفرت کرتے ہیں اور اس پر لعنت بھی بھیجتے رہتے ہیں، مگر شعوری یا غیر شعوری طور پر شیطان کے حکم پر عمل بھی کرتے ہیں، اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو کر برائیوں اور بے حیائیوں کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ یہی تو شیطان کا اتباع ہے، اللہ تعالیٰ نے شیطان کی چالوں سے مومن کو متنبہ کیا ہے اور اس کا اتباع کرنے سے سختی سے روکا ہے، ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ وَمَنْ یَّتَّبِعْ
خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ. (النور-۲۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقش قدم پر مت چلو اس
کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فحش اور بدی کا حکم دے گا۔

شریعت کے احکام اور ضابطوں کو نظر انداز کرنے کی سب سے بڑی وجہ انسان کی اپنی نفسانی خواہشات ہیں جو ہمیشہ انسان کو گناہ پر اکساتی رہتی ہے، انسان اگر اپنی خواہشات کو بے لگام چھوڑ دے تو وہ ان کا غلام بن جاتا ہے، زبان سے اگرچہ اچھی باتیں کرے مگر اس کا دل تاریک، نگاہ پست، عمل مخدوش اور شخصیت داغدار ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کی سورہ اعراف میں بلعم بن باعورہ کا قصہ بیان ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بلعم بن باعورہ بڑا عالم، بڑا زاہد، عبادت گذار اور متقی شخص تھا، جو دعا کرتا اللہ اسے قبول فرماتا تھا، مگر ہوا یہ کہ وہ اپنی نفسانی خواہش کا شکار ہو گیا، عورت کے چکر میں پھنس گیا، شیطان نے اسے اچک لیا اور وہ اللہ کی آیات کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آ گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا علم، اس کی عبادت سب کچھ چھین کر اس کو مسخ کر دیا، وہ کتوں کی طرح ہانپتا پھرتا تھا اور اپنے سماج

میں نمونہ عبرت بن کر رہ گیا۔ قرآن میں ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ. (الاعراف:۱۷۵-۱۷۶)

اور اے محمدؐ! ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ اس کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔ لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے ہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ قصہ بیان کر کے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ لوگ خواہشات نفس کی پیروی چھوڑ دیں اور شریعت پر گامزن رہیں، جس امت کو خیر امت کا لقب عطا کیا گیا ہے خواہشات نفس اسے بری امت میں تبدیل کر دیں گی۔

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس سے پہلے وہ خواہشات نفس میں مبتلا ہو جاتی ہے، راہ حق اور احکام الٰہی سے دور ہو جاتی ہے، عیش و عشرت اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتی ہے، حق پرستی انسان کو بلندی عطا کرتی ہے اور نفس پرستی انسان کو پستی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو اور ان کے ذریعہ ان کی امتوں کو راہ حق پر سختی سے کاربند رہنے اور خواہشات نفس کے

اتباع سے گریز کرنے کی تلقین کی ہے۔حضرت داؤدعلیہ السلام کوخطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ
النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ. (ص-۲۶)

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے حق کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔

اسلامی شریعت کی پابندی کرنا اور خواہش نفس سے چھٹکارا پانا اس وقت بہت مشکل معلوم ہوتا ہے جب ہمارے مفادات پر ضرب لگتی ہو،کوئی آمدنی ماری جاتی ہو،کوئی عہدہ اور مرتبہ چھوٹ رہا ہو،عزت وشہرت کا کوئی موقع ضائع ہور ہا ہو،اگر ایسی چیزیں ناجائز اور حرام چیزوں سے جڑی ہوئی ہوں تو مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ان کو چھوڑ دے اور خواہشاتِ نفس کو قربان کردے اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر سر اطاعت جھکا دے،ایسے لوگوں کو قیامت میں اللہ تعالیٰ بڑا مرتبہ عطا کرے گا۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا.
(الاحزاب-۵۱)

جوشخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کی توفیق دے۔(آمین)

دوستی اللہ کے لیے

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْہِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلاً یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِی لَمْ اَتَّخِذْ فُلاَنًا خَلِیْلاً لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَ نِیْ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلاً . (الفرقان-۲۹-۲۷)

قیامت کے دن ظالم اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا، ہائے میری کم بختی، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا اس کے بہکاوے میں میں نے نصیحت نہ مانی۔ شیطان انسان کے حق میں بے وفا نکلا۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

الحب فی اللہ و البغض فی اللہ من الایمان.[۱]

اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی ایمان کا حصہ ہے۔

یوں تو ہر انسان دوستی کرتا ہے، مگر دوستی کے اسباب الگ الگ ہوتے ہیں، مومن کی دوستی ایمان کی بنیاد پر اور اللہ کی خاطر ہونی چاہیے۔ سچا دوست وہی ہوگا جو اللہ کی خاطر دوستی کرے گا اور جھوٹا دوست وہ ہوگا جو مفاد کی خاطر دوستی کرے گا۔

دوستی انسان کی فطری خواہش اور سماجی ضرورت ہے۔ سچے دوست کی تلاش

---

[۱] بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان

انسان ہمیشہ کرتا ہے۔ جہاں عزیز و اقربا نہیں ہوتے وہاں دوست کام آتے ہیں۔ تکلیف اور پریشانی کے حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اقرباء منہ پھیر لیتے اور دوست مددگار بن جاتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دوستی جسم بھی ہے، جان بھی بلکہ دین بھی ہے ایمان بھی۔ عام طور پر انسان اسی کو دوست بناتا ہے جس سے مزاج، طبیعت، عادت، رویہ اور رجحان میں ہم آہنگی محسوس کرتا ہے، چنانچہ عقل مندوں نے کہا ہے ''**لاتسئل عن المرء واسئل عن قرینه**'' کسی انسان کو جاننا ہو تو اس کے دوستوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرو، کیوں کہ دوست اپنے دوست کا ہم نشیں اور محرم راز ہوتا ہے، اس کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس کی عادتوں، دلچسپیوں اور مصروفیتوں میں شریک ہوتا ہے اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی لیے تو رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں:

> ''**المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم الی من یخالله**''[۱]
>
> انسان اپنے دوست کے دین پر چلتا ہے، دوستی کرنے سے پہلے ضرور دیکھو کہ تم کس سے دوستی کر رہے ہو۔

دوست کا انتخاب عموماً شعوری اور ضروری نہیں ہوتا کیوں کہ کوئی یادگار واقعہ، کوئی اچھا تجربہ، کوئی معمولی احسان اور کوئی نگاہِ التفات کسی کو بھی دوستی کے نام پر آپ سے قریب کر سکتی ہے، مگر رفتہ رفتہ آپ کو دوست کے حالات، خیالات، مزاج، رویہ اور رجحان سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ آپ کے اندر اتنی سمجھ، بصیرت اور جرأت ہونی چاہیے کہ آپ اپنے دوست کی خوبیوں کو اپنا سکیں اور اس کی خامیوں سے محفوظ رہ سکیں، ہو سکے تو اسے بھی محفوظ رکھنے کی سعی کریں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کی عادتیں لوگوں میں برے آدمی کی دوستی اور گندی صحبت سے پیدا

---

[۱] ترمذی، کتاب الزہد

ہوجاتی ہیں۔ جھوٹ اور غیبت کی عادت بھی اکثر اسی راہ سے آتی ہے اور غیر محسوس طریقہ پر آتی ہے۔

اچھی عادتیں، اچھے خیالات اور اچھے اخلاق اچھے دوست کی علامت ہیں، یہ آپ کی زندگی کو سنوارتی ہیں، آپ کی زندگی کو پر بہار بناتی ہیں اور آپ کی شخصیت کو وقار اور اعتبار عطا کرتی ہیں جب کہ بری عادتیں، برے خیالات اور برے اخلاق، برے انسان کی علامت ہیں، یہ زندگی کو داغ دار بناتی ہیں، شخصیت کو بے وقار اور انسان کو شرمسار کرتی ہیں۔ دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے آدمیوں سے دوستی کیجیے جو آپ کو اچھے خیالات اور اچھے اخلاق سے ہمکنار کرے، ایسے لوگوں کی دوستی سے گریز کیجیے جن کی صحبت آپ کے افکار و خیالات میں کثافت بھر دے اور اخلاق و کردار کو آلودہ کر دے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''نیک ہم نشیں اور برے ہم نشیں کی مثال ایسی ہے جیسے خوشبو بیچنے والا اور بھٹی پھونکنے والا، خوشبو بیچنے والا یا تو تم کو خوشبو ہدیہ کر دے گا، یا تم اسے خرید و گے یا تم اس کے پاس خوشبو محسوس کرو گے، لیکن اگر تم بھٹی پھونکنے والے کے پاس بیٹھو گے تو یا تو وہ تمہارا کپڑا جلا دے گا یا تم وہاں کثافت اور بدبو محسوس کرو گے''۔ [1]

حضرت علیؓ نے اپنے صاحب زادے حضرت حسن کو چار قسم کے لوگوں سے دوستی نہ کرنے کی نصیحت فرمائی۔ وہ چار لوگ یہ ہیں:

۱- **ایاک و مصادقة الا حمق فانه یرید ان ینفعک فیضرک**
(بے وقوفوں کی دوستی سے پرہیز کرو، وہ تم کو نفع پہنچانا چاہے گا

---

[1] بخاری، کتاب الذبائح، باب المسک۔ مسلم، کتاب البرّ والصلۃ

مگر نقصان پہنچائے گا)

۲- ایاک ومصادقة البخیل فانه یبعد عنک احوج ماتکون الیه.

(بخیل کی دوستی سے بچو، کیونکہ وہ تم سے ان لوگوں کو دور کردے گا جن کی تم کو زیادہ ضرورت ہو)

۳- ایاک ومصادقة الفاجر فانه یبیعک بالتافة

(برے آدمی کی دوستی سے بچو کیونکہ وہ تمہیں کوڑیوں کے مول بیچ دے گا)

۴- ایاک ومصادقة الکذاب فانه کالسراب یقرب الیک البعید ویبعد عن القریب.

(جھوٹے آدمی کی دوستی سے بچو وہ سراب کی طرح ہے جو قریب کے لوگوں کو تجھ سے دور کردیتا ہے اور دور کے لوگوں کو نزدیک کرتا ہے)

جو لوگ بھلے برے کی تمیز کیے بغیر دوستی کرتے ہیں وہ یا تو دنیا میں ہی شرمندہ ہوتے ہیں یا آخرت میں رسوا ہوں گے۔ کیوں کہ ایسے دوست بہ ظاہر دوستی کرتے ہیں مگر ایسی راہ پر لگادیتے ہیں جس کا انجام رسوائی ہے۔ ایسی برائیاں پیوست کردیتے ہیں جو تباہی پر ختم ہوتی ہیں۔ اس دوستی کے انجام پر انسان کفِ افسوس ملتا ہے مگر اس وقت افسوس کا کچھ حاصل نہیں۔ قیامت کے دن ایسی دوستی پر افسوس کرتے ہوئے انسان کہے گا:

یا وَیْلَتٰی لَیْتَنِی لَمْ اَتَّخِذْ فُلاَنًا خَلِیْلاً. (الفرقان-۲۸)

ہائے میری تباہی، کاش میں فلاں شخص کو دنیا میں دوست نہ بنایا ہوتا تو آج رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

آج کل زیادہ تر دوستیاں مفاد کی بنیاد پر ہوتی ہیں، کسی سے کوئی فائدہ حاصل کرنا ہو تو اس سے قریب ہونے کی کوشش کیجیے۔ کسی سے نفع کی امید ہو تو اس کی دوستی کا دم بھریئے، اس کی خوشامد اور چاپلوسی کیجیے، ان کو عزیز از جان باور کرائیے۔ مگر

جب فائدہ حاصل ہو جائے تو دوری اختیار کیجیے، سرد مہری برتیے اور اس طرح اجنبی بن جایئے جیسے جانتے ہی نہ ہوں، یہ دوستی نہیں مفاد پرستی ہے، ایسے دوست نما دشمن کو پہچاننا اور اس سے ہوشیار رہنا عقل مند انسان کے لیے ضروری ہے۔ دوستی کی پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ خوشی کے لمحات میں آپ کے ساتھ ہے بلکہ اصل پہچان یہ ہے کہ ضرورت اور مصیبت کی گھڑی میں آپ کے ساتھ کھڑا ہے، اسی لیے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و در ماندگی

سچا دوست وہ ہے جو پریشاں حالی میں آپ کی دست گیری کرتا ہے۔

دوستی وقت کو خوش گوار بنانے کا بھی ذریعہ ہے اور وقت برباد کرنے کا بھی، دوستوں کے ساتھ آپ خوش گوار لمحے گزار سکتے ہیں، موڈ درست کر سکتے ہیں، ذہنی تناؤ اور عصبی کھچاؤ سے نجات پا سکتے ہیں، خوش خیالی اور خوش فکری کے اوقات بسر کر سکتے ہیں۔ زندگی میں اس کی بھی بڑی ضرورت ہے مگر حدِ اعتدال پر نظر رکھنا لازم ہے اگر اعتدال سے ہٹ گئے تو آپ کے قیمتی اوقات برباد ہو جائیں گے بلکہ آپ کی حیاتِ عزیز برباد ہو سکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے ہیں جو دوستی کی نذر ہو گئے، پہلے ان کا مقصدِ زندگی غائب ہوا، پھر ان کا مستقبل تاریک ہوا اور وہ ناکارہ بن کر رہ گئے۔

اگر کوئی مخلص دوست ملے تو اسے زندگی کی ضرورت سمجھئے اور اس کی قدر و قیمت جانیے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"اعجز الناس من عجز عن اکتساب الاخوان
واعجز منه من ضیع من ظفر به منهم"[1]

سب سے عاجز انسان وہ ہے جو دوست حاصل کرنے میں ناکام

---

[1] نہج البلاغۃ

رہے اور اس سے بھی زیادہ عاجز وہ ہے جو دوست پا کر اسے کھودے۔

دوست پا کر اسے کھودینا بدنصیبی ہے، مگر دوستی ختم کیوں ہوتی ہے، دوست جدا کیسے ہوجاتے ہیں؟ جب کسی دوست کو اپنے رفیق سے خیانت، بدعہدی اور بداعتمادی کا تجربہ ہوتا ہے تو دوستی کی عمارت منہدم ہوجاتی ہے۔ اس لیے دوستی کی عمارت اخلاص پر تعمیر کیجئے اور اسی کے ساتھ اعتدال اور اخلاق کا بھی مظاہرہ کیجیے، جب آپ کسی دوست سے زیادہ امیدیں باندھ لیتے ہیں تو اکثر مایوسی ہوتی ہے، انسانی کمیوں اور حدود کالحاظ رکھنا بھی ناگزیر ہے اور درگزر سے کام لینا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح دوستی میں اکثر بے تکلفی شامل رہتی ہے اور بے تکلفی کبھی کبھی حدِ اعتدال کو پار کر جاتی ہے تو غیر محسوس ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ قطع تعلق میں بدل جاتا ہے اور انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

دشمنی جب کسی سے ہوتی ہے
ابتدا دوستی سے ہوتی ہے

بہت سے لوگ اپنی زبان کی قینچی سے دوستی کی رسّی کتر دیتے ہیں، بے شعوری میں طنز وتضحیک کے جملے، توہین وتحقیر کے فقرے استعمال کرتے ہیں، غیبت و بدگوئی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے دوست کو تنگ دل بنادیتے ہیں۔ جملہ بازی نہیں چھوڑتے، دوستی چھوڑ دیتے ہیں۔ اچھی زبان دشمنوں کو دوست بناتی ہے اور بد زبانی دوستوں کو دشمن بنادیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک وبد کی تمیز عطا کرے۔ (آمین)

اسلامی اخوت اور بھائی چارہ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ، فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات-۱۰)

مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

یوں تو سارے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لیے اصولی طور سے آپس میں بھائی ہیں۔ مگر جو لوگ مسلمان ہیں، اللہ اور اس کے رسول اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ آپس میں بھائی ہیں، ایمان کا رشتہ انسانی بھائی چارگی اور اخوت کو مضبوط کر دیتا ہے، بلکہ اس ایمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ خون کے رشتہ سے زیادہ مضبوط اور متبرک رشتہ جوڑتا ہے، مسلمان ایک دوسرے کے درد و غم میں شریک رہتا ہے، ایک دوسرے کی خوشی و راحت کا خیال رکھتا ہے، ایک دوسرے کی خوش حالی اور ترقی کی فکر کرتا ہے، ایک دوسرے کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور ایک دوسرے کو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مدد دیتا ہے، یہ مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک خاندان کے افراد کی طرح ہی نہیں بلکہ ایک جسم کے اعضا کی طرح ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اگر الگ کر دیا جائے تو جسم

صحیح سالم نہیں رہ سکتا، حضرت نعمان ابن بشیرؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تری المومنین فی تراحمهم و توادهم وتعاطفهم مثل الجسد اذا شتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی۔[1]

مومنوں کو آپس میں محبت، رحمت اور مہربانی کرنے کے معاملہ میں دیکھو گے کہ ایک جسم کی طرح ہیں، جب جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بخار اور رت جگے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی بھائی چارہ اور محبت کی مثال یا تو انسانی جسم سے دی ہے جس کے ہر عضو کا دوسرے سے اٹوٹ رشتہ اور تعاون ہوتا ہے، یا ایسی عمارت اور دیوار سے دی ہے، جس کی اینٹیں باہم ملی اور جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے ملنے سے ہی دیوار کا وجود باقی ہے اور جب یہ مل نہ سکیں تو دیوار کمزور ہو کر ڈھے جاتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انّ المومن للمومن کا لبنیان یشد بعضه بعضا وشبک اصابعه۔[2]

ایک مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے، جس کی اینٹیں ایک دوسرے کو قوت عطا کرتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے رسول پاک نے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے بتایا۔

اسلام نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے، مسلمان وہ ہے جو

---

[1] بخاری، کتاب الأدب، باب رحمۃ الناس والبھائم

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب تشبیک الاصابع فی المسجد

اللہ اور اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، خواہ وہ کسی ملک کا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی قبیلہ اور برادری کا ہو، کسی مسلک اور جماعت سے تعلق رکھتا ہو، کسی مشرب اور نقطہ نظر کا حامل ہو، اگر وہ مسلمان ہے تو وہ دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسلامی اخوت کے لیے اس کا مسلمان ہونا کافی ہے۔ ایسے کسی بھی مسلمان کے ساتھ وہی سلوک اور محبت ہونی چاہیے، جس کے بارے میں بروایت عبداللہ بن عمر رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

المسلم اخو المسلم، لا يظلمه ولا يسلمه ، من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته، ومن فرّج من مسلم كربة فرج الله بها كربة يوم القيٰمة، من ستر مسلما ستره الله يوم القيٰمة۔ [۱]

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو اس پر وہ ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظلم کرنے کے لیے کسی کے حوالہ کرتا ہے، جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی مشکل آسان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مشکل آسان کرے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرتا ہے یعنی اس کے عیب چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔

رحمت عالم حضرت محمد ﷺ کا یہ فرمان مسلمانوں کی اجتماعی اور سماجی زندگی کا نور ہے، غور کیجیے کہ مسلمان کو بھائی سمجھنے کا مطلب صرف زبان سے بھائی صاحب کہنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا ہے اور اس سلوک کا اظہار اس حدیث کی روشنی میں پانچ باتوں سے ہوتا ہے:

---

[۱] بخاری، کتاب المظالم، باب لایظلم المسلم المسلم

(۱) مسلمان بھائی پر ظلم نہ کرو۔
(۲) مسلمان بھائی کو کسی ایسے شخص کے حوالہ نہ کرو جو اس پر ظلم کرے۔
(۳) مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرو۔
(۴) مسلمان بھائی کی مشکل اور مصیبت کے وقت مدد کرو۔
(۵) مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرو، اس کے عیوب کو ظاہر نہ کرو۔

اس میں چھٹی بات یہ بھی ملا لیجیے کہ اگر کسی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو ان میں صلح کرا دو مگر بے جا طرف داری نہ کرو، یہ حکم قرآن میں ہے۔

بخاری و مسلم کی یہ حدیث دراصل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آج کے مسلمان اپنا کردار دیکھ سکتے ہیں اور اپنا جائزہ لے سکتے ہیں کہ کیا وہ دوسرے مسلمان سے وہی سلوک کرتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا؟ یہ صرف تعبیر اور مثال کی بات نہیں ہے بلکہ ایک حدیث میں سچ مچ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا آئینہ کہا گیا ہے:

ان أحدكم مرأة اخيه [۱] تم لوگ اپنے بھائی کا آئینہ ہو۔

آئینہ کی تین خوبیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سامنے کا چہرہ دکھاتا ہے، دل کا حال اور نیت نہیں بتاتا، دوسرے یہ کہ جب سامنے ہو تب چہرہ دکھاتا ہے پیٹھ پیچھے نہیں، اور تیسرے یہ کہ چہرہ جیسا ہے ویسا ہی دکھاتا ہے کم یا زیادہ نہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کی خوبی و خامی جو اسے نظر آتی ہے اصلاح کی خاطر بتا دیتا ہے، نیت پر حملہ نہیں کرتا۔ اسی وقت بتاتا ہے جب وہ بھائی سامنے ہو، پیٹھ پیچھے یا دوسروں کے سامنے اس کی برائی نہیں کرتا اور اس کی خوبی و خامی کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرتا۔

رسول پاک ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان بھائی پر پانچ حقوق گنائے ہیں۔ (۱) سلام کا جواب دینا (۲) مریض کی عیادت کرنا (۳) جنازہ میں

---

[۱] ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم

شرکت کرنا (۴) دعوت قبول کرنا (۵) چھینکنے والے کے الحمد للہ کہنے پر یرحمک اللہ کہنا۔[1]

مسلمانوں کے جو حقوق ہیں ان کی تفصیل بہت سی احادیث میں متفرق طور پر ملتی ہے کم وبیش لوگ جانتے بھی ہیں مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہمارا حقیقی بھائی ضرورت مند ہو تو اس کا تعاون کرتے ہیں، محروم ہو تو حق دلانے کی کوشش کرتے ہیں اور مظلوم ہو تو اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتے ہیں، مگر جب کوئی مسلمان بھائی ضرورت مند ہو، محروم ہو مظلوم ہو اور ہماری برادری، علاقہ، مسلک یا جماعت کا نہ ہو تو ہم میں تعاون کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا، یہ اسلامی اخوت اور مومن کی شان کے خلاف ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھیے ان کی اخوت اور محبت کی مثالوں سے سبق لیجیے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ ہے، ایک نوجوان مسافر اپنے اونٹ پر سوار سفر کر رہا ہے، ریگستان کی دھوپ میں دم لینے کے لیے ایک پیڑ کے نیچے آرام کرتا ہے اور اونٹ کو باندھ دیتا ہے، اس کی آنکھ لگ جاتی ہے اور اونٹ رسی کو توڑ کر برابر کے باغ میں گھس جاتا ہے، باغ کا بوڑھا مالک جب اونٹ کو اپنے باغ میں گھسا ہوا دیکھتا ہے تو آواز دیتا ہے اور پتھر اٹھا کر مارتا ہے جس سے اونٹ زخمی ہو جاتا ہے اور آنکھ ختم ہو جاتی ہے، نوجوان گھبرا کر اٹھتا ہے اور اونٹ کی حالت دیکھ کر غصہ میں آ جاتا ہے اور اسی پتھر سے باغ کے مالک کو مارتا ہے، مالک وہیں مر جاتا ہے، باغ والے کے بیٹے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور نوجوان مسافر کو پکڑ کر امیر المومنین حضرت عمرؓ کے سامنے قصاص یعنی بدلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے پیش کر دیتے ہیں، نوجوان اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے مگر سزا قبول کرنے سے پہلے ایک دن کی مہلت مانگتا ہے کہ وہ اپنے گھر جا کر واپس آ جائے، خلیفہ کہتے ہیں کہ کیا ضمانت ہے کہ تم سچ مچ واپس آ جاؤ گے، اس نے کہا اللہ گواہ ہے، خلیفہ نے کہا، کوئی تمہاری ضمانت لے تو میں تم کو اجازت دیتا ہوں،

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز

اس نے کہا یہاں کوئی مجھے نہیں جانتا، کون میری ضمانت لے گا، یہ سن کر بزرگ صحابیٔ رسول حضرت ابوذر غفاریؓ آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں اس نوجوان کی ضمانت لیتا ہوں، خلیفہ نے اسے اگلے دن تک کی مہلت دے دی، اگلے دن دیر لگی تو لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ نوجوان نہیں آئے گا اور قصاص میں حضرت ابوذر غفاریؓ کو جان دینی پڑے گی، دیر بعد ہانپتا کانپتا نوجوان آیا، دیر سے آنے کی معذرت کر کے کہنے لگا دراصل میرے باپ نے مرتے وقت ایک مال چھوڑا تھا، جسے میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا، میرا ایک بھائی ہے، اگر اسے بتائے بغیر میں قصاص میں مارا جاتا تو اللہ کے پاس اپنے بھائی کا حق دبانے کا مجرم ہوتا، اب میں اپنی غلطی کی سزا پانے کے لیے تیار ہوں۔ پھر وہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، حضور آپ مجھے پہچانتے نہیں تھے، پھر بھی آپ نے میری ضمانت لی، میں آپ کا بڑا احسان مند ہوں۔ صحابیٔ رسول نے فرمایا: میں نے تمہاری ضمانت اس لیے لی کہ کہیں قیامت کے دن میرے حبیب حضرت محمد ﷺ یہ نہ سوال فرمائیں کہ میری امت کا ایک شخص ضمانت کے لیے تمہاری طرف دیکھ رہا تھا اور تم نے میری اُمتی کی ضمانت اس لیے نہیں لی تھی کہ وہ اجنبی تھا؟

قصاص طلب کرنے والے بھائیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کے کہا، ہم اس نوجوان کو معاف کرتے ہیں اور اپنے والد کا قصاص بخش دیتے ہیں۔

مسلمان بھائیو! اس امانت اور ضمانت ، اخوت اور محبت کا کردار اب مسلمانوں سے غائب ہو رہا ہے، یہ اسلامی کردار کہیں کھو گیا ہے، اسے ڈھونڈو اور اپنے آپ کو اسلامی اخوت کا محافظ بناؤ۔ اللہ ہم سب کے دلوں میں آپسی محبت اور اخوت پیدا کر دے۔ (آمین)

اتحاد کی برکت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم.

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَّکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْہَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ (آل عمران-۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا، اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک امت بنایا ہے، ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا ہے، ایک کتاب کو ان کی زندگی کا دستور بنایا ہے اور ایک آخری نبی کی اطاعت کا مطالبہ کیا ہے، مسلمانوں کو اختلاف و انتشار، تفرقہ اور تنازع اور باہمی جنگ و جدال سے منع کیا ہے اور ایک جسم کے اعضا کی طرح متحد اور معاون رہنے کا حکم دیا ہے،

مسلمان جب تک اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے رہیں گے وہ تسبیح کے دانوں کی طرح مقدس، مربوط اور مضبوط رہیں گے اور موتی کی طرح قیمتی رہیں گے۔ جب وہ بکھر جائیں گے، آپسی افتراق و انتشار کا شکار ہو جائیں گے تو کنکر و پتھر کی طرح بے قیمت اور بے وقعت ہو جائیں گے۔

یہ ساغر و شیشہ و لعل و گہر سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں

دنیا کی شیطانی طاقتیں ہمیشہ سے اس تاک میں لگی ہوئی ہیں کہ وہ مسلمانوں کو متحد نہ ہونے دیں اور ان کو آپس میں لڑا کر ان کی طاقت کو کمزور کر دیں، پھر ان کو اپنے مفادات کا لقمہ بنالیں یا ان کو سیاسی غلامی میں مبتلا کر دیں، حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی یہودی، مشرکین اور منافقین مسلمانوں کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ کبھی مدینہ کے مسلمان قبائل میں جھگڑا کراتے اور کبھی انصار اور مہاجرین میں تصادم کی کوشش کرتے، مگر رسول پاک ﷺ ہمیشہ مسلمانوں کی صفوں پر نظر رکھتے اور ان میں شگاف پیدا ہونے نہ دیتے، مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج کے درمیان سو سال سے جنگ ہوتی آرہی تھی۔ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور ایک دوسرے پر قاتلانہ حملے کرتے رہتے تھے، یہ جنگ 'بعاث' کے نام سے مشہور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں قبیلوں کو کلمہ اسلام پر متحد کر دیا اور ان کی دشمنیاں بھلا کر ان کے دل جوڑ دیے۔

یہودیوں کو ان دونوں قبیلوں کا مل جانا اور اسلام کے زیر سایہ بھائی بن جانا گوارہ نہ ہوا، چنانچہ ایک یہودی شماس بن قیس نے ایک دوسرے یہودی کو آمادہ کیا کہ جب یہ دونوں قبیلے ایک ساتھ بیٹھے ہوں تو کسی ترکیب سے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دے، چنانچہ ایک موقع پر جب اوس و خزرج کے دونوں قبائل موجود تھے تو اس یہودی نے جنگ بعاث کے اشعار سنانا شروع کیے، اشعار کا سننا تھا کہ دونوں قبیلوں

کے دلوں میں دشمنی کی بجھی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور دونوں ایک دوسرے سے پہلے زبانی پھر ہتھیاروں سے لڑنے پر اتر آئے، اسی دوران رسول پاک ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کو لے کر وہاں آپہونچے اور فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں پھر یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ اللہ نے تم کو جاہلیت سے نکال کر اسلام کی روشنی عطا کی ہے۔ اسی واقعہ کی طرف سورہ آل عمران کی تلاوت کردہ آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن پاک نے مسلمانوں کو مزید ہدایت کی ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلاَ تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال-۴۶)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

جب جب مسلمانوں نے اللہ کے اس حکم کو نظر انداز کیا ہے اور باہمی اختلاف اور لڑائی کا راستہ اختیار کیا ہے تب تب ان کو تباہی اور بربادی اور ذلت و خواری کا راستہ دیکھنا پڑا ہے۔ اندلس میں مسلمانوں نے سینکڑوں سال تک حکومت کی، ان کی شان و شوکت کے تذکرے آج بھی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ایسی دنیا آباد کی کہ آج بھی اہل یورپ حیرت سے ان کے محلات اور آثار کو دیکھتے ہیں، علم و ثقافت کا وہ معیار قائم کیا کہ دنیا نے اس سے بڑا سبق سیکھا، ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کو اپنا محل، اپنی تہذیب و تمدن کے آثار سب کو چھوڑ کر ملک سے نکل جانا پڑا۔

ہوا یہ کہ جب وہ اندلس میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے تو وہ کلمہ توحید کی بنیاد پر متحد اور مربوط تھے اور جب ان میں قبائلی عصبیت پیدا ہوائی، موحدون اور مرابطون کی چپقلش رونما ہوئی، یمنی اور حجازی کے جھگڑے شروع ہوئے، نجدی اور صحرائی کشمکش

نے سر اٹھایا اور ایک خاندان نے دوسرے خاندان سے اقتدار چھیننے کے لیے آپس میں تلوار اٹھائی، تو دشمنوں نے موقع کو غنیمت جانا، ان کو لڑنے میں مدد پہونچائی اور جب یہ مسلمان آپس میں لڑتے ہوئے کمزور ہوگئے تو عیسائیوں نے ان کو مار بھگایا اور اندلس پر قبضہ کرلیا، مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ان کی عزت وآثار کو خاک میں ملادیا۔

اندلس کا آخری خلیفہ عبداللہ عامر المصور جب اندلس چھوڑ کر واپس جارہا تھا اور سمندر کے کنارے کھڑی کشتیاں اس کا انتظار کررہی تھیں تو وہ اپنی بربادی پر زاروقطار رورہا تھا، پہاڑی کی اوٹ سے ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا نکلا اور بولا یہ دن تم کو دیکھنا تھا، تم نے آپس کی لڑائی میں مسلمانوں کو قتل کروایا، میرے چار جوان بیٹے جو میرے بڑھاپے کا سہارا بنتے تم نے آپس کی لڑائی میں شہید کروادیے، میں نے تمہارا شہر چھوڑ دیا اور پہاڑوں میں پناہ لے لی اور میں منتظر تھا کہ ایک دن عیسائی تم کو رسوا کر کے نکالیں گے، تو وہ آج کا دن ہے، ابھی کیا روتے ہو، قیامت میں تم کو بہت رونا ہے، یہ کہہ کر بوڑھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا پہاڑوں میں واپس چلا گیا، عامر المصور کو ایسا لگا جیسے آج ہی قیامت ہے اور آج ہی اس کے حساب کا دن ہے۔

شاید ہم مسلمانوں نے آج بھی اس تاریخی حادثہ سے سبق نہیں لیا ہے، اسلام کو جتنا نقصان دشمنوں نے نہیں پہونچایا ہے اتنا نقصان ہمارے آپسی اختلافات اور خانہ جنگی نے پہونچایا ہے، افغانستان، عراق اور شام پر دشمنوں نے حملہ کیا، مسجدوں کو مسمار کیا، بہنوں کی آبروریزی کی، ہمارے علماء کو قتل کیا، ہمارے اداروں اور بزرگوں کے آثار پر بم گرایا، تو مسلمان ممالک بھی دشمنوں کے ساتھ رہے اور اپنے کلمہ گو بھائیوں کے قتل عام کا ذریعہ بنے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنَ

(المومنون-۵۲)

بے شک یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں،

توتم مجھ ہی سے ڈرو۔

مگر آج وہ دور آیا ہے کہ اللہ سے ڈرنے کے بجائے دشمنان اسلام سے خوف زدہ ہو کر خود بعض مسلمانوں نے رسول اللہ کی امت کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسلمانوں میں داخلی طور پر، خاندان اور قبیلہ کی منافرت پھر زندہ ہوگئی ہے، وطن اور علاقہ کی بنیاد پر تفریق پھر پیدا ہوگئی ہے، مسلک اور قومیت کی جنگ پھر ابھر رہی ہے، پارٹی اور جماعت کی رسہ کشی پھر شروع ہو رہی ہے، برادری وادنے زور پکڑ لیا ہے اور اسلام کی مخالف طاقتوں نے ان اختلافات کو ہوا دینا شروع کر دیا ہے، مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث یاد رکھنی چاہیے کہ:

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضا [۱]

ایک مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے، جس کی اینٹیں ایک دوسرے کو تقویت پہونچاتی ہیں۔

اگر مسلمان ان جھگڑوں میں پڑیں گے تو بنیادیں کمزور ہو جائیں گی اور ملت کی عمارت ڈھے جائے گی اور اگر وہ ان اختلافات کو بھول کر دین کی حفاظت کے لیے باہم متحد رہنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً وہ خود بھی طاقت ور رہیں گے اور اسلام کی سربلندی کا ذریعہ بنیں گے۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں کسی وجہ سے جھگڑا ہو جائے، تو خود مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح صفائی کرائیں، کیونکہ لڑنے والوں میں صلح کرانا اور ان کو متحد کرنا بڑی نیکی ہے، بلکہ اگر زیادتی کرنے والے سے لڑنا پڑے تو اس کی بھی اجازت اللہ نے دی ہے، ارشاد ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ

---

[۱] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب تشبیک الاصابع فی المسجد

حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ۔ (الحجرات-۹)

اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

مسلمانوں میں صلح صفائی کی کوشش کرنا روزہ نماز سے بھی زیادہ اہمیت اور ثواب کا حامل ہے۔ حضرت ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تم کو روزہ، صدقہ اور نماز سے بھی زیادہ مرتبہ کی چیز نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بے شک ارشاد فرمائیں، تو آپ نے فرمایا ''اصلاح ذات البین'' یعنی لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرنا، آپ نے فرمایا کہ مونڈنے والی چیز لوگوں کے درمیان فساد برپا کرنا اور تعلقات کو بگاڑنا ہے'' [۱]

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حبل اللہ یعنی اللہ کی رسی کو تھامنے کے لیے متحد ہونے کا حکم دیا ہے، اللہ کی رسی قرآن کریم ہے، اور مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد ہے، قرآن قیامت تک ہمارے لیے رہنما اور ہماری زندگی کا دستور ہے، اسی کی بنیاد پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں اتحاد ہوسکتا ہے۔ قرآن اور اسوۂ رسول ﷺ کو چھوڑ کر امت میں اتحاد کی کوشش کرنا فضول ہے، ایسا اتحاد نہ مطلوب ہے، نہ پائیدار ہے اور نہ اس میں برکت ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ''جب اس امت کے رہنما قرآن سے فیصلہ کرنا چھوڑ دیں گے تو اللہ اس امت کے اندر اختلاف ڈال دے گا۔ [۲]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اتحاد کی قوت عطا فرمائے۔ (آمین)

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین

[۲] ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب العقوبات

حج روحانی اور اخلاقی تربیت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ
الکریم اما بعد: قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید.
اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى وَاتَّقُونِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (البقرہ:۱۹۷)

حج کے چند معلوم مہینے ہیں، جس پر ان مہینوں میں حج فرض ہو تو اس کے لیے جنسی عمل کرنا، فسق و فجور کرنا، جھگڑا کرنا، حج میں جائز نہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے اور زادراہ لیا کرو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے اور اے عقل مندو مجھ سے ڈرو۔
بروایت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من حج فلم یرفث ولم یفسق غفر له ما تقدم من ذنبه[1]

جس نے حج کیا اور نہ جنسی عمل کیا اور نہ برا کام کیا اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

حج اللہ کے دربار میں بلکہ اس کے حضور میں خودسپردگی کا نام ہے، اس لیے حاجی کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ دوران حج کسی طرح کے گناہ اور جرم وخطا کا ارتکاب

---

[1] ترمذی، ابواب الحج

نہ کرے۔ نہ جنسی، نہ اخلاقی اور نہ معاشرتی، نہ کسی عورت پر بری نگاہ ڈالے، نہ کسی کے مال پر غلط نگاہ ڈالے، نہ کسی کی چیز اٹھائے، نہ کسی سے لڑائی جھگڑا اور بدکلامی کرے، بلکہ حسن معاملہ اور حسن کردار کا مظاہرہ کرے، خوش گفتاری اور خوش کلامی کو اپنا وطیرہ بنائے۔ حج جنسی، اخلاقی اور تہذیبی پاکیزگی کا ایک خدائی نصاب ہے۔ اگر حاجی اس نصاب کو پورا کرتا ہے تو اس کا حج مکمل ہوتا ہے اور اگر وہ اس نصاب کو پورا نہیں کرتا تو حج کے رسوم ادا کرنے کے باوجود حج کی قبولیت سے محروم رہتا ہے۔

حاجی جب ارکان حج ادا کرتا ہے تو ہر ایک رکن کی ادائیگی کے ساتھ اسے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اسے ایک خاموش مگر پر اثر پیغام بھی ملتا ہے۔ حاجی اگر شعور اور احتساب نفس کے ساتھ ان ارکان کو ادا کرے تو وہ اس پیغام کو محسوس کر سکتا ہے اور مسرور ہو سکتا ہے۔ مثلاً جب حاجی طواف کے لیے حاضر ہوتا ہے، خانہ کعبہ کے گرد دیوانہ وار چکر لگاتا ہے اور لبیک الھم لبیک کی صدا لگاتا ہے، تو اسے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا کے سب لوگ چکر کاٹتے ہیں مگر اپنے مفادات کے گرد، اپنی ضروریات کے گرد، اپنی خواہشات اور اپنی توقعات کے گرد، اپنے اہل وعیال اور اپنے مال واسباب کے گرد۔ انسان کی عمر تمام ہو جاتی ہے مگر اس کی گردش تمام نہیں ہوتی۔ طواف کعبہ مومن کو یہ پیغام دیتا ہے کہ دنیا اور اس کی مصروفیات کے مقابلہ میں، نفس اور اس کی خواہشات کے مقابلہ میں اللہ وحدہ لاشریک کی مرضی کے گرد چکر لگانا دینی سعادتوں اور روحانی ترقیوں کا ذریعہ ہے۔

حاجی یہاں صرف طواف ہی نہیں کرتا بلکہ دین و دنیا کی سعادت اور روحانی و اخلاقی پاکیزگی کی دعا بھی مانگتا ہے۔ اللہ اپنے گھر میں صدق دل سے مانگی ہوئی دعا کو ضرور قبول کرتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے جو دعائیں سکھائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے **الھم انی اعوذ بک من الشقاق ، والنفاق و من سوء الاخلاق و من کل امر لایطاق**۔ اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں اختلاف سے، نفاق سے، بداخلاقی سے اور

طاقت سے زیادہ امر ہے۔

اسی طرح جب حاجی صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑتا ہے تو اس کے وجود میں ایک تاریخی مثال جلوہ گر ہوتی ہے جو ایک مظلوم اور معصوم خاتون اور اس کے شیر خوار بچہ کی سبق آموز داستان پر مشتمل ہے اور جسے تاریخ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کے نام سے جانتی ہے۔ بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جب حضرت ابراہیمؑ مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو چھوڑ کر واپس چلے گئے اور ادھر ان کا توشہ اور پانی ختم ہو گیا تو حضرت ہاجرہ پریشانی کے عالم میں کبھی صفا کی پہاڑی پر اور کبھی مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر بے تاب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتیں، شاید کوئی قافلہ نظر آئے، کہیں پانی کا سراغ ملے تاکہ اپنے شیر خوار اسماعیلؑ کی جان بچائیں، قافلہ تو کوئی نظر نہیں آیا البتہ رحمت الٰہی کو جوش آیا اور حضرت اسماعیل کی ایڑیوں کی رگڑ نے پتھر کے نیچے پانی کے چشمے کو پالیا اور وہ ماں بیٹے کی زندگی کا پیغام بن گیا پھر اللہ نے صفا و مروہ کو شعائر حج کا حصہ بنادیا۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَن تَطَوَّعَ خَيْراً فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ۔ (البقرہ:۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہے۔ تو جس نے حج یا عمرہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو بھلائی کرے اپنی خوشی سے تو اللہ تعالیٰ قدرداں اور جاننے والا ہے۔

مال دار انسانوں کو حج میں صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑ لگانے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ یاد رکھیں کہ وہ ایک مظلوم خاتون کے نقش قدم کے اتباع میں دوڑ رہے ہیں۔ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنا تو انسان ہی نہیں حیوانوں کا بھی خاصہ ہے مگر غریبوں، ناداروں، ضرورت مندوں،

دکھیاروں کے غم کا مداوا بننا، ان کی ضرورتوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنا، صرف خدا کے نیک اور مقرب بندوں کا حصہ ہے۔ جب انسان دوسروں کی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتوں کی تکمیل کی سبیل پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا: **من کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته** [۱] جو اپنے بھائیوں کی ضرورت پوری کرتا ہے اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

حج کا رکن اعظم وقوف عرفہ ہے، جب حاجی میدان عرفات میں طلوع شمس سے لے کر غروب آفتاب تک قیام کرتا ہے، حمد و مناجات سے اپنے وجود کو منور کرتا ہے اور توبہ و استغفار کے پانی سے اپنے میل کچیل کو دھوتا ہے تو اسے روحانی سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ پھر مسجد نمرہ کے امام کا خطبہ نبی اکرم ﷺ کا وہ آفاقی پیغام یاد دلاتا ہے جو حقوق انسانی کا پہلا عالمی منشور ہے، دنیا میں طاقت ور کے حقوق کی پاسبانی ہوتی ہے اور کمزور کے حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔ دولت مند کو حقوق مل جاتے ہیں اور غریبوں کے حقوق تلف کیے جاتے ہیں۔ اس ظالمانہ رواج کو بدلنے کے لیے رسول پاک نے فرمایا تھا:

> **الا ان دماء کم و اموالکم و اعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا فلیبلغ الشاهد الغائب** [۲]
>
> سنو! تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا مقدس دن اس مہینہ اور اس شہر مکہ میں۔ تم میں سے جو لوگ موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہونچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

حجاج کرام ہر سال اس پیغام کو لے کر آتے ہیں اور اپنے خویش و اقارب

---

[۱] مسلم، کتاب البرّ والصلة

[۲] بخاری، کتاب العلم

تک پہونچاتے ہیں۔ اگر اس پیغام کو دل نشیں کرلیا جائے تو حقوق انسانی حفاظت کے لیے نہ کسی کانفرنس کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی تحریک کی۔ اگر حاجی دوسرے انسانوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتا تو گویا اس نے حج ہی نہیں کیا، جس نے یہ سبق یاد نہیں کیا اس نے حج سے کوئی سبق ہی نہیں لیا، جس نے حقوق انسانی کی معرفت حاصل نہیں کی اس نے گویا عرفہ کا وقوف نہیں کیا۔ وقوف عرفہ اللہ اور بندوں کے حقوق کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

حاجی دن تو میدان عرفات میں گذارتا ہے مگر رات مشعر حرام میں گذارتا ہے، دن بھر کی مشقت کے بعد رات کو سونا چاہتا ہے مگر اللہ رب العزۃ اس کی تقدیر کو یہ کہہ کر جگاتا ہے۔

فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُواْ اللّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّآلِّينَ ۔(البقرہ:۱۹۸)

پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو، اور اس کو اسی طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو ہدایت یاب کیا اگرچہ تم اس سے پہلے گم گشتہ راہ تھے۔

مشعر حرام میں شعور انگیز ذکر کی حلاوت حاصل کرنے کے لیے حاجی مزدلفہ کی پہاڑیوں میں پروانہ کی طرح منتشر ہو کر دست دعا بلند کرتا ہے۔ نفس کے تاریک گوشوں میں چھپی خواہشات اور قلب و ذہن کے کونوں میں چپکے ہوئے خود بینی کے جراثیم کو نکالتا ہے اور یاد الٰہی کا مشعل جلاتا ہے۔ یہ ذکر اسے بے خودی سکھاتی ہے اور لذت آشنائی سے ہم کنار کرتی ہے بقول اقبال۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

دن کے اجالے میں حاجی پھر منیٰ کی طرف چلتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کے حصول اور اس کے احکام کی مخلصانہ تعمیل کے درمیان حائل ہونے والے شیطان پر سات کنکریاں برساتا ہے۔ شیطان نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی اور اللہ کی راہ میں قربانی دینے سے باز رکھنے کی جسارت کی تھی، رمی جمار اس کی یادگار ہے۔ مقصد زندگی کے حصول میں حائل شیطانی رکاوٹوں کو دور کرنے، دوست و دشمن کی معرفت حاصل کرنے اور ازلی دشمن سے مقابلہ کرنے کی یہ شعوری علامت ہے۔ حاجی اگر شیطانی قوتوں کو پہچانتا ہے، شیطان کی چالوں سے باخبر ہے اور ان کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو وہ رمی جمار کا حق ادا کرتا ہے، ورنہ وہ رسم تو ادا کر سکتا ہے مگر سنت ابراہیمی پوری نہیں کر سکتا۔

قربانی حج کا بڑا رکن ہے، رمی جمار کے بعد حاجی جانور کی قربانی کرتا ہے پھر حلق کرتا ہے، قربانی مال اور مفادات کی قربانی کی علامت ہے اور حلق جان کی قربانی کی علامت ہے۔ یہ علامتیں سکھاتی ہیں کہ اللہ کی راہ میں تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کا سلیقہ سیکھو، اگر اللہ کے نام پر حاجی نے جانور قربان کر دیا مگر اس کے مطالبہ پر جان نچھاور کرنے سے جی چرایا تو یہ قربانی اللہ کے یہاں نہ رنگ لائے گی اور نہ اس کا کچھ اجر ملے گا۔ جب تک جانور کے بہتے خون کی طرح ایثار و قربانی کا جذبہ تازہ اور گرم نہ ہو حاجی اللہ کی قربت کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔

حاجی جب حج کے مناسک پورے کر لیتا ہے تو اس کا روحانی سفر ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔ وہ عشق و محبت کی درس گاہ میں جو سبق پڑھتا ہے۔ اسے دہرانا اور یاد کرنا اس کی روحانی ضرورت بن جاتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو حج نصیب کرے۔ (آمین)

حج اورقربانی

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد
قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالاً وَّعَلٰی کُلِّ
ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ . لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ
وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَارَزَقَھُمْ
مِنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ
الْفَقِیْرَ. (الحج ۲۸-۲۷)

اورلوگوں کوحج کے لیے پکارو، وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اوراونٹوں پر سوار ہوکر آئیں ،تاکہ وہ منافع دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقررہ دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں ۔خود بھی کھائیں اور تنگدست محتاج کو بھی کھلائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اس گھر کا حج کرنے کے لیے پکاریں ،حضرت ابراہیمؑ نے پہاڑی پر چڑھ کر حج کے لیے پکارا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی پکار کو نیک روحوں تک پہونچایا، اوراس کے بعد سے خانہ کعبہ میں حج وطواف کا سلسلہ شروع ہوگیا جو قیامت تک جاری رہے گا،آج حج کا سفر آسان ہے، چند گھنٹوں میں ہوائی جہاز دنیا کے کسی بھی حصہ سے حاجیوں کو مکہ مکرمہ پہونچادیتے ہیں ،مگر پچھلے دنوں میں جب تیز رفتار

سواریاں ایجاد نہ ہوئی تھیں تو انسان یا تو پیدل سفر کرتا تھا یا جانوروں کی سواری کر کے پہونچتا تھا، یہ مشقت بھرا سفر دراصل حضرت ابراہیمؑ کی اس مشقت کی یاد دلاتا تھا جو انہوں نے عراق سے ہجرت کر کے مکہ تک پہونچنے میں اٹھائی تھی، اور اس کا مقصد صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا تھا اور اس کے گھر کو آباد کرنا تھا جس کا ذکر سورہ ابراہیم میں ہے۔

یوں تو عبادت کے اور بھی طریقے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ مگر حج کی اہمیت یہ ہے کہ نماز اور روزہ صرف جانی عبادت ہے، اس میں پیسہ خرچ نہیں ہوتا، زکوٰۃ صرف مالی عبادت ہے، اس میں جسمانی محنت نہیں ہوتی، حج جانی اور مالی دونوں عبادت ہے اس کے سفر میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے اور ارکان کو بجالانے میں محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے حج انہیں لوگوں پر فرض کیا گیا ہے، جو مکہ مکرمہ تک پہونچنے کی استطاعت رکھتے ہوں اور زندگی میں صرف ایک بار فرض کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً ؕ وَّمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران۔۹۷)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو بیت اللہ تک پہونچنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس کا انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جن کو دولت اور جوانی اللہ نے دی ہے مگر وہ فریضہ حج کو ٹالتے رہتے ہیں، بڑھاپے میں حج کو جاتے ہیں، اس وقت حج کے ارکان ان سے صحیح طریقہ سے ادا نہیں ہوتے، حج بلاشبہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے فراغت

چاہتا ہے مگر زندگی کا کیا بھروسہ ہے؟ جب مالی وسائل اور فرصت نصیب ہوں تو ہر مسلمان کو حج کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ کیونکہ حج ایسی عبادت اور نیکی ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے اور ایسی اخلاقی تربیت ہے جس کی مثال نہیں ہے، حاجی اپنے حج سے جہاں روحانی لذت حاصل کرتا ہے وہاں اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوْقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرۃ۔۱۹۷) جس نے ایام حج میں فریضہ حج ادا کیا وہ حج میں بے حیائی، برائی اور جھگڑا لڑائی نہ کرے۔

حج میں بندگی اور سر افگندگی، عاشقانہ اور مستانہ کیفیت کا جو روح پرور ماحول ہوتا ہے اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی، احرام کے نام پر دو کھلی چادریں پہننا، کعبہ کے گرد چکر لگانا، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، عرفات کے کھلے میدان میں دن گذارنا، مزدلفہ کی وادی میں رات گزارنا، شیطان لعین کو کنکر مارنا، اللہ کے نام پر قربانی دینا، سر کا بال منڈانا، پھر خانہ کعبہ کا طواف کرنا اور کثرت سے ذکر و تلاوت کا اہتمام کرنا۔ ایسے مناسک ہیں جن کا تعلق صرف عمل کرنے سے ہے، جن بندوں نے حج کیا ہے وہ اللہ کی عطا کردہ اس لذت بے خودی سے واقف ہیں۔ اسی لیے تو اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

العمرة الى العمرة كفارة بينهما والحج المبرور له جزاء الا الجنة [۱]

ایک عمرہ دوسرے عمرہ کے مابین کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا کوئی بدلہ نہیں سوائے جنت کے۔

حج میں قربانی کے جو دن ہیں یعنی دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ، ان دونوں میں ایک طرف تو قربانی کا حکم ہے اور دوسری طرف اللہ کا کثرت سے ذکر

[۱] بخاری، ابواب العمرۃ، باب وجوب العمرۃ وفضلھا

کرنے کا حکم ہے، ان دونوں حکم کو بجالانے میں پوری دنیا کے مسلمان شریک ہیں، اس عبادت کے لیے حج کی شرط نہیں ہے، یعنی حج کے سارے ارکان ومناسک تو مکہ مکرمہ میں انجام پاتے ہیں، مگر قربانی اور ایام تشریق کا تلبیہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی انجام پاتے ہیں۔ اور یہی دو اعمال ایسے ہیں جن کی وجہ سے سارے مسلمان حج کے عمل میں جزوی طور پر شریک ہوجاتے ہیں۔

حج کی طرح قربانی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے۔ اللہ نے خواب میں ان کو دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کررہے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے خواب بیان کرکے ان کی مرضی معلوم کی، فرماں بردار بیٹے نے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ باپ نے بیٹے کو لٹا کر گردن پر چھری چلانے کا ارادہ کیا تو رحمت الٰہی نے یہ کہتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ تھام لیا کہ تم نے خواب پورا کردیا، امتحان ختم ہوگیا، مقصد آزمائش تھی، حضرت اسماعیلؑ کی شہادت نہیں تھی۔ اور ان اس کی جگہ میڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا، یہی سنت ابراہیمی آج تک مسلمانوں کے دینی ذوق و جذبہ کی رہنمائی کررہی ہے۔ اللہ تعالیٰ قربانی کا یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ . وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ . اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ . وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ . وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ. سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الصفت:۹-۱۰۳)

جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کردیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرادیا اور ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں

دے کر اسے چھڑا لیا۔ سلام ہو ابراہیم پر۔

قربانی تقرب الٰہی کی ایک علامت ہے، جس میں مومن یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ کے آگے سر جھکانے اور اس کے حکم پر نفس کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ جب تک دل میں خشیت نہ ہو اور اللہ کی مرضی پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ نہ ہو اس وقت تک قربانی قبول نہیں ہوتی، رسم ادا ہو سکتی ہے، سنت ادا نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلاَ دِمَائُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج-۳۷)

جانور کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہونچتا مگر اسے تمہارا تقویٰ پہونچتا ہے، اس نے ان جانوروں کو تمہارے لیے اسی طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو، اور اے نبی نیکوکاروں کو خوشخبری دے دو۔

قربانی کرنے والا پہلے نماز عید الاضحیٰ ادا کرے پھر قربانی کرے، یہی سنتِ رسول ﷺ ہے، اسے اپنے دل کی کیفیت پر اور جانوروں کی صحت پر بھی نظر رکھنی چاہیے، دل میں تقویٰ ہو اور جانور صحت مند ہو، مومن دینی و اخلاقی عیب سے پاک ہو اور جانور جسمانی عیب سے پاک ہو تو انشاء اللہ قربانی مقبول ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار طرح کے جانور قربانی کے لیے درست نہیں ہیں۔ ایک کانا جس کا کانا پن ظاہر ہو، دوسرے بیمار جس کی بیماری ظاہر ہو، تیسرا لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو، چوتھا بوڑھا کمزور جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔[1]

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا

قربانی کے بڑے جانور مثلاً اونٹ، بیل، گائے، بھینس وغیرہ سات لوگوں کی طرف سے قربان کیے جاسکتے ہیں اور چھوٹے جانور مثلاً مینڈھا بکرا وغیرہ کی ایک شخص کی طرف سے قربانی ہوگی۔ قربانی گھر کے ذمہ دار پر واجب ہے، گھر کے ہر فرد پر قربانی واجب نہیں ہے۔

قربانی کرتے وقت یہ دعا پڑھے:

اِنَّ صَلاَتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لاَ شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (الانعام:۱۶۲-۱۶۳)

کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جنیا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلے سر جھکانے والوں میں سے ہوں۔

قربانی کا گوشت خود بھی کھائے، رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی کھلائے اور غریبوں اور ناداروں میں بھی تقسیم کرے اور اللہ سے قبولیت کی دعا کرے۔

اللہ ہم سب کی قربانی کو قبول فرمائے۔ (آمین)

اسلام اور امن وسلامتی

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ الکریم اما بعد

قال اللّٰہ تعالیٰ فی القران المجید. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم .

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْآ اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ. (الانعام-۸۲)

امن ان لوگوں کے لیے ہے اور ہدایت یاب وہ ہیں جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔

اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے، اسلام کے مزاج میں اور اس کے مقصد اور طریقہ کار میں یہاں تک کہ ایمان واسلام کے الفاظ میں امن وسلامتی کا معنی پوشیدہ ہے،لفظ ایمان میں امن اور لفظ اسلام میں سلامتی کا معنی پایا جاتا ہے،اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک نام ’’المومن‘‘یعنی امن دینے والا اور ایک نام ’’السلام‘‘یعنی سراپا سلامتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِی لاَ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ. (الحشر-۲۳)

وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس سراسر سلامتی، امن دینے والا نگہبان ۔

اسی لیے مسلمان اپنی پانچ وقت کی نمازوں کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی صفت امن وسلامتی کا حوالہ دے کر امن وسلامتی کی دعا کرتا ہے اور کہتا ہے:

اللھم انت السلام ومنک السلام، تبارکت یا ذا الجلال والاکرام ۔[1]

اے اللہ تو ہی سلامتی ہے اور تجھ سے ہی سلامتی حاصل ہوتی ہے تیری ذات بابرکت اور عظمت واکرام کی حامل ہے۔

اسی طرح ہر مسلمان کو یہ حکم ہے کہ جب وہ دوسرے مسلمان سے ملے، کسی کے یہاں جائے، کسی مجلس میں پہونچے، کسی گھر میں داخل ہو تو سب سے پہلے امن و سلامتی کا پیغام سلام کے ذریعہ دے، یعنی یہ کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ سماج میں امن وسلامتی کا یہ آغاز بھی ہے اور اظہار بھی، اس کا جواب بھی دوسرے لوگ اسی طرح دیں یعنی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

امن وسلامتی کا جو پیغام اسلام نے دیا ہے وہ ہمہ گیر ہے اور ہمہ جہت ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اسلام کی دعوت کی روح امن وسلامتی ہے، اسلام انسانوں کو امن وسلامتی کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (یونس-۲۵)

اللہ تم کو سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے اور جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جتنے رسولوں اور نبیوں کو انسان کی رہنمائی کے لیے بھیجا وہ سب اسی امن وسلامتی کی دعوت دینے والے تھے اور معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدامنی اور فتنہ وفساد کو روکنے کی جدوجہد کرتے تھے، ہر نبی اپنے ملک، معاشرہ اور ماحول کو پرامن بنانے کی کوشش کرتے تھے، اس کی بہترین مثال سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جب وہ عراق کے حکمراں نمرود کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مکہ مکرمہ ہجرت کر کے

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الصلاۃ، باب مایقال بعد التسلیم

آئے، تو اللہ سے دعا مانگی کہ اس شہر کو تو امن وسلامتی کا گہوارہ بنادے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، قرآن میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ . (البقرہ-۱۲۶)

ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں کو ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے، جو ان میں سے ایمان لائیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس شہر مکہ کو پرامن بنانے کی جو دعا کی اور کوشش کی اس کے نتیجہ میں مکہ مکرمہ شہر امن ہی نہیں بنا بلکہ "حرم" بھی قرار پایا، جس کی حدود میں انسانوں، جانوروں اور پرندوں تک کی جان کو امن مل گیا۔ اسی طرح جب مکہ کے کافروں نے آخری رسول محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرامؓ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، ان کے قتل کے درپے ہوئے تو محمد ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح شہر مدینہ کو پرامن بنانے کی دعا کی اور اس کو بھی حرم قرار دیا، چنانچہ اب صرف مکہ ہی حرم نہیں مدینہ منورہ بھی حرم ہے اور مسلمان عقیدت سے دونوں شہروں کو حرمین شریفین کے پاکیزہ لقب سے یاد کرتے ہیں۔

انبیاء کرامؑ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ جس ملک اور سماج میں رہتے ہیں اسے پرامن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک اور روشن مثال خود محمد عربی ﷺ کی سیرت سے ملتی ہے، جب آپ مدینہ تشریف لائے تو وہاں کی مقامی آبادی خاص طور پر یہودی قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع وغیرہ کو اکٹھا کیا اور پرامن بقائے باہم کا ایک تاریخی معاہدہ کیا جسے سول سوسائٹی کا پہلا تحریری معاہدہ یا دستور کہا جاسکتا ہے، اسلامی تاریخ میں یہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے اور اکیاون دفعات پر مشتمل ہے۔

میثاق مدینہ کی روح یہ ہے کہ جس سماج میں مختلف مذاہب، عقائد، ذات و

برادری اور پیشے وقومیت کے لوگ رہتے ہوں ان کو باہم پر امن زندگی گزارنے کے لیے باہمی دفاع، تعاون، احترام اور رواداری کے اصولوں کو اپنانا چاہیے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ حضورﷺ کے آنے سے پہلے مدینہ کے مختلف قبیلے آپس میں کس طرح لڑتے تھے، ان میں خونریز جھڑپیں ہوتی تھیں، بدلہ لینے کی کاروائی پشتہا پشت تک چلتی تھی، اوس وخزرج کی لڑائی بہت مشہور ہے، یہودیوں اور مشرکوں کے جھگڑے معلوم ہیں، رسول اللہﷺ نے اپنی حکمت، بصیرت اور فراست سے مدینہ کا جو پر امن ماحول بنایا وہ مشرکین مکہ کو ایک آنکھ نہ بھایا، انھوں نے اس امن کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک طرف مدینہ کے قبائل کو اکسایا، دوسری طرف مسلمانوں کو دھمکیاں دیں اور ان پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں، اس کے نتیجہ میں بدر واحد اور خندق وغیرہ کی جنگیں ہوئیں، اس کے باوجود کہ مشرکین ظالم اور جابر تھے، مسلمانوں کو پریشان کیا تھا، ان پر جنگ تھوپی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر یہ لوگ کمزور ہوکر تم سے امن اور صلح کی درخواست کریں تو تم ان کی درخواست قبول کرلو:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال-۶۱)

اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہوجاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

جنگ کے علاوہ رسول اللہﷺ نے کبھی کسی انسان پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اپنی امت کو بھی تعلیم دی کہ وہ ناحق کسی پر دست درازی نہ کریں اور زبان یا ہاتھ پاؤں سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہونچائیں۔ آپﷺ نے مومن کی پہچان بتائی **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده**[۱] مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی برائی سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نسائی شریف کی روایت میں مسلم کی جگہ الناس

---

[۱] بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ

کا ذکر ہے یعنی مسلمان وہ ہے جس کے شر سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ نبی علیہ السلام نے اسلام کی یہ جو علامت بیان فرمائی ہے کہ انسان دوسروں کو تکلیف نہ دے، یہی دراصل سماج میں امن قائم کرنے کی بنیاد ہے۔

ناحق کسی کو ستانا، کسی پر ظلم کرنا اور کسی کی جان لینا اسلام میں بہت بڑا جرم ہے، کسی کو ناحق مار ڈالنے کا گناہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص پوری سوسائٹی کو قتل کرنے کا گنہگار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَّمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (المائدہ-۳۲)

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لن يزال المومن في فسحة من دينه مالم يصب دما حراماً۔ [1]

مومن دین کے دائرہ میں اس وقت رہتا ہے جب تک وہ کسی جان کا ناحق خون نہ بہائے۔

جس طرح کسی انسان کا ناحق خون بہانا بہت بڑا جرم ہے، اسی طرح مجرموں کا بدلہ معصوموں سے لینا بھی جرم ہے، یعنی اگر کوئی شخص کسی کو ناحق قتل کر دے تو مقتول کے وارث قاتل ہی سے بدلہ لے سکتے ہیں۔ قاتل کی برادری، مذہب اور

---

[1] بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ "ومن احیاھا"

قبیلہ کے لوگوں سے بدلہ لینا مجرم کا بدلہ معصوموں سے لینا ہے اور اسلام نے اس کو بھی برابر کا جرم قرار دیا ہے۔ اسلام نے قصاص یعنی بدلہ لینے کا جو حق دیا ہے وہ قاتل اور مجرم تک محدود ہے۔ الاّ یہ کہ دوسرے لوگ قتل کی سازش میں شریک ہوں، مگر مظلوم کو ظالم بن جانے کا یعنی کسی معصوم سے بدلہ لینے کا حق نہیں دیا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک برائی یہ پھیل گئی ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ظلم وفساد کر کے نکل بھاگتے ہیں ان کو پکڑنے کے بجائے ان کی برادری اور مذہب کے معصوم لوگوں پر حملہ کر دیا جاتا ہے، یہ انسانیت اور مذہب دونوں کے اصولوں کے خلاف ہے۔

امن وسلامتی کے قیام کے لیے اسلام نے انصاف کو پہلی شرط قرار دیا ہے، انصاف ایسا روحانی اصول ہے جو اپنے اور پرائے سب پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر تمام شہریوں کو برابر کا انصاف ملے گا تو بدامنی کے امکانات کم ہوں گے۔ اور اگر سماج کے کسی طبقہ اور فرد کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، اسے انصاف نہیں مل سکتا تو وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے دوسرے راستے تلاش کرے گا، اس سے بدامنی اور فتنہ فساد پیدا ہوگا، لہٰذا امن وسلامتی قائم کرنے کے لیے انصاف قائم کرنا ضروری ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو امن وسلامتی کی جو قیمتی تعلیم دی ہے اس کا روحانی پہلو یہ ہے کہ اللہ نے زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد بنا دیا ہے، وہ جہاں چاہے نماز ادا کر سکتا ہے، تو جس طرح مسجد میں انسان پرامن رہتا ہے اور لڑنے جھگڑنے سے اور فتنہ وفساد کے جذبہ سے پاک رہتا ہے اسی طرح اسے زمین میں پرامن رہنا چاہیے، اگر اسلام کی ان تعلیمات پر صدق دل سے عمل کیا جائے تو امن قائم ہو سکتا ہے، ورنہ امن کے دعووں اور نعروں کے باوجود دنیا میں بدامنی باقی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قیام امن کی توفیق دے۔ (آمین)

خطبۂ اُولیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ .

امَّا بعد!

فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ خَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ وَکُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ. وَقَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالیٰ :

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّہَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّہَ إِنَّ اللَّہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (الحشر:۱۸)

وَقَالَ تَعَالیٰ:

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْکُلُواْ أَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَکُونَ تِجَارَۃً عَن تَرَاضٍ مِّنکُمْ وَلاَ تَقْتُلُواْ أَنفُسَکُمْ إِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْماً. (النساء:۲۹)

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَھْدَ لَہٗ.

اَرْبَعٌ مَّنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقاً خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ .

بَارَکَ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَ وَفَّقَنَا وَاِیَّاکُمْ لِاِتِّبَاعِ کِتَابِہِ الْحَکِیْمِ وَسُنَّۃِ رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. اِنَّہٗ تَعَالیٰ جَوَادٌ کَرِیْمٌ مَّلِکٌ بَرٌّ رَّؤُفٌ رَّحِیْمٌ.

خطبۂ ثانیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
وَقَالَ تَعَالٰى: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ . وَقَالَ تَعَالٰى: وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ . وَقَالَ تَعَالٰى: هُوَ الَّذِىْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ . وَقَالَ تَعَالٰى: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيْماً . اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى خَاتِمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ وَّعَلَى الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ اَبِىْ بَكْرِ نِ الصِّدِّيقِ وَعُمَرَ الْفَارُوْقِ وَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَّعَلِيِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ وَّعَلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعَلٰى سَآئِرِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ رِضْوَانُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ. اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ. عِبَادَ اللّٰهِ رَحِمَكُمُ اللّٰهُ. إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِىْ الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَعْلٰى وَاَكْبَرُ.

یہ کتاب

❁ اردو خطبات کی قرار واقعی افادیت چونکہ اس پر موقوف تھی کہ آسان زبان میں ضروری مسائل وفضائل کے ساتھ خطبات عقائد صحیحہ، عبادات لازمہ، اوقات متبرکہ، معاملات عادلہ اور اخلاق حمیدہ کی تذکیر و یاد دہانی پر ضروری تفصیلات کے ساتھ مشتمل ہوں، اسی بنیاد پر معاشرہ کی اصلاحی ضروریات سے بخوبی واقف اور دینی و علمی لحاظ سے وسیع النظر عالم کی اس کے لیے ضرورت تھی، جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارباب بست وکشاد کی نگہ انتخاب فاضل محترم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شخصیت پر پڑی، یہ موزوں ترین انتخاب تھا۔

(حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دار العلوم دیوبند وقف)

❁ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے سال بھر کے جمعوں کی تعداد جو قمری سال کے اعتبار سے پچاس سے اوپر ہوتی ہے، تقریباً ۵۳-۵۴ خطبوں میں مسلمان کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور آسان اور شستہ زبان میں بات کو ادا کیا ہے۔ ان کی علمی و دینی صلاحیتیں ان کے اس کام میں معاون بنی ہیں۔ وہ ہندوستان کے بڑے صاحبِ علم و دانش عالم دین ہیں۔

انھوں نے اس طریقے سے ہمارے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تجویز اور توجہ دہانی اور اس سلسلے میں اس کی فکر مندی اور کوشش کو اہم اور خصوصی مدد پہونچائی ہے، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

(حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

❁ ہمیں اللہ کے فضل سے یہ امید ہے کہ جن خطبات کو مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بڑی لیاقت اور ریاضت کے ساتھ قلم بند کیا ہے وہ ہماری مساجد میں اگر پابندی کے ساتھ ہر جمعہ اور عیدین کے موقع پر دیے گئے تو اصلاح معاشرہ کا کام بڑے پیمانہ پر انجام پائے گا انشاء اللہ۔ اور وہ غلط فہمیاں بھی آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گی جو ہمارے اہل وطن کے دلوں میں ہماری بابت گھر کر گئی ہیں۔

(جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

❁ اردو خطبات کی قرار واقعی افادیت چونکہ اس پر موقوف تھی کہ آسان زبان میں ضروری مسائل وفضائل کے ساتھ خطبات عقائد صحیحہ، عبادات لازمہ، اوقات متبرکہ، معاملات عادلہ اور اخلاق حمیدہ کی تذکیر و یاد دہانی پر ضروری تفصیلات کے ساتھ مشتمل ہوں، اسی بنیاد پر معاشرہ کی اصلاحی ضروریات سے بخوبی واقف اور دینی وعلمی لحاظ سے وسیع النظر عالم کی اس کے لیے ضرورت تھی، جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارباب بست وکشاد کی نگہ انتخاب فاضل محترم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب ناظم سنّی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شخصیت پر پڑی، یہ موزوں ترین انتخاب تھا۔

(حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دار العلوم دیو بند وقف)

❁ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے سال بھر کے جمعوں کی تعداد جو قمری سال کے اعتبار سے پچاس سے اوپر ہوتی ہے، تقریباً ۵۳-۵۴ خطبوں میں مسلمان کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور آسان اور شستہ زبان میں بات کو ادا کیا ہے۔ ان کی علمی و دینی صلاحیتیں ان کے اس کام میں معاون بنی ہیں۔ وہ ہندوستان کے بڑے صاحبِ علم ودانش عالم دین ہیں۔

انھوں نے اس طریقے سے ہمارے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تجویز اور توجہ دہانی اور اس سلسلے میں اس کی فکر مندی اور کوشش کو اہم اور خصوصی مدد پہونچائی ہے، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

(حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

❁ ہمیں اللہ کے فضل سے یہ امید ہے کہ جن خطبات کو مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بڑی لیاقت اور ریاضت کے ساتھ قلم بند کیا ہے وہ ہماری مساجد میں اگر پابندی کے ساتھ ہر جمعہ اور عیدین کے موقع پر دیے گئے تو اصلاح معاشرہ کا کام بڑے پیمانہ پر انجام پائے گا انشاء اللہ۔ اور وہ غلط فہمیاں بھی آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گی جو ہمارے اہل وطن کے دلوں میں ہماری بابت گھر کر گئی ہیں۔

(جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)